ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی

شیرانی دبستان تحقیق کا ماہ درخشاں

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

احمد آباد سے ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی صاحب کا خیریت نامہ ملے چھ ماہ سے اوپر ہو گئے تھے۔ جب گجرات میں مسلم کش فسادات شروع ہوئے تو یہ جاں کاہ خبریں پڑھ کر بار بار ان کا خیال آتا تھا لیکن رابطے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ معارف (اعظم گڑھ) کا ماہ مئی ۲۰۰۲ء کا شمارہ کراچی پہنچا تو اس میں بذیل وفیات، ڈیسائی صاحب پر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا سوا تین صفحات پر مبنی مضمون شامل تھا۔ عزیزی محمد راشد شیخ نے اسے پڑھ کر اپنے ۱۳ جون کے مکتوب میں مجھے اس سانحے سے مطلع کیا۔ یوں تو وہ ایک عرصے سے علیل اور صاحب فراش تھے لیکن قلم فرسائی کا کام برابر جاری تھا۔ ان کے علمی تبحر، تحقیقی خدمات اور تحریری منصوبوں کے پیش نظر دل سے یہی دعا نکلتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت با کرامت رکھے۔ تاہم قدرت کے اپنے قوانین ہوتے ہیں جن کے آگے انسان بے بس ہو کر رہ جاتا ہے:

گر بمیریم عذر ما بپذیر　　اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ڈاکٹر ڈیسائی مرحوم کی رحلت کا صدمہ کئی اعتبار سے اندوہناک ہے۔ ایک تو میرے لیے یہ ذاتی محرومی کا باعث ہے کہ ان جیسے بے لوث محبت اور شفقت کرنے والے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ دوسرے ہند اسلامی تاریخ وتہذیب پر اس جاں فشانی سے کام کرنے والا شخص دور دور تک نظر نہیں آتا اور کام بھی کیسا؟ انتہائی معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت وسیع اور ہمہ گیر۔ اس تخصص پرستی کے دور میں ان کے علمی دائرہ ہائے کار کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ:

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے منصف دوم میں کم از کم ہندوپاکستان کی حد تک ایسا کثیر الجہت اور اتنا وافر تحریری کام انجام دینے والا فاضل ڈھونڈے نہیں ملتا۔ ایک سانحہ یہ ہے کہ پاکستان کے علمی حلقوں میں ایک بڑی اکثریت تو شاید مرحوم کے نام سے بھی واقف نہ ہوگی اور یہاں جو لوگ ان کے کام اور اس کی اہمیت سے بتمام وکمال آشنا ہیں ان کی تعداد یقیناً ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

پھر ان کی وفات جن دردناک حالات میں ہوئی اس کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ انھوں نے ۲۴ مارچ ۲۰۰۲ء

(مطابق ۹محرم الحرام۱۴۲۳ھ) کو داعی اجل کو لبیک کہا اور اسی روز عصر کے وقت انھیں جوہاپورہ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بقول ''معارف'':

''وہ کئی ماہ سے علیل اور احمد آباد کے ایک ہسپتال میں داخل تھے۔ ان کی وفات کی اطلاع اس لیے تاخیر سے ملی کہ ان دنوں احمد آباد بلکہ گجرات میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی جس میں ہزاروں انسان زندہ جلا دیے گئے اور لاکھوں بے خانماں اور برباد ہو کر اپنے ہی وطن میں بے وطن ہو کر رہ گئے۔ خود ڈیسائی مرحوم کے صاحب زادے کی دواؤں کی دکان بھی شرپسندوں نے جلا دی تھی۔ چنانچہ اس ہولناک قتل عام کی وجہ سے اور خبریں دب گئیں اور ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کے حادثۂ انتقال کی خبر بھی نہ لگ سکی اور وہ کرفیو کے دوران سپرد خاک کر دیے گئے''۔

مرتے ہیں میر سب پہ نہ اس بے کسی کے ساتھ میت پہ تیری کوئی نہ رویا پکار کے

سنہ ۶۱۷ھ کے اوائل میں جب چنگیز خان نے بخارا کو فتح کیا تو تاتاری گھڑسواروں نے جامع مسجد میں داخل ہو کر وہاں پناہ لینے والے مرد وزن و اطفال کا قتل عام شروع کر دیا۔ یہ نظارہ دیکھ کر امام فقیہ مولانا رکن الدین مسعود نے بے قراری کے عالم میں مقدم و مقتدای سادات ماوراء النہر امام جلال الدین علی بن ابی الحسن الرندی سے مخاطب ہو کر پوچھا: ''ایں چہ حالتست؟'' جواب ملا: ''خاموش باش! با دبے نیازی خداوند است کہ می وزد، سامان سخن گفتن نیست''۔

میں نے ڈیسائی صاحب کا نام سب سے پہلے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرحوم کے مضامین کے حواشی میں دیکھا تھا۔ چغتائی صاحب اپنے مختصر حواشی میں ان کا ذکر محض ڈاکٹر ڈیسائی صاحب کے الفاظ سے کرتے تھے اور ان کی کسی تالیف یا مضمون کا حوالہ مطلق نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ میں ایک عرصے تک ڈیسائی صاحب کے بارے میں صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ آل انڈیا آرکیالوجیکل سروے میں کسی اہم عہدے پر متمکن ہیں اور انھوں نے طہران سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کیا ہوا ہے۔ سچ پوچھیے تو میں انھیں بھی محکمہ آثار قدیمہ کا ایک روایتی افسر سمجھتا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں جب حافظ محمود شیرانی کی صد سالہ تقریبات ولادت کے انعقاد کی تیاریاں شروع ہوئیں تو اس موقع پر پڑھے جانے کے لیے پاک و ہند کے اہل علم حضرات سے حصول مضامین کی غرض سے رابطہ کیا گیا۔ علی گڑھ سے محبی پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اپنے ۲/اگست ۱۹۸۰ء کے خط میں مجھے لکھا:

''معلوم نہ ہو سکا کہ آپ نے مقالے کے لیے شیرانی صاحب کے شاگرد پروفیسر ڈار[1] کے عزیز ترین شاگرد ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کو، جو محکمہ آثار قدیمہ کے بڑے عہدے پر ہیں، لکھا یا نہیں۔ ان کا پتہ درج ذیل ہے۔ اگر نہ لکھا ہو تو اب بھی لکھیں۔ ویسے میں نے اپنی طرف سے مقالہ لکھنے کی فرمائش کر دی ہے، گو ان کی صحت خراب ہے۔ وہ موٹر کے ایک حادثے سے دوچار ہو گئے تھے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل کیا''۔

پتہ ناگ پور کی سرکاری قیام گاہ کا تھا۔ چنانچہ میں نے انھیں مقالہ لکھنے کی دعوت دی۔ اس کے جواب میں انھوں نے ۱۶ستمبر ۱۹۸۰ء کو مجھے لکھا:

''میں اس تقریب میں اپنے آپ کو کسی نہ کسی صورت میں شامل کرنا فخر کی بات سمجھتا ہوں، گو (محترم ڈاکٹر نذیر احمد صاحب

کے حسن ظن کے باوجود) اس کا اہل نہیں۔ حافظ صاحب سے ذاتی طور پر نیاز کا شرف حاصل نہیں رہا لیکن اپنے آپ کو ان کے شاگرد کا شاگرد کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔ ان کے عزیز شاگرد پروفیسر محمد ابراہیم ڈار صاحب مرحوم سے، جو میرے استاد تھے، حافظ صاحب کی فوق العادت علمی استعداد کا چرچا سنتا ہی رہتا تھا اور بعد میں خود حافظ صاحب کی کتابیں اور مقالے پڑھ کر اسے اس سے بھی زیادہ پایا۔ میرے نزدیک ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا عالم، اس پائے کا آج تک پیدا نہیں ہوا''۔

مقالہ لکھنے کی بابت ان کا کہنا تھا:

''بہر حال عرض یہ کرنا تھا کہ میں ضرور اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی دلی خواہش رکھتا تھا اور رکھتا ہوں، لیکن ابھی میرے جسمانی قویٰ معمول پر نہیں ہیں۔ دوسرے ایک اور کمزوری یہ ہے کہ میں انگریزی میں لکھنے کا عادی ہوں اور (یہ ندامت کی بات ہے کہ) اردو حتیٰ کہ میری مادری زبان گجراتی میں لکھنے کے مقابلے میں، عادت کی وجہ سے انگریزی میں لکھنا میرے لیے زیادہ آسان ہے۔ کیا اس جشن میں انگریزی میں لکھے ہوئے مقالوں کی گنجائش ہے؟''

میری درخواست پر ان کا ارادہ شیرانی صاحب کی ''تنقید پر تھی راج راسا'' پر توسیعی مضمون تیار کرنے کا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''بیر کا فریکچر ہو جانے کی وجہ سے کچھ دن پہلے تک فراش تھا اور کہنا مشکل تھا کہ کب تک نقل وحرکت چہ جائے کہ نوشت و خواند کے قابل ہو پاؤں گا۔ نیز ایسا وعدہ بھی کرنا نہیں چاہتا تھا جس سے عہدہ برآ نہ ہو سکوں ورنہ حسب ارشاد کتب خانے سے پرتھی راج راسا منگوا کے رکھی تھی۔''

ان کے اسی پہلے خط سے مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ وہ پروفیسر ڈار مرحوم کے داماد بھی ہیں اور یہ شادی ڈار صاحب کی وفات کے کئی سال بعد ہوئی تھی۔

مقالہ تو وہ نہ لکھ پائے لیکن اس تقریب کی وساطت سے ہمارے درمیان خط کتابت کا مستقل سلسلہ شروع ہو گیا جو کم وبیش اکیس برس تک جاری رہا۔ افسوس کہ ان کے سارے خطوط محفوظ نہ رہ سکے۔ ان کی وفات کی اطلاع پا کر جب میں نے ان کی یادیں تازہ کرنے کے لیے یہ خط تلاش کیے تو سردست سترہ مکاتیب دستیاب ہو سکے جو اس وقت میرے سامنے ہیں۔ ان خطوں کو پڑھ کر مرحوم کی دینی حمیت، اخلاقی عظمت، علمی جستجو، کتاب دوستی اور استادپرستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی زبان بھی معیاری اور بے عیب ہے جیسا کہ ان کے بعض اقتباسات سے اندازہ ہوگا اور کہنا پڑتا ہے کہ اپنے نتائج فکر اردو میں پیش کرنے سے گریز دراصل ان کے انکسار کا شاخسانہ تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کا ماحول، وہاں کی حکومت کی پالیسی کے باعث ایک اعلیٰ سرکاری ملازم کی اردو میں تصنیف وتالیف کے حق میں سازگار نہیں تھا اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا کہ انھوں نے انگریزی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا جس کی بدولت انھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔

میری ان سے دو مختصر ملاقاتیں بھی ہوئیں ایک لاہور میں اور دوسری دہلی میں اور سچی بات یہ ہے کہ ان کے خطوط سے میں نے ان کی شخصیت کا جو معیار قائم کیا تھا وہ اس پر بدرجہ احسن پورے اترے۔ وہ مجھ سے عمر، علم، عہدہ اور عمدہ اخلاق غرض ہر اعتبار سے بڑے تھے۔ مجھے ان سے دوستی کا دعویٰ بھی نہیں۔ میری حیثیت ان کی متنوع خوبیوں کے باعث محض ایک عقیدت مند کی سی ہے۔ اور ان سطور کی تحریر کا مقصد بھی اپنے جذبات کا اظہار ہی ہے۔ البتہ اس مضمون کے ذریعے پاکستان کے علمی حلقوں سے ایک بڑی شخصیت کا تعارف ہو سکے گا اور طالبان علم کے لیے ایک مثال فراہم ہو سکے گی۔

ضیاءالدین ڈیسائی صاحب ایک سچے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور دینی فرائض کے معاملے میں کسی غفلت کے روادار نہ تھے[۲] اپنے ہر مکتوب کا آغاز وہ ''باسمہ سبحانہ'' کے الفاظ سے کرتے تھے اور مکتوب الیہ کے نام کے بعد ''سلام مسنون'' لکھنا کبھی نہ بھولتے تھے۔ وہ طرح طرح کے عوارض اور حادثات کا شکار رہے لیکن اللہ پر ان کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ ہمیشہ اس کے فضل و کرم پر اعتماد کرتے تھے۔

عالمانہ انکسار کی یہ کیفیت تھی کہ مجھ جیسے نیم مدان کو ایسے الفاظ سے مخاطب کرتے کہ میں شرم سار ہو جاتا۔ میں نے ایک دو بار احتجاج بھی کیا لیکن وہ اپنی عادت مستمرہ پر قائم رہے۔ اکثر خطوں کی ابتدا محترم و مکرم بندہ، مشفق و مکرم بندہ، کرم فرمائے بندہ اور مشفق و محبی کے القاب سے کرتے۔ اختتام کے معاملے میں مخلص یا اخلاص کیش تو خیر اظہار حقیقت تھا لیکن دعا کا طالب اور دعائے خوشنودی کا طالب، میری شرمندگی کا باعث ہوتا تھا۔ جب دہلی کے محمود شیرانی سیمینار میں عند الملاقات انھوں نے ''مضامین ڈار'' کا پرانا ایڈیشن مجھے عطا کیا تو اس پر اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھے:

> ''محبی و مشفق مظہر محمود خان صاحب شیرانی بہ تقریب حافظ محمود خان صاحب شیرانی
> سیمینار ملاقات پر شیرانی صاحب کے شاگرد کا شاگرد ضیاءالدین ڈیسائی
> دہلی نو، ۱۱ فروری ۱۹۹۰ء''

دراصل وہ اگلی وضع کے مطابق اپنے استاد پروفیسر ابراہیم ڈار اور ان کے استاد پروفیسر شیرانی سے بے انتہا محبت کرتے اور عقیدت رکھتے تھے۔ مجھ پر ان کی نوازشات کا اصل سبب بھی میرا حافظ صاحب سے نسبی تعلق تھا۔

میں ایک عرصے سے حافظ صاحب کے مکاتیب بغرض اشاعت جمع کر رہا تھا۔ پروفیسر ابراہیم ڈار صاحب کے نام ان کے صرف دو خط مجھے مل سکے تھے جو ''نوائے ادب'' (بمبئی) میں چھپے تھے۔ میں نے ڈیسائی صاحب سے اس معاملے میں اعانت کی درخواست کی۔ انھوں نے ڈار صاحب کے باقی ماندہ کاغذات کو کھنگالا، لیکن کوئی مکتوب دستیاب نہ ہو سکا۔ البتہ جب وہ مارچ ۱۹۸۱ء کی ابتدا میں پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کی تقریبات میں شرکت کے لیے پشاور اور اسلام آباد آئے تو ۱۰ مارچ کو اسلام آباد ہوٹل کے لیٹر پیڈ پر مجھے خط لکھا کہ وہ مختصر وقت کے لیے لاہور آئیں گے اور پھر عازم کراچی ہوں گے۔ اسی خط کے ساتھ انھوں نے حافظ صاحب کی پروفیسر ابراہیم ڈار کے نام ایک تحریر روانہ کی جو قصائد انوری کے بعض مشکل اشعار کی تشریح پر مشتمل تھی۔ اس کے ساتھ حافظ صاحب کا مسلکہ خط تو نہ ملا تاہم یہ تحریر میں نے ''مکاتیب حافظ محمود شیرانی'' میں شامل کر دی ہے[۳]

لاہور میں ان کا مختصر قیام پروفیسر ڈار مرحوم کی بھتیجی مس اقبال ڈار، پرنسپل لاہور کالج برائے خواتین کے ہاں تھا۔ میں نے مرحوم خورشید یوسفی صاحب کے ہمراہ وہاں جا کر ان سے ملاقات کی۔ ان کی شخصیت سلاست و اعتدال کا نمونہ تھی۔ قد، جثہ، رنگت ہر اعتبار سے موزوں اور معتدل۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ، گلیمن شیو، انگریزی لباس میں ملبوس، بہر حال تہذیب و اخلاق مجسم تھے۔ بڑی چاہت اور اپنائیت سے ملے۔ مسرت ان کے انگ انگ اور بات بات سے پھوٹ رہی تھی۔ اثنائے ملاقات میں میں نے ان سے دو چیزوں کا بطور خاص ذکر کیا۔ ایک تو سلاطین کے عہد کا ایک شکستہ کتبہ[۴] جو حافظ صاحب کو کھانٹو کے نواح میں کسی غیر آباد مسجد کے فرش پر پڑا ملا تھا اور انھوں نے تحفظ کی خاطر اسے اٹھوا کر اپنے گاؤں والی حویلی میں دفن کروا دیا تھا۔ دوسرے مہاراجہ بوندی کی ایک پرانی

توڑے دار بندوق جو غیر معمولی طور پر طویل تھی۔ اس کی فولادی نال پر چاندی منڈھی ہوئی تھی، جس پر طلائی کوفت کا نہایت نفیس کام تھا۔ دستہ آبنوس کا تھا جس پر ہاتھی دانت سے بیل بوٹے کندہ کیے گئے تھے۔ جب ہم لوگ ۱۹۴۸ء میں ٹونک سے روانہ ہوئے تو بہت سا سامان ایک کمرے میں مقفل کر دیا تھا لیکن یہ بندوق بعض پرانے ہتھیاروں، یعنی زرہ بکتر، خود و خفتان اور جوشن و چار آئینہ وغیرہ کے ساتھ ایک مہربان کے ہاں امانت رکھ دی گئی تھی۔ بعد میں انھوں نے خصوصی حفاظت کی غرض سے شہر سے دور اپنی زرعی اراضی پر بنے ہوئے مکان میں اس بندوق کو ضروری احتیاطی تدابیر کے ساتھ زمین میں دبا دیا۔ ڈیسائی صاحب سے ان دونوں چیزوں کا تذکرہ اس لیے کیا گیا تھا کہ ان کی وساطت سے انھیں کسی پبلک ادارے یا عجائب گھر میں منتقل کیا جا سکے۔

اس ضمن میں انھوں نے ناگ پور سے ۲ راگست ۱۹۸۱ء کو خط میں مجھے لکھا:

''آپ نے وطن مالوف کے جس کتبے کا ذکر کیا ہے اس بارے میں عرض یہ ہے کہ اس سلسلے میں آپ جو چاہتے ہیں وہ ان شاءاللہ با آسانی ہو جائے گا۔ ایسی قوی امید ہے۔ وطن سے مراد آپ کی ڈھانی ہے[۵] یا ٹونک؟ پھر یہ کتبہ وہ تو نہیں جو کھاٹو کے ہی (اب مرحوم) حافظ محمد صدیق[۶] صاحب کے گھر میں رکھا گیا تھا؟ بہر حال تفصیلات سے مطلع فرمائیں۔ وہ جودھ پور میوزیم میں بھی بھیجا جا سکتا ہے[۷]۔ دوسری چیز کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کارروائی کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے گی۔ یہ چیز نیشنل میوزیم وغیرہ کے لائق ہے۔ بہر حال اس بارے میں دہلی جا کر دریافت کروں گا اور آپ نے جن چیزوں کے خدشے کا اظہار کیا ہے ان کے بارے میں تبادلہ خیالات کروں گا''۔

خدشہ یہ تھا کہ یہ گراں بہا بندوق اس کے امانت دار سے برآمد ہونے کی صورت میں کہیں ان پر اسلحہ ایکٹ وغیرہ کے تحت کوئی مقدمہ نہ قائم ہو جائے اور نیکی برباد گناہ لازم والا معاملہ ہو۔[۸]

اسی خط میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ ۲۴ راگست (۱۹۸۱ء) کو ناگپور ریڈیو اسٹیشن کے اردو پروگرام میں بسلسلۂ عظیم شخصیات ڈیسائی صاحب کی ایک تقریر بعنوان ''حافظ محمود شیرانی'' نشر ہوگی۔[۹]

لاہور کا قیام انتہائی مختصر ہونے پر اپنے ملال کا اظہار وہ کئی خطوں میں کرتے رہے۔ انھیں یہاں کے اہل علم سے نہ مل سکنے اور بالخصوص پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں شیرانی صاحب کا ذخیرہ کتب نہ دیکھ سکنے کا افسوس تھا۔ البتہ کراچی میں وہ کچھ زیادہ وقت کے لیے ٹھہرے اور پیر حسام الدین راشدی مرحوم نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔ پیر صاحب نے ایک پورا دن صرف کر کے ڈیسائی صاحب کو مکلی کا شاہی قبرستان دکھایا اور بعد میں مالک رام جی کے نام ایک خط میں ان کے بارے میں لکھا کہ ''ایک عرصے کے بعد ایک فنافی العلم شخص سے ملاقات ہوئی''۔[۱۰]

اتفاق سے اسی سال ۱۹۸۱ء میں مجھے دہلی میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ۲۴ تا ۲۷ دسمبر منعقد ہونے والے سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ میں اپنے محکمے سے نو اوبجیکشن سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی غرض سے سیکرٹریٹ پہنچا۔ تو وہاں ایک دوست نے مشورہ دیا کہ آپ اپنی درخواست میں بجائے سیمینار میں شرکت کا ذکر کرنے کے محض عزیزوں سے ملنے کا مقصد ظاہر کریں۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں خطاب و عتاب کے جھمیلے سے گزرنا پڑے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ٹونک اور شیرانی آباد کا ویزا تو مل گیا لیکن دہلی کا ویزا نہ مل سکا۔ میں نے دہلی پہنچ کر غالب سے متعلق اپنا مضمون ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے حوالے کیا اور ان کے روکنے کے باوجود ٹونک روانہ ہو گیا جہاں حافظ محمود شیرانی سیمینار منعقد ہو رہا تھا۔ ڈیسائی صاحب کمال مہربانی سے ۲۳ دسمبر کو ناگ پور سے دہلی

پہنچے۔صورت حال کا علم ہونے پر ۲۴ دسمبر کو میرے نام ایک خط لکھ کر صاحبزادہ شوکت علی خاں، ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات عربی و فارسی راجستھان ٹونک کی معرفت ارسال کیا جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''میری مایوسی کا اندازہ کیجیے جب کل غالب انسٹی ٹیوٹ پہنچنے پر کرمی ڈاکٹر نذیر احمد نے آپ کا تحفہ دیتے ہوئے یہ بتایا کہ آپ ٹونک تشریف لے گئے ہیں۔خدا کرے آپ سیمنار کے لیے تشریف لائیں اور ملاقات ہو''۔

اس کے بعد اپنے آئندہ ایک ماہ کی پروگرام کی تفصیل لکھی تھی اور آخر میں یہ کہ ''آپ کا قیام کب تک رہے گا.....اگر آپ کی آمد کی تاریخوں کا پہلے پتہ ہوتا تو میں ٹونک آجاتا.....''

میں ایک ہفتہ ٹونک اور ایک ہفتہ شیرانی آباد قیام کر کے واپس چلا آیا لیکن ڈیسائی صاحب بعد کے کئی خطوں میں ملاقات نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے رہے۔مثلاً تیسرے یا چوتھے خط میں، جو ۵/اپریل ۱۹۸۲ء کو لکھا گیا ہے، فرماتے ہیں: ''مجھے بڑا قلق ہے کہ آپ سے ملاقات نہ کر سکا۔زیادہ اس لیے کہ میں خود پہنچ سکتا تھا لیکن آپ کا پروگرام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مجبوری تھی''۔

اسی اثنا میں ادارہ تحقیقات عربی و فارسی راجستھان، ٹونک نے ''راجستھان میں تصوف'' کے عنوان سے ایک سہ روزہ سیمینار (۲۰ مارچ تا ۲۳ مارچ ۱۹۸۲ء) کا انعقاد کیا۔اس میں ڈیسائی صاحب بطور خاص شریک ہوئے اور اپنا مقالہ پڑھا۔ اس موقع پر انھوں نے بڑے اشتیاق اور عقیدت سے حافظ محمود شیرانی مرحوم کے مزار پر حاضری دی۔اسی ۵/اپریل ۱۹۸۲ء والے خط میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ زندگی کی ایک تمنا ماہ گزشتہ میں پوری ہوئی۔اپنے استاذ کے استاذ کو دیکھنا تو قسمت میں نہ تھا لیکن یہ بھی حسرت رہ جاتی کہ وہ مقام جہاں وہ رہے اور بالآخر آسودۂ خواب ابدی ہوئے اس کی زیارت سے بھی کہیں محرومی نہ ہو اور یہ حسرت حسرت ہی رہ جائے۔الحمدللہ مارچ کی بائیس کی صبح، خدا جناب مولانا عمران خان[11] صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے، ان کی معیت میں اور ان کی اور شوکت صاحب کی وساطت سے مہیا کی گئی سواری پر جا کر اس تمنا کو بھی پورا کیا اور مرحوم کے مزار پر حاضری اور فاتحہ خوانی کے فرائض اپنی اور اپنے استاذ کی جانب سے ادا کر کے سعادت مندی حاصل کی۔واللہ کیا پُر فضا مقام ہے۔مرحوم کو دنیا ان کی تحریروں سے تو غالباً ایک خشک طبیعت انسان کی صورت میں جانتی ہوگی لیکن انھوں نے اپنی بود و باش اور آخری آرام کی جگہ کے لیے جو مقام پسند فرمایا وہ واقعی ایک نہایت ہی زندہ دل اور مناظر فطرت کے شیدائی کا ہی حصہ تھا۔دریا کے کنارے اور باغات کے درمیان وہ آسودۂ خواب ابدی ہیں اور کس مزے سے۔طبیعت کو وہاں حاضری دے کر جو سکون و اطمینان ہوا وہ بیان سے بالا ہے۔فرحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ''۔

ڈیسائی صاحب ۱۹۸۳ء میں ڈائریکٹر ایجوکیشن گرافی کے عہدے سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن احمد آباد میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔احمد آباد سے باہر سرکھیج[12] جانے والی شاہراہ پر ایک نئی بستی خورشید پارک میں انھوں نے اپنا مکان بنا لیا تھا۔ان کی علمی مصروفیات پہلے سے بھی بڑھ گئی تھیں۔ملک اور بیرون ملک کے دورے ہوتے رہتے تھے۔۱۹۸۶ء میں وہ پھر ایک حادثے کے نتیجے میں پیر کے فریکچر کا شکار ہوئے۔ان کی بڑی خواہش تھی کہ وہ آئندہ ہندوستان آنے کے موقع پر احمد آباد کا ویزا ضرور لے کر آؤں۔اپنے خطوں میں تقاضا کرتے رہتے تھے۔میں ویزا کے حصول میں دقتوں کا عذر کرتا۔اس ضمن میں ۸ ستمبر ۱۹۸۶ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''اسلام آباد میں مسٹر اے۔اے منشی[13] حکومت پاکستان کے انارنی جنرل ہیں۔وہ ہمارے رفیق اور ابراہیم صاحب ڈار

مرحوم کے شاگرد پروفیسر ڈاکٹر احمد حسین قریشی کے برادر نسبتی ہیں۔ ان سے اگر اس سلسلے میں مدد کی ضرورت ہو تو ضرور ہم دونوں کا حوالہ دیں۔ بہرحال آپ کی آمد ہم لوگوں کے لیے باعث مسرت تو ہوگی ہی لیکن اپنے دادا استاد کے پوتے کی زیارت وضیافت کر سکنے کے موقع کی یافت بھی .....''

نومبر ۱۹۸۸ء میں ڈیسائی صاحب کو دل کا عارضہ لاحق ہوا۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا لیکن ان کی زندگی تو لکھنے پڑھنے سے عبارت تھی۔ کہاں تک اس مشورے پر عمل کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کی تالیفات اور علمی مقالات کا سنہ وار جائزہ لیا جائے تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ بیماری دل میں مبتلا ہونے سے لے کر اس کے ہاتھوں کام تمام ہونے تک کے عرصے میں انھوں نے کوئی دس کتابیں اور سوا ور ڈیڑھ سو کے درمیان عالمانہ مقالات تحریر کیے جن میں سے بیشتر معیاری جرائد میں شائع ہوئے۔

۱۱فروری ۱۹۹۰ء کو غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے تین نشستوں پر مشتمل حافظ محمود شیرانی سیمینار منعقد کیا۔ اس میں ہندوستان کے متعدد اہل علم نے شرکت کی۔ میں بھی حاضر ہوا تھا۔ ڈیسائی صاحب اپنی علالت اور معالجین کی تنبیہ کے باوجود نہ صرف بذریعہ ہوائی جہاز تشریف لائے بلکہ ''فارسی اردو تحقیق کا مکتب شیرانی'' کے عنوان سے ایک مضمون بھی پڑھا جو پروفیسر ابراہیم ڈار مرحوم سے متعلق تھا۔ اس کے آغاز میں وہ کہتے ہیں:

''آج میں آپ کے سامنے ایک ایسے فاضل و عالم محقق کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جسے مکتب شیرانی کا نامور ترین فرد مانا گیا ہے۔ اس ناچیز کو بھی کم از کم طفل دبستاں کی حیثیت سے ہی سہی اس عظیم مکتب سے ایک گونہ وابستگی کا شرف حاصل ہے''۔

اور مضمون کا اختتام ان الفاظ پر کرتے ہیں:

''شیرانی اسکول کے اس عظیم رکن کے شاگردوں نے بھی فارسی درس وتدریس اور تحقیق میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ان میں سے دو ایک تو اپنے میدان میں بین الاقوامی شہرت کے بھی مالک ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے استاد کی گرد تک نہ پہنچ سکا''۔

ان دونوں اقتباسات کے آخری فقرے ڈیسائی صاحب کے طبعی انکسار کے آئینہ دار ہیں۔ یہ امر واقع ہے کہ دبستان شیرانی کے تحقیقی طریق کار سے قطع نظر اس کے وابستگان میں اخلاقی اعتبار سے تین خصوصیات نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں یعنی انکسار، نام ونمود سے گریز اور اپنے اساتذہ بلکہ ان کے اخلاف کا دلی احترام جو محبت کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس سیمینار کے موقع پر بھی ڈیسائی صاحب نے میرے ساتھ وہی محبت آمیز اور مشفقانہ برتاؤ کیا جس کی ان سے توقع تھی۔ اس کا ایک دلچسپ اظہار یوں ہوا کہ مجھ سے کہنے لگے ''میں آپ کے ساتھ ایک فوٹو بنوانا چاہتا ہوں''۔ میں نے عرض کیا ''یہ تو میرے لیے فخر کا باعث ہوگا''۔ بولے ''نہیں بلکہ میرے لیے''۔ باوجود علالت اور نقاہت کے وہ سیمینار کی تینوں نشستوں میں برابر شریک رہے۔ بعد میں وہ احمد آباد لوٹ گئے اور میں ٹونک روانہ ہو گیا۔ جہاں ۱۶ فروری کو شیرانی صاحب کی چوالیسویں برسی کی مناسبت سے ایک تقریب تھی۔ ٹونک سے شیرانی آباد ہوتا ہوا میں واپس آ گیا۔ ابھی تھکن بھی اتارنے نہ پایا تھا کہ ان کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ لکھا تھا:

''امید ہے آپ بخیر وعافیت وطن کی زیارت کے بعد واپس پہنچ گئے ہوں گے۔ دہلی کی ملاقات تشنہ رہی، لیکن آپ سے

ملاقات کرسکا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی عنایت اور مہربانی تھی ۔ کیونکہ بڑی مشکل سے ڈاکٹر سے اجازت لے کر آنے کی ہمت کی تھی ۔ سیمینار یہاں کے معیار کے مطابق نہایت اچھا رہا۔ کم از کم ہماری آئندہ نسل کے فارسی دان حضرات کو حافظ صاحب مرحوم کے کام اور مقام کا اندازہ تو ہوا''۔

مکتوب کے آخر میں پھر اس ملاقات کی طرف بدیں الفاظ اشارہ تھا:

''بہر حال آپ سے مختصر ہی ملاقات کر کے حافظ صاحب مرحوم کے شاگرد کے اس شاگرد کو بے انتہا خوشی ہوئی بلکہ اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں ۔ کاش میری صحت اجازت دیتی تو ٹونک حاضر ہوتا''۔

ڈیسائی صاحب نے مجملہ علمی خدمات کے راجستھان کے عربی و فارسی کتبات پر بھی قابل قدر کام کیا ہے ۔ حافظ صاحب کو ان کتبات کے تحفظ اور ان کا ریکارڈ تیار کرنے کی بڑی فکر رہتی تھی ۔ ان کی تشویق پر ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرحوم نے اس موضوع پر خاصا کام کیا تھا[۱۴] لیکن ابھی بہت کچھ کرنے کی گنجائش باقی تھی ۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے ''مقالات حافظ محمود شیرانی'' (جلد اول) کے آغاز میں حافظ صاحب کے حالات زندگی کے ذیل میں لکھا تھا۔

''اس علاقے پر اسلامی تاریخی نقطۂ نظر سے بہت کام کرنے کی گنجائش ہے جس میں تقسیم ملک کے باعث دشواریاں حائل ہو گئی ہیں ۔''

قسام ازل نے یہ خدمت ڈاکٹر ڈیسائی کی قسمت میں لکھی تھی جنھوں نے اس کام کا صحیح معنی میں حق ادا کر دیا ۔ انھوں نے نہ صرف چغتائی صاحب اور بعض دیگر کتبہ شناسوں کے کام میں در آنے والی اغلاط کی تصحیح کی بلکہ متعدد نئے کتبات دریافت کیے ۔ میری اس موضوع پر ان کے ساتھ خطوط میں گفتگو رہتی تھی اور وہ از راہ کرم مجھے اس بارے میں اپنی تالیفات اور مضامین کے آف پرنٹ روانہ کرتے رہتے تھے ۔ اس ضمن میں ۲۲ جون ۱۹۹۰ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''راجستھان کے میں نے کئی کتبے شائع بھی کیے ہیں اور دریافت بھی ہوئے ہیں ۔ انگریزی میں آج سے تقریباً پندرہ سال[۱۵] پہلے راجستھان کے شائع شدہ فارسی عربی کتبات پر ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں کتبوں کا متن نہیں لیکن خلاصہ تھا اور اس کا اشاریہ بہت ہی مفصل اور کارآمد تھا ۔ اس کی شاید میرے پاس ایک نقل (ہو) ۔ میں ان شاءاللہ ارسال خدمت کر دوں گا ۔ کچھ کتبات مع عکس متن اور تاریخی نوٹس کے ساتھ ہمارے رسالے اپی گرافیکا انڈیکا (عربیک اینڈ پرشین سپلیمنٹ) میں بھی شائع کیے تھے ۔ ان میں جن کے آف پرنٹ ہیں وہ بھیجوں گا، ان شاءاللہ ورنہ زیروکس .....''۔

اسی خط میں آگے چل کر لکھا ہے:

''چغتائی صاحب مرحوم کے شائع کردہ کتبوں کے مضامین میں کافی اغلاط ہیں ۔ ان میں اچھی خاصی اغلاط والوں کو میں نے دوبارہ شائع کیا ہے ۔ ویسے ناگور کے خان زادوں، لاڈنوں وغیرہ کے کتبوں کو شائع کیا ہے ۔ لاڈنوں کے علاقے میں مسلمانوں کی ایک برادری موہل ہے .....اس پر میرا ایک مضمون ایک کتبے کی بنیاد پر میں نے لکھا تھا .....وہ بھی تلاش کر کے بھیجوں گا''۔

راجستھان کے کتبوں کو شائع کرنے اور ان کی وساطت سے یہاں کی تاریخ کے بعض پہلوؤں پر نئی روشنی ڈالنے کی خدمت کے اعتراف میں جے پور کی ایک تقریب میں راجستھان کے وزیر اعلیٰ نے ڈیسائی صاحب کو طلائی تمغا بھی عطا کیا تھا۔

کتبوں سے قطع نظر وہ اپنی دوسری علمی سرگرمیوں سے بھی مطلع فرماتے رہتے تھے مثلاً: ''شیخ احمد کھٹو مغربی کے ملفوظ

مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول پر میں نے پٹنہ میں، مرقاۃ الوصول سے دستیاب چودھویں پندرھویں صدی کے راجستھان اور گجرات کی سیاسی، ثقافتی اور ادبی تاریخ سے متعلق مواد پر جو لیکچر دیا تھا، وہ بھی ابھی شائع ہوا ہے...... آف پرنٹ آنے پر ایک ان شاء اللہ ضرور آپ کے لیے رکھوں گا"۔

ان کی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے شائع ہونے والی بعض تالیفات میں براہ راست اپنے ذرائع سے بھی حاصل کر لیتا تھا۔

ڈیسائی صاحب کی وسیع علمی دلچسپیوں کی بنا پر انھیں پاکستان میں شائع ہونے والی متعدد مطبوعات یا پھر مخطوطات کی عکسی نقول کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں کراچی میں ان کے بعض قدردان اور علم دوست حضرات مثلاً ڈاکٹر ریاض الاسلام اور مشفق خواجہ[۱۶] صاحب ان کی معاونت کرتے تھے۔ مجھے اس بات پر طمانیت محسوس ہوتی ہے کہ میں بھی اس معاملے میں کسی حد تک ان کے کام آتا رہا۔ ان کا ارشاد تھا کہ: "ادھر جب بھی میرے کام کی ...... فارسی ادب، ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ، فن تعمیر، خطاطی وغیرہ پر فارسی اردو کتب طبع ہوں تو ضرور مطلع فرماتے رہیں"۔

چنانچہ میں ان کے مطلب کی تازہ چھپنے والی کتابیں یا پرانی مطبوعات نہ ملنے کی صورت میں ان کے عکس بنوا کر ارسال کر دیتا تھا۔ بعض مخطوطات کے فوٹو اسٹیٹ یا مائیکروفلمیں درکار ہوتی تھیں یا کسی قلمی کتاب کے مخصوص صفحات کے عکس۔ مثال کے طور پر غالباً ۱۹۸۶ء کے[۱۷] ایک گرامی نامے میں یہ سطور ملتی ہیں:

"مجھے خیال سا رہ گیا ہے کہ حافظ صاحب مرحوم نے کہیں لکھا ہے کہ دیوان قاضی محمود دریائی[۱۸] کی نقل ان کے ذخیرہ کتب میں موجود ہے۔ اگر وہاں یونیورسٹی یا کہیں موجود ہو تو کیا اس کی زیروکس مل سکتی ہیں؟"

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ...... دیوان جلالی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی مرتبہ فہرست کی جلد اول کے صفحہ ۳۷۷ شمارہ ۵۳۶ پر اس کا ذکر ہے (یہ فہرست یہاں تو ہے نہیں۔ میں نے امریکہ میں دیکھی تھی) اگر اس کی بھی زیروکس مل سکے تو عنایت ہوگی۔

اسی کے صفحہ ۱۹۲، شمارہ ۲۸۸ کے تحت نسخہ ناسخ مثنوی از عبداللطیف عباسی کا ذکر ہے۔ اس کے ورق ۱۴ پر مہریں اور عبارت ہے۔ اس صفحے کا عکس بھی اگر مہیا ہو سکے تو کرم ہوگا۔

اسی فہرست کے صفحہ ۱۳۹، شمارہ ۲۰۴ پر لطایف الحقایق، حدیقۃ الحقائق مصنفہ سنائی کی شرح ہے۔ اس کے صفحہ ۲۰ پر ایک نوٹ ہے ......اگر اس صفحے اور اس کے ترقیمے کے عکس مل جائیں تو عنایت ہوگی"۔

ابھی میں یہ چیزیں مہیا نہ کر پایا تھا کہ ان کا اگلا مکتوب پہنچ گیا جس میں متذکرہ بالا اشیا کی فہرست میں ڈاکٹر سید عبداللہ والی مطبوعہ فہرست مخطوطات کے حوالے سے ایک اور فرمائش تھی یعنی:

"مثنویات بیدل ...... (ایضاً، صفحہ ۳۹۰) میں ہر مثنوی کی ابتدا میں غالب کی مہر اور اس کے اپنے خط میں نوشتہ ایک شعر ...... ان صفحوں کا عکس"۔

آخر میں لکھتے ہیں: "مندرجہ بالا چیزیں آپ اپنی سہولت سے مہیا فرما کر عنایت فرمائیں۔ میں تکلیف اور زحمت آپ کو بار بار دے رہا ہوں۔ کرم ہائی تو ما را کرد گستاخ والا معاملہ ہے اور خاموشی ما گشت بدآموز بتان را آپ کا مسلک۔ بہر حال برگ سبز است تحفۂ درویش کے مصداق دست بدعا اور دعا بدہن ہوں، جزاک اللہ احسن الجزاء"۔

۱۹۹۱ء کے بعد ڈیسائی صاحب کی صحت بتدریج گرتی گئی لیکن ان کے علمی مشاغل میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ۲۰ راگست ۱۹۹۱ء کے خط میں رقم طراز ہیں: ''میں الحمدللہ یوں تو بخیریت ہوں، لیکن زیر علاج اور پابندی خصوصی نقل وحرکت پر۔ شہر کے باہر رہتا ہوں اس لیے شہر میں جانا کم ہوتا ہے..... احمد آباد کے باہر بغیر ہمراہی کے اجازت نہیں۔ ٹرین یا بس کا سفر تقریباً ممنوع۔ صرف دہلی جاتا آتا رہتا ہوں، تین چار ماہ میں ایک مرتبہ ہوائی جہاز سے۔ ہمارے ایک امریکن دوست[19] نے بادشاہ نامہ لاہوری کے انگریزی ترجمے اور تاریخ شاہجہاں پر ایک پروجیکٹ لیا ہے۔ ان سے ملنے ملانے کے لیے جاتا ہوں۔ یہ پروجیکٹ بڑا کارآمد ہوگا۔ ان شاءاللہ تمام ہونے پر تاریخی حلقوں میں کافی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ کیونکہ اس میں ترجمے کے علاوہ نوٹس ہوں گے۔''

علاوہ ازیں وہ ''مضامین ڈار'' کے نئے اور جامع ایڈیشن کی تیاری بھی کر رہے تھے نیز ''سیرت احمدیہ'' (اردو ترجمہ مرقاۃ الوصول از مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم) اور شیخ محمود بن سعید ایرجی کی ''تحفۃ المجالس'' کے اردو ترجمے (از سید ابوظفر ندوی) کی اغلاط سے پاک نئی اشاعتوں میں بھی دلچسپی لے رہے تھے۔ ''مضامین ڈار'' کی اشاعت ثانی کا کام مکتبہ جامعہ (دہلی) کے شاہد علی خاں نے اپنے ذمے لیا تھا لیکن وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے بلکہ ڈیسائی صاحب کے فراہم کردہ پروفیسر ڈار مرحوم کے بعض اضافی مضامین بھی گم کر بیٹھے۔ بالآخر یہ مجموعہ اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر (گجرات) کی طرف سے شائع کیا گیا لیکن ڈیسائی صاحب کے حسب منشا اضافوں سے محروم رہا جس کا ان کو بڑا قلق تھا۔ اس کا اظہار وہ اپنے خطوں میں کرتے رہے۔ ''سیرت احمدیہ'' بھی اردو ساہتیہ اکادمی نے شائع کی جس کا صحت نامہ ڈیسائی صاحب نے ترتیب دیا۔ ''تحفۃ المجالس'' ڈیسائی صاحب کی نظر ثانی کے بعد حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر، احمد آباد کے اہتمام سے اشاعت پذیر ہوئی۔

۱۹۹۶ء کے وسط سے ڈیسائی صاحب کو ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر بھی ترک کرنا پڑا۔ یوں دہلی کے پھیرے ختم ہوئے لیکن فارسی محاورہ ''بالائے سیاہی کہ رنگی نیست'' کے مصداق علمی جستجو کے نشے سے بڑھ کر کوئی نشہ نہیں ہوتا اور وہ تو دود چراغ کے قدیم تریاکی تھے[20]۔ چنانچہ اپنی مصروفیات کے بارے میں ۲۰ نومبر ۱۹۹۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''اپنا یہ حال ہے کہ کچھ نہ کچھ پڑھ لکھ لیتا ہوں۔ زیادہ تر مضامین لکھتا ہوں۔ یادداموں، پیش کش ناموں وغیرہ کی فرمائش کی تعمیل میں مقالے لکھتا ہوں۔ تاریخ شاہ جہاں کا منصوبہ ابھی اشاعتی صورت اختیار نہیں کر پایا۔ معاصر فارسی تاریخوں پر مبنی تاریخ نویسوں کے الفاظ میں ہی شاہجہاں کی پوری زندگی کے حالات انگریزی میں تیار ہو چکے ہیں، ایک امریکن دوست کے ساتھ..... اس کے بعد..... شاہجہاں کے منصب دار، اس کے کنبے، سکے اور فرامین وغیرہ کر کے مزید دو تین جلدوں کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں''۔

اسی خط میں انھوں نے محمد راشد شیخ صاحب کا مجھ سے بدیں الفاظ تعارف کرایا:

''ایک صاحب اصل گجرات کے لیکن وہیں کے پلے اور بڑھے ہوئے محمد راشد شیخ صاحب جو کسی بڑی فرم میں کام کرتے ہیں..... ان کو خطاطی کا شوق ہے اور تذکرہ خطاطین تالیف کی ہے جو طباعت کے لیے تقریباً تیار[21] ہے۔''

حسن اتفاق سے راشد صاحب سے میری ملاقات اس سے قبل ہو چکی تھی۔

کتابوں وغیرہ کی فرمائش وہ اب بھی کرتے رہتے تھے۔ اسی محولہ بالا مکتوب میں انھوں نے ذخیرہ شیرانی میں موجود گلستان سعدی کے ایک اہم مخطوطے کے سرورق اور ترقیمے کے عکس روانہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نسخے کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ شاہ جہاں کے صدر الصدور، احمد آباد کے مشہور سہروردی خاندان، مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے حضرت برہان

الدین عبداللہ قطب عالم بخاری کے صاحبزادے حضرت شاہ عالم کے سجادہ (نشین) سید جلال الدین مقصود عالم رضا کا کتابت کردہ ہے اور اسے یاقوت مستعصمی کے کتابت کردہ نسخے سے، جو جہانگیر کی ملکیت میں تھا، نقل کیا گیا تھا۔''

جب میں نے مطلوبہ عکس ان کی خدمت میں روانہ کیے تو انھوں نے ۱۴فروری ۱۹۹۸ء کے خط میں ان کی رسید سے مطلع کرتے ہوئے اس نسخے کی اہمیت پر مزید روشنی ڈالی:

''گلستان سعدی نسخۂ شیرانی کا زیروکس ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ ڈاکٹر چغتائی صاحب مرحوم نے بھی اپنی پاک و ہند میں اسلامی خطاطی[۲۲] میں اس کا عکس دیا ہے۔ اس نسخے کی اہمیت کی طرف فہرست نگار ڈاکٹر بشیر حسین نے اشارہ[۲۳] ضرور کیا ہے لیکن ان کا بیان نامکمل اور تشنہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس پر ایک مختصر مقالہ لکھوں۔ قلمی نسخوں کے سفر کی یہ بھی ایک نہایت دلچسپ اور اہم مثال ہے۔ یہ نسخہ شیرانی، جیسا کہ اس پر ثبت شدہ مہر سے پتہ چلتا ہے، احمد آباد کے قاضی خاندان کی ملک تھا۔ قاضی محمد نظام الدین خاں، گجرات کے اپنے زمانے کے جید عالم اور استاد مولانا نورالدین صاحب محمدی صدیقی، جن کے لیے اورنگ زیب عالمگیر کے قاضی لشکر شیخ عبدالوہاب کے بیٹے یا پوتے (اس وقت ذہن میں نہیں) قاضی محمد اکرام الدین خاں نے مدرسہ ہدایت بخش سوا لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کرایا تھا اور جس کے لیے ولی گجراتی نے فارسی رسالہ نورالمعرفت تصنیف کیا تھا، کے صاحبزادے ہیں۔ دوسری دلچسپی کی بات یہ ہے کہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتاب خانے میں گلستان کا ایک نسخہ ہے جو تیرھویں صدی کے وسط میں نسخہ شیرانی سے اس وقت کے قاضی کے ہمشیرزادے نے نقل کیا ہے اور اس میں اس کی تفصیل بھی دی ہے۔ بہرحال آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے یہ زیروکس ہم پہنچائیں۔ جزاک اللہ۔''

اپریل ۱۹۹۸ء میں انھوں نے مجھے ''سیرت احمدیہ'' اور ''تحفۃ المجالس'' کی پہلی اشاعتوں کے نسخے بذریعہ ڈاک ارسال کیے۔ میں نے ان کی رسید کا اطلاعی عریضہ لکھا لیکن وہ انھیں نہ مل سکا۔

قسمت کی خرابی دیکھیے کہ ۸جنوری ۲۰۰۰ء کی شام عین عیدالفطر (۱۴۲۰ھ) کے دن گھر کے قریب سڑک عبور کرتے ہوئے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل نے انھیں ٹکر ماردی اور تیسری بار ان کے پاؤں کا فریکچر ہوا۔ پانچ چھ ماہ صاحب فراش رہے۔ فریکچر تو جوں توں کر کے ٹھیک ہوگیا لیکن بیماری قلب میں شدت پیدا ہوگئی۔ فیا بیطس نے جو پہلے خوراک میں احتیاط کے ذریعہ قابو میں رہتا تھا اب دواؤں کا محتاج کردیا۔ گھر سے باہر نکلنا بھی ممکن نہ رہا۔ اپریل ۲۰۰۱ء میں دونوں آنکھوں میں موتیا اتر آنے کے باعث آپریشن ہوئے جو بحمداللہ کامیاب رہے۔ ان عوارض و شدائد کے باوجود انھوں نے انھی دنوں گلستان (مخطوطہ شیرانی) پر انگریزی مضمون مکمل کیا اور بمبئی کے موقر جریدے ''مارگ'' میں اشاعت کے لیے دیا۔ مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے اپنے ۱۲/اگست ۲۰۰۱ء کے خط میں ایک بار پھر یہ موضوع چھیڑا ہے:

''یہ نسخہ نہایت اہم اس لیے ہے کہ سید جلال بخاری (احمد آبادی) نے وہ نسخہ اس نسخے سے نقل کیا ہے جسے یاقوت المستعصمی نے خود شیخ سعدی کے نسخے سے لکھا تھا اور جب وہ جہانگیر کے پاس آیا تو اس میں سے کچھ اوراق غائب تھے۔ خود جہانگیر کا اس نسخے پر جو نوٹ ہے اور جسے سید جلال نے نقل کیا ہے (اس سے) یہ پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر نے نہ صرف اچھے سے اچھے کاتب سے نسخے کو مکمل کرایا لیکن (کذا۔ بلکہ؟) اس میں چوالیس تصویریں اپنے تصویرخانے کے مصوروں سے بنوا کر لگوائیں ..... ڈاکٹر چغتائی مرحوم نے .....اس کا ذکر اور عکس شائع کیا ہے لیکن انھوں نے جہانگیر والا نوٹ نظرانداز کردیا ہے اور بھی کچھ چیزیں چھوڑ دی ہیں۔''

اس خط میں بھی ڈیسائی صاحب اپنی فطری علمی جستجو کے اظہار سے باز نہ رہ سکے چنانچہ لکھتے ہیں:

''ہاں، ڈاکٹر چغتائی نے مجھے ایک بار لکھا تھا کہ ان کے پاس ڈار صاحب مرحوم کے آئے ہوئے کئی خطوط ہیں۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ مجھے بھیج دیں لیکن وہ نہیں بھیج سکے۔ آپ کبھی لاہور جا کر معلوم کریں۔ اگر ہوں تو خطوط یا زیروکس کاپیاں مل جائیں تو یہاں اردو اکادمی کا رسالہ سہ ماہی نکلتا ہے اس میں شائع کراؤں۔''

اسی خط میں یہ اطلاع بھی دی گئی تھی کہ سیرت احمدیہ، تحفۃ المجالس اور مضامین ڈار کی تازہ اشاعتوں کے نسخے وہ میرے لیے لاہور کے ایک صاحب کے ہاتھ، جن کا تعلق احمد آباد کے ''ٹوپی والا'' خاندان سے تھا، روانہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں ان کے درج کردہ پتے پر جا کر یہ تینوں کتابیں لے آیا۔

اس خط کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا تھا: ''خط کافی طویل ہو گیا ہے۔ دعا فرماتے رہیں۔''

بس یہ ان کا آخری خط تھا۔ میں نے کتابوں کی وصولی کی اطلاع پر مبنی خط لکھا۔ بلکہ اس کے بعد دو ایک خطوط خیریت طلبی کی غرض سے بھی لکھے لیکن صدائے برنخاست۔ تشویش یوں تھی کہ یہ رویہ ان کے معمول اور وضعداری سے بہت بعید تھا۔ یہی نتیجہ نکالا کہ وہ اتنے علیل ہیں کہ لکھ نہیں سکتے:

طبیب عشق ببرد طمع ز بیمارے   کہ شب براحت ازین درد بے دوا نخفت

بس اس کے بعد ان کی کوئی خیر خبر نہیں آئی یہاں تک کہ ''معارف'' کے ذریعے سناؤنی آ گئی:

گلی میں اس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر   میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم ۷ا مئی ۱۹۲۵ء کو احمد آباد کے ایک مضافاتی گاؤں دھندوکا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالحی ڈیسائی تھا۔ اسی لیے وہ اپنا نام زیڈ۔ اے ڈیسائی لکھا کرتے تھے۔ میں ایک عرصے تک ان کا نام ضیاء الدین احمد سمجھتا رہا[۴۲] پھر خیال آیا کہ ماضی کے احاطہ بمبئی (جس میں سندھ، گجرات اور کاٹھیاواڑ کے علاقے بھی شامل تھے) کے رواج کے مطابق ''اے'' احمد کا نہیں بلکہ ان کے والد کا نام عبدالحی کا مخفف ہے۔ ان کا تعلق گجرات کے ہندوؤں کی مشہور گوت ڈیسائی سے تھا اور چند پشتوں پہلے ان کے بزرگ مسلمان ہو گئے تھے۔

ضیاء الدین بڑے ہونہار طالب علم تھے اور ان کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ انھوں نے ۱۹۴۶ء میں گجرات کالج، احمد آباد (ملحقہ بمبئی یونیورسٹی) سے بی۔ اے کیا اور یونیورسٹی میں اول آنے کے سبب رستم جی ہرمزجی مودی پرائز اور گورنمنٹ سپیشل سکالر کا اعزاز ملا۔ ۱۹۴۸ء میں ایم۔ اے (فارسی) میں بھی بمبئی یونیورسٹی میں اول رہے اور چانسلرز میڈل اور عفر قاسم موسیٰ گولڈ میڈل حاصل کیے۔ ایم۔ اے میں انھیں پروفیسر ابراہیم ڈار جیسے نابغہ استاد کی شاگردی میسر آئی۔ آگے چل کر ۱۹۵۹ء میں انھوں نے طہران یونیورسٹی سے ''احوال وآثار فیضی بحوالہ خصوصی مثنوی نل ومن'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی۔

ڈیسائی صاحب نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک گجرات کالج، احمد آباد، اسماعیل یوسف کالج، بمبئی اور دھرمندر کالج، راجکوٹ میں بطور لیکچرار کام کیا۔ پھر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے محکمے میں کتبہ شناسی (عربی و فارسی) کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں ترقی پا کر سپرنٹنڈنٹ اور بالآخر ۱۹۷۷ء میں ڈائریکٹر اپی گرافی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں ملازمت

سے سبکدوش ہونے کے بعد انھیں انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ (دہلی) کے سینئر فیلو کے عہدے پر متعین کیا گیا جہاں انہوں نے نو سال تک مفید خدمات انجام دیں۔ یہاں انھوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں پائے جانے والے عربی، فارسی اور اردو کتبوں کی پانچ جلدوں میں ایک جامع فہرست کی اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ ان جلدوں کا تعلق بالترتیب جنوبی، مغربی، شمالی، مشرقی اور وسطی ہند کے کتبوں سے تھا۔ ان میں پہلی دو جلدیں ڈیسائی صاحب کی حین حیات شائع ہوئیں۔ ۱۹۹۲ء سے لے کر اپنی وفات تک وہ امریکن انسٹی ٹیوٹ فار انڈین سٹڈیز (نئی دہلی) کے تاریخ شاہجہاں پروجیکٹ کے جائنٹ چیف کولیبوریٹر کے فرائض انجام دیتے رہے۔

کہنے کو تو ڈیسائی صاحب کا اصل میدان کتبہ شناسی تھا لیکن انھیں متعدد شعبہ ہائے علوم و فنون میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ ان میں فارسی زبان و ادب بالخصوص ہند فارسی ادبیات، تاریخ ہند، تاریخ گجرات، ہند اسلامی ہنر مندی، فن تعمیر، علم مسکوکات اور فن خطاطی کے نام سرفہرست لیے جاسکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان جیسی علمی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے اور ان کی وفات دنیائے علم و فن کا ناقابل تلافی سانحہ ہے۔ اپنی ہمہ گیری کی بنا پر وہ اپنے بیک واسطہ استاد پروفیسر حافظ محمود شیرانی سے بڑی مشابہت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحبزادہ شوکت علی خاں نے عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جرنل (ٹونک) کے شمارہ نمبر ۴ (سنہ ۸۵۔۱۹۸۴ء) کے تعارف میں لکھا تھا کہ ''ڈاکٹر ضیاءالدین ڈیسائی ......اس دور کے پروفیسر شیرانی ہی ہیں۔''

علوم و فنون کی اس جامعیت کے باعث ڈیسائی صاحب بہت سی علمی مجالس اور اداروں کے عہدے دار یا رکن تھے۔ ان سب کی تفصیل مہیا کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ جن انجمنوں کے وہ تا حیات رکن تھے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

(۱) ایران سوسائٹی، کلکتہ — (۲) انڈین ہسٹری کانگریس
(۳) ایپی گرافیکل سوسائٹی آف انڈیا — (۴) نیومس میٹک سوسائٹی آف انڈیا
(۵) گجرات اتہاس پریشد، احمد آباد — (۶) گجرات ودیا سبھا، احمد آباد
(۷) سوراشٹر اتہاس پریشد، جوناگڑھ — (۸) ''انڈو ایرانیکا'' کے مراسلاتی مدیر

علاوہ ازیں متعدد سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کی رکنیت بھی انھیں حاصل رہی۔ مثلاً:

(۱) سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف آرکیالوجی
(۲) پرچیز کمیٹی، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا
(۳) آرٹس پرچیز کمیٹی، نیشنل میوزیم آف انڈیا
(۴) چیئرمین ایڈوائزری کمیٹی، انڈین نیشنل سائنس کانگریس
(۵) ریجنل ریکارڈز کمیٹی، ڈپارٹمنٹ آف آرکائیوز، گورنمنٹ آف گجرات
(۶) مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی

بہت سی قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمناروں میں انھوں نے جز وقتی اور کل وقتی صدارتی فرائض انجام دیے۔ ڈیسائی صاحب کی کثیر عملی اور تخلیقی خدمات کا اعتراف بھی ہوا اور قدر شناسی کے طور پر ان کی خدمت میں متعدد اسناد اور تمغے پیش کیے گئے جن میں سے ایسے، جن کا مجھے علم ہے، یہ ہیں:

(۱) تامرا پترا (اعزازی سند) منجانب ایپی گرافیکل سوسائٹی آف انڈیا — ۱۹۸۲ء

(۲) فارسی زبان وادب کی نمایاں خدمات پر صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ ۱۹۸۳ء

(۳) ڈاکٹر ایل ۔پی ٹیسی ٹوری طلائی تمغا ۱۹۸۴ء

(۴) سر جادوناتھ سرکار طلائی تمغا منجانب ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۹۹۳ء

(۵) سنسکار ایوارڈ، وڈودرہ (بڑودہ) ۱۹۹۳ء

(۶) گوراوپر سکار منجانب گجرات اردو اکادمی ۱۹۹۵ء

(۷) فخر الدین علی احمد پرائز منجانب غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۹۹ء

ڈاکٹر ڈیسائی نے متعدد توسیعی اور یادگار خطبات بھی دیئے جیسے:

(۱) ایس ۔آر یونیورسٹی بڑودہ میں گجرات کے عربی فارسی کتبہ جات پر ۱۹۷۶ء

(۲) مانکھک سوسائٹی آف انڈیا (بنگلور) میں ڈاکٹر سمہاچار توسیعی خطبہ ۱۹۷۹ء

(۳) ایران سوسائٹی، کلکتہ میں ڈاکٹر ایم ۔اسحاق یادگار خطبہ ۱۹۸۳ء

(۴) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) میں مولوی خدا بخش یادگار خطبہ ۱۹۸۵ء

(۵) ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگلہ دیش کے زیر اہتمام منشی آفتاب الدین یادگار خطبہ ۱۹۹۳ء

ڈیسائی صاحب اپنے سرکاری اور نیم سرکاری فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں ہندوستان کے طول وعرض میں بکثرت سفر کرتے تھے ۔علاوہ ازیں ذاتی علمی جستجو کی خاطر یا اپنے ملک کی نمائندگی کے ضمن میں انھوں نے افغانستان، ایران، پاکستان، بنگلہ دیش، شام، روس، برطانیہ (چند بار) اور امریکہ (کئی بار) کے دورے بھی کیے۔

ایسے فعال آدمی اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں ۔پھر لطف یہ ہے کہ اتنی مصروفیات کے باوجود ان کا تحریری کام بھی بڑا وسیع ہے ۔وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے حافظ محمود شیرانی پر حیرت ہوتی ہے کہ بیس بائیس برس کے قلیل عرصے میں وہ اتنا وافر اور معیاری علمی کام اپنی یادگار چھوڑ گئے ۔مجھے یہی تعجب ڈیسائی صاحب پر ہوتا ہے کہ گو انھیں تالیفی کام کے لیے چالیس بیالیس سال ملے تاہم ان کی بے پناہ غیر تالیفی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے اتنے زیادہ تحریری کاموں کے لیے یہ مہلت بھی بہت کم معلوم ہوتی ہے ۔نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں مرحوم کی تحریری خدمات کا مختصر تعارف، تاریخی ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے پیش کر دیا جائے ۔

(۱) ڈیسائی صاحب کی منظر عام پر آنے والی پہلی کتاب ان کا ڈی ۔لٹ کا مقالہ تھا جو بزبان انگریزی ''لائف اینڈ ورکس آف فیضی'' (احوال وآثار فیضی) کے عنوان سے ۱۹۶۱ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔

(۲) مشہور ماہر آثار قدیمہ اے گھوش کی انگریزی تالیف ''انڈین آرکیالوجی'' کا اس کی اہمیت کے پیش نظر ڈیسائی صاحب نے اردو ترجمہ کیا۔ یہ بھی ۱۹۶۱ء ہی میں لکھنو سے شائع کیا گیا۔

(۳) ان کی ایک نہایت ہی قابل قدر تالیف ''موسکس آف انڈیا'' (ہندوستان کی مساجد) ہے جو پہلی بار ۱۹۶۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا (منسٹری آف انفرمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ پبلیکیشنز ڈویژن) کی جانب سے چھاپی گئی۔ پھر ۱۹۹۰ء تک اس کے متعدد ایڈیشن نکلے ۔میرے پیش نظر ۱۹۹۰ء والی اشاعت ہے ۔ممکن ہے اس کے بعد بھی چھپی ہو۔ اس کی ابتدا میں انھوں نے اسلام میں مسجد کے مرتبے اور مقام کی نشان دہی کی ہے ۔پھر اس کی تعمیر کے آغاز وارتقا اور ہندوستان میں اولین مساجد کی تعمیر اور طرز تعمیر کو زیر بحث لائے

ہیں ۔اس کے علاوہ ہندوستان میں مسلمانوں کی علاقائی حکومتوں مثلاً بنگال، گجرات، مالوہ، جونپور، دکن اور کشمیر کی اہم مساجد کا تذکرہ ہے۔کتاب میں متعدد ممتاز اور منفرد مساجد کی تصاویر بھی شامل ہیں ۔اس کتاب کی اہمیت اور مقبولیت کے پیش نظر اس کے اردو اور ہندی ترجمے بھی شائع ہوئے۔

(۴) ''پبلشڈ مسلم انسکرپشنز آف راجستھان''(راجستھان میں مسلمانوں کے تا حال شائع شدہ کتبے)۔حکومت راجستھان کے ڈائرکٹوریٹ آف آرکیالوجی اینڈ میوزیمز کی طرف سے ۱۹۷۱ء میں جے پور سے شائع کی گئی۔

(۵) ''انڈو اسلامک آرکیٹکچر''(ہند اسلامی فن تعمیر) پبلی کیشنز ڈویژن (نئی دہلی) نے ۱۹۷۷ء اور پھر ۱۹۸۶ء میں چھاپی۔اس کتاب کو اختر الواسع نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

(۶) ''سنٹرز آف اسلامک لرننگ ان انڈیا''(ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز) ایک اور وقیع کتاب ہے جو ۱۹۷۹ء میں دہلی سے اشاعت پذیر ہوئی۔بہار ربانی نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔علاوہ ازیں اس کا ہندی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

(۷) ''پرسو عربیک اپی گرافی آف گجرات''(گجرات کے عربی و فارسی کتبات)۔یہ کتاب مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی، بڑودہ نے ۱۹۸۲ء میں شائع کی۔

(۸) ۱۹۸۲ء ہی میں ڈیسائی صاحب کی ایک اور تالیف ''تاج محل'' جو ایچ ۔اے کول کے اشتراک سے لکھی گئی تھی، چھپی۔

(۹) ''فتح پور سیکری……اے سورس بک'' ۱۹۸۵ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شہر کیمبرج (میساچوسٹس) سے شائع ہوئی۔ ڈیسائی صاحب اس کے شریک مولف تھے۔

(۱۰) ''مسلم مونومینٹل کیلیگرافی آف انڈیا''(مشترک تالیف) یہ کتاب بھی ۱۹۸۵ء میں امریکہ کے شہر آیووا سے اشاعت یاب ہوئی۔

(۱۱) ''دفتر ودیا''۔ڈیسائی صاحب کی یہ تالیف ان کی مادری زبان گجراتی میں ہے اور اس کا موضوع علم الآثار قدیمہ ہے۔یہ احمد آباد سے ۱۹۸۶ء میں چھپی تھی۔

(۱۲) ''کوریس آف انسکرپشنز سٹورڈ ان دی میوزیم آف گجرات''(گجرات کے عجائب گھر میں موجود کتبہ جات کی جامع فہرست)۔شائع شدہ ۱۹۸۷ء۔

(۱۳) ''تاج محل……این الومینیٹڈ ٹومب''(تاج محل……ایک منقش مقبرہ) یہ کتاب ڈاکٹر بیگلے کی رفاقت میں لکھی گئی اور ۱۹۸۹ء میں آیووا سٹی (امریکہ) اور نئی دہلی سے بیک وقت شائع ہوئی۔

(۱۴) ''اے ٹوپوگرافیکل لسٹ آف عربیک، پرشین اینڈ اردو انسکرپشنز آف ساؤتھ انڈیا'' یہ وہی فہرست کتبات ہے جو ڈیسائی صاحب نے انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ کے سینئر فیلو کی حیثیت سے تیار کی تھی۔یہ نئی دہلی سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔

(۱۵) شاہجہان نامہ عنایت خاں کا انگریزی ترجمہ جو انھوں نے مسٹر بیگلے کے اشتراک سے کیا تھا۔یہ واشنگٹن ڈی۔سی سے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا گیا۔

(۱۶) ''ملفوظ لٹریچر'' دراصل یہ ڈیسائی صاحب کا دیا ہوا مولوی خدا بخش توسیعی خطبہ ہے ۔اس مختصر تالیف میں انھوں نے مولانا محمد بن ابی القاسم کے مرتبہ ملفوظات حضرت شیخ احمد کھٹو بعنوان ''مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول'' کے گہرے مطالعے سے تیرھویں چودھویں

صدی عیسوی کے راجستھان اور گجرات کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اسے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے ۱۹۹۱ء میں چھاپا۔

(۱۷) ''ذخیرۃ الخوانین'' مولفہ شیخ فرید بخاری کے حصہ اول کا انگریزی ترجمہ جو ۱۹۹۲ء میں نئی دہلی سے شائع ہوا۔

(۱۸) عربیک اینڈ پرشین مینسکرپٹس ان دی خدا بخش لائبریری'' جلد اول: تصحیحات و اضافہ مطبوعہ پٹنہ، ۱۹۹۵ء۔

(۱۹) ''کیٹلاگ آف مسلم کوائنز اسٹورڈ ان دی بڑودہ میوزیم اینڈ آرٹ گیلری'' یہ فہرست مسکوکات ۱۹۹۵ء میں زیر طبع تھی۔ لیکن یہ میری نظر سے نہیں گزری۔

(۲۰) ''ہسٹری آف شاہجہاں'' (باشتراک ڈاکٹر بیگلے) یہ کتاب بھی ۱۹۹۵ء کے لگ بھگ طباعت کے لیے تیار تھی لیکن اس میں تاخیر اس لیے ہو رہی تھی کہ بقول ڈیسائی صاحب مسٹر بیگلے اس کی انگریزی کو امریکی رنگ دینا چاہتے تھے۔

(۲۱) ''عربیک، پرشین اینڈ اردو انسکرپشنز آف ویسٹ انڈیا ...... اے ٹوپوگرافیکل لسٹ'' یہ کتاب جو ۱۹۹۹ء میں دہلی کے ایک نجی ادارے نے چھاپی دراصل انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ والے منصوبے کی دوسری کڑی تھی۔ مغربی ہند سے متعلق اس جلد میں گوا، گجرات، مہاراشٹر اور راجستھان کے ۲۱۶۸ کتبات کا تعارف شامل ہے۔ ان میں راجستھان سے تعلق رکھنے والے کتبوں کی تعداد ۵۴۰ کے قریب ہے۔

(۲۲) احمد آباد کے مشہور کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ کی فہرست مخطوطات کی چھ جلدیں بھی ڈیسائی صاحب کی نگرانی اور سرپرستی میں شائع ہوئیں۔

(۲۳) ''کیٹلاگ آف دی ایگزیبی میٹز آف اسلامک کیلی گرافی ان سارا بھائی میوزیم، احمد آباد'' یہ فہرست نمونہ ہائے خطاطی احمد آباد سے شائع ہوئی لیکن سنہ اشاعت کا مجھے علم نہیں ہے۔

(۲۴) ''کیٹیلاگ آف پینٹنگز، البمز اینڈ السٹریٹڈ مینسکرپٹس ان دی رضا لائبریری رامپور'' اس کا مقام اشاعت نئی دہلی اور سنہ اشاعت ۲۰۰۱ء ہے۔

ان باقاعدہ تالیفات کے علاوہ ڈیسائی صاحب کا مقالات و مضامین کی شکل میں بکھرا ہوا علمی کام بھی بہت زیادہ ہے۔ ان کے ایک تعارف نامے کے مطابق جو ۱۹۹۵ء میں تیار کیا گیا تھا، اس وقت تک ان کے مقالات کی تعداد ۲۵۰ سے اوپر تھی۔ ان کی کتاب ''مغربی ہند کے عربی، فارسی اور اردو کتبات'' (سال اشاعت ۱۹۹۹ء) کے فلیپ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال تک یہ تعداد ۳۵۰ تک پہنچ چکی تھی۔ کیونکہ مضامین لکھنے کا سلسلہ اس کے بعد بھی کم از کم دو برس تک جاری رہا اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ مرحوم کے مقالات کی کل تعداد، جس میں ریڈیو سے نشر ہونے والے مضامین بھی شامل ہیں، چار سو سے کم نہ ہوگی۔ ان میں سے بیشتر مقالات ملک کے مختلف علمی مجلات اور ادبی رسائل میں چھپے۔ ڈیسائی صاحب کے بیسیوں مقالے مختلف اہم علمی شخصیات کے اعزاز میں شائع ہونے والی تقریبی اور یادگار جلدوں کی زینت بنے۔ ان میں سے کئی نام ہمارے جانے پہچانے ہیں مثلاً:

ڈاکٹر غلام یزدانی (حیدرآباد ۱۹۶۶ء)، ڈاکٹر ذاکر حسین خان (نئی دہلی، ۱۹۶۸ء) پروفیسر سید حسن عسکری (پٹنہ ۱۹۶۸ء)، مالک رام جی (نئی دہلی، ۱۹۷۱ء)، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (حیدرآباد، ۱۹۷۵ء) حکیم عبدالحمید (نئی دہلی، ۱۹۸۱ء) پروفیسر محمد حبیب (علی گڑھ، ۱۹۹۵ء) ڈاکٹر فخر الدین علی احمد (۱۹۹۵ء میں زیر طبع)۔

متعدد کتب حوالہ میں بھی ڈیسائی صاحب کے مختلف موضوعات پر مضامین شامل کیے گئے ۔یہاں ایسی کچھ تالیفات کے نام درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

☆ ''گزیٹیئر آف انڈیا'' (جلد دوم وسوم) نئی دہلی

☆ ''ہسٹری آف میڈی ایول دکن'' (جلد دوم)، حیدرآباد، ۱۹۷۴ء

☆ ''گجرات نو راجا کیا نے سنسکرتیک اتہاس''

یعنی گجرات کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ (بزبان گجراتی) جلد چہارم، احمد آباد، ۱۹۷۶ء

ایضاً جلد پنجم، احمد آباد، ۱۹۷۷ء

ایضاً جلد ششم، احمد آباد، ۱۹۷۹ء

☆ ''گجراتی وشوا کوشا'' (گجرات انسائیکلوپیڈیا۔بزبان گجراتی)، احمد آباد

☆ ''اردو انسائیکلوپیڈیا'' حیدرآباد

☆ ''ڈریوڈین انسائیکلوپیڈیا'' ٹریوینڈرم

☆ ''کناڈا انسائیکلوپیڈیا'' میسور

☆ ''فائن آرٹس والیوم آف تیلیگو بھاشا'' حیدرآباد

☆ ''ڈکشنری آف آرٹ'' لندن

☆ ''انسائیکلوپیڈیا پرسکا'' نیویارک

☆ ''کلچرل ہیریٹیج آف انڈیا'' (جلد ہفتم)، کلکتہ

ڈیسائی کے کل مقالات کی تقریباً اسی فی صد تعداد انگریزی میں لکھی گئی ہے۔کم وبیش چالیس مضامین اردو زبان میں ہیں اور کوئی تیس کے قریب گجراتی میں ہوں گے۔چند مضامین ہندی میں بھی ملتے ہیں۔فارسی میں بعض مقالات بتائے جاتے ہیں لیکن مجھے ان میں سے کوئی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

موضوعات کے اعتبار سے ان مقالات کو آٹھ خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ان میں سب سے بڑا موضوع کتبہ شناسی ہے جس پر تحریر کردہ مقالات کی تعداد ڈیڑھ سو سے کیا کم ہوگی۔ان میں سے نصف کے قریب ''اپی گرافیکل جنرل آف دی آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا'' میں شائع ہوئے۔ڈیسائی صاحب ایک طویل عرصے تک ''اپی گرافیکا انڈیکا (عربک اینڈ پرشین)'' کے مدیر رہے اور ان کے زیر ادارت اس مجلّے کے کیس ضخیم شمارے نکلے۔کتبہ شناسی سے متعلق باقی مضامین مختلف کتابوں، جرائد اور رسائل میں چھپے۔

دوسرا اہم موضوع آرٹ اینڈ آرکیٹکچر ہے جس پر ساٹھ کے قریب مقالات ان کی یادگار ہیں۔تیسرا موضوع تاریخ (تعداد مقالات تقریباً پچاس) اور چوتھا فارسی زبان وادب (کم وبیش چالیس مضامین) کہا جا سکتا ہے۔علم مسکوکات اور گجراتی اردو پر بھی متعدد مضامین موجود ہیں۔بیس کے قریب متفرق مضامین ہیں۔آٹھواں اور آخری موضوع علمی کتابوں پر تبصرے کا ہے۔

اگر کسی صاحب علم کو توفیق ہو اور وہ ڈاکٹر ڈیسائی مرحوم کے تمام مقالات کو جمع کر کے اشاعت کی غرض سے مرتب کر لے تو یہ کئی ضخیم جلدوں میں سمائیں گے۔بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہند اسلامی تاریخ وتہذیب اور بالخصوص کتبہ شناسی پر وہ مرحوم جیسا اور

جتنا کام اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ان کے محاسن اخلاق کے بارے میں سب سے اہم شہادت پروفیسر سید عبدالرحیم کی ہے جنھیں چالیس برس تک ڈیسائی صاحب کی شاگردی اور رفاقت کا شرف حاصل رہا۔ وہ اپنے مضمون ''ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی'' (مطبوعہ ''معارف'' بابت جون ۲۰۰۲ء میں لکھتے ہیں:

''ایمانداری، خلوص، خوف خدا، سچائی، پاس نفس، بے نفسی، پاکبازی، غیرت اسلامی، بے خوفی، حق گوئی، محنت، لگن اور نہ جانے کتنے صفاتی اور کمالاتی جواہر ڈاکٹر صاحب کی سیرت میں تابندہ نظر آتے تھے۔ صحبت ناجنس سے گریز، علمی اور تحقیقی کاموں میں انہماک، پے در پے اسفار اور کم آمیزی نے آپ کو بالکل یکسو کر کے رکھا تھا۔ وہ زندگی کے ایک ایک لمحے کی قدر و قیمت جانتے تھے۔ ان کے نزدیک کام کا انعام صرف کام ہے۔ قدر دانی، صلہ و ستائش محض اضافی چیزیں ہیں۔''

آخر میں ڈیسائی صاحب کی رحلت پر موزوں کردہ ایک قطعہ تاریخ وفات درج کیا جاتا ہے:

لو ضیاء الدین ڈیسائی ہوئے واصل بحق
کیا کہوں یہ سن کے کیسا میرے دل کو ہے قلق
غفراللہ تعالیٰ کے سوا اب کیا کہیں
فرط غم سے صاحبان علم کا سینہ ہے شق
احمد آباد آج تیرے بام و در تاریک ہیں
اب ضیائے علم و دین سے ہے تہی تیرا افق
دود دل سے دن بھی تیرا شام کی مانند ہے
جوئے خون چشم سے گلزار ہے تیری شفق
اب کہاں سے لاؤں گا ایسا محبّ بے ریا
اب کہاں سے پاؤں گا ایسا عزیز مستحق
''آہ'' کھینچی ''ہائے'' نکلی تب ہوا رحلت کا سنہ
''جا بیابد فی الجوار رحمت رب الفلق''

سنہ ۱۴۴۵ـ۲۲ = ۱۴۲۳ھ

حواشی

۱؎ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار مرحوم کا تعلق لاہور و امرتسر کے ایک کشمیری خاندان سے تھا۔ ۴؍ اگست ۱۹۰۴ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ میٹرک اسلامیہ ہائی اسکول، امرتسر اور بی۔ اے خالصہ کالج امرتسر سے کیا۔ ۱۹۲۷ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ایم۔ اے (عربی) میں کامیابی حاصل کی۔ لاہور میں مولوی محمد شفیع اور پروفیسر حافظ محمود شیرانی سے خصوصی استفادہ کا موقع ملا۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۱ء تک بطور میکلوڈ ریسرچ سکالر تحقیق میں

مصروف رہے۔ ۱۹۳۱ء میں بطور استاد ادبیات فارسی، گجرات کالج احمد آباد میں تقرر ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں اسماعیل یوسف کالج، بمبئی تبادلہ ہو گیا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء تک پھر احمد آباد رہے اور جون ۱۹۴۸ء میں بمبئی واپس آئے۔ ۱۷ مئی ۱۹۵۳ء کو بمبئی ہی میں وفات پائی اور باندرہ اسٹیشن کے گورستان میں مدفون ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالغنی ڈار کا شمار اہم قوم پرست رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ وہ تقسیم ملک کے بعد مشرقی پنجاب اسمبلی کے رکن رہے۔ ابراہیم صاحب کے ایک بڑے بھائی محمد یامین ڈار کا انگریز حکومت کی نظر بندی کے دوران میں ۱۲ اپریل ۱۹۴۵ء کو انتقال ہوا۔ ان کی صاحبزادی مس اقبال ڈار صاحبہ لاہور کالج برائے خواتین کی پرنسپل تھیں۔

ابراہیم ڈار صاحب اپنے استاد پروفیسر شیرانی کے شیدائی تھے اور فن تحقیق میں ان کے پیرو کار بھی۔ پروفیسر ظہیر الدین مدنی کا کہنا ہے کہ: "تحقیق و تنقید کے میدان میں ڈار صاحب نے اپنے استاد حافظ محمود شیرانی کے نقش قدم پر چلنے کی کامیاب کوشش کی ہے"۔ ("مرحوم ڈار صاحب" مشمولہ مضامین ڈار) اور ڈاکٹر سید عبداللہ جو خود بھی شیرانی صاحب کے عزیز شاگرد تھے "مضامین ڈار" کے پیش لفظ میں اعتراف کرتے ہیں کہ "ابراہیم تحقیق و تنقید میں شیرانی اسکول کے ممتاز ترین فرد تھے۔" اس کا ثبوت ڈار صاحب کے مقالات سے بخوبی فراہم ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے ڈیسائی صاحب نے ان پر جو مضمون لکھا تھا اس کا عنوان "دبستان شیرانی کا ایک محقق" تجویز کیا تھا۔ یہ اردو مضامین رسالہ "ساہر نامہ" بابت سال ۱۹۹۰ء میں چھپا تھا۔

۲ "معارف" کے شمارہ جون ۲۰۰۲ء میں پروفیسر سید عبدالرحیم کے مضمون سے یہ انکشاف ہوا کہ ڈیسائی صاحب نے حج بھی کیا ہوا تھا۔ سید صاحب لکھتے ہیں: "ڈیسائی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت بھی نصیب فرمائی تھی۔ نماز کے بہت پابند تھے۔ بیماری کی حالت میں بھی بیٹھ کر اور اشاروں سے نماز ادا کرتے۔"

۳ ملاحظہ ہو "مکاتیب حافظ محمود شیرانی" صفحہ ۳۰۲۔۲۹۸، لاہور، ۱۹۸۱ء

۴ یہ مسجد بعہد سلطان ناصر الدین محمود (۶۶۴۔۶۴۴ھ) خلف سلطان شمس الدین التمش سنہ ۶۵۵ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔ ان دنوں ناگور کا علاقہ مستقبل کے سلطان غیاث الدین بلبن کی جاگیر تھا۔ شکستہ ہونے کے سبب اس عربی کتبے کے کچھ الفاظ ضائع ہو چکے تھے لیکن سنہ تعمیر صاف پڑھا جاتا ہے۔ ملتقط الفاظ یہ ہیں:

"ھذا عمارۃ المسجد ...... بن السلطان ناصر امیر المومنین خلد اللہ ملکہ ...... العبد الضعیف ابی بکر الشامی الغرۃ من ذی الحجہ سنہ خمس و خمسین و ستمایہ"

۵ ڈھانی شیرانیاں حال شیرانی آباد۔

۶ حافظ محمد صدیق بڑی کھاٹو کے ایک دردمند اور درویش منش بزرگ تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرحوم نے اپنے مضمون "کھٹو ...... راجستھان کی ایک قدیم بستی" (سہ ماہی "اردو" بابت جنوری ۱۹۶۸ء) میں ان کا ذکر کیا ہے۔ میری ۱۹۶۴ء میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر ڈیسائی نے ان کے مقبوضہ جس کتبے کا ذکر کیا ہے وہ الگ تھا اور ایک مسجد کے محراب سے تعلق رکھتا تھا۔ جو سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں تعمیر ہوئی تھی۔

۷ بالآخر یہ کتبہ مولانا ابوالکلام آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک کے مجموعہ نوادرات میں منتقل کر دیا گیا۔

۸ بہر حال اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ امانت دار شریف آدمی تھے۔ ایک بار اس خیال سے کہ کہیں زمین میں دفن ہونے کے باعث یہ بندوق خراب نہ ہو جائے انہوں نے کسی آثار عتیقہ کے تاجر سے اس کا ذکر کیا۔ اس نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے بتایا گیا کہ شہر میں نہیں ہے۔ فارم والے مکان میں دفن ہے۔ وہ شاطر آدمی تھا۔ اسے اتنا اشارہ کافی ہوا۔ وہ دیہی مکان اکثر مقفل رہتا تھا۔ اس شخص نے کوئی موقع تاڑ کر بندوق نکال لی۔ پھر خدا جانے اس کا کیا حشر ہوا۔

۹ بعد میں یہ تقریر عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جرنل (جلد ۴، بابت ۸۵۔۱۹۸۴ء) میں شائع ہوئی۔

۱۰ "ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی" از پروفیسر سید عبدالرحیم مطبوعہ "معارف" بابت جون ۲۰۰۲ء

۱۱ مولانا عمران خاں، مولانا قاضی عرفان خاں مرحوم (ناظم محکمہ شرع شریف، ٹونک) کے صاحبزادے اور قاضی شہر کے منصب پر فائز تھے۔ گریجویٹ تھے لیکن عربی، علوم اسلامیہ اور فارسی کا علم بڑا ٹھوس تھا۔ ادارہ تحقیقات میں تحقیق و تدوین کا کام کرتے تھے۔ ادارے کے مخطوطات کی فہرست

سازی کا کام بھی انجام دیا۔ بڑے ہمدرد اور مخلص انسان تھے۔ شیرانی صاحب کے مزار کی تعمیر کا کام بھی انھی کی نگرانی میں مکمل ہوا تھا۔ ۱۹۸۶ء میں اعزہ سے ملنے پاکستان آئے ہوئے تھے کہ ۱۳ فروری کو حیدرآباد (سندھ) میں دل کے دورے سے وفات پائی اور ٹنڈو یوسف کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

۱۲ سرکھیج غالباً "سرخیز" کی مقامی صورت ہے۔ یہ قصبہ مغربی سلسلے کے معروف بزرگ حضرت شیخ احمد کھٹو کے مزار مبارک کی بنا پر مشہور خلائق ہے۔

۱۳ پورا نام عبدالعزیز عبداللہ میاں منشی۔ عبداللہ میاں ان کے والد کا نام تھا۔

۱۴ اس موضوع پر چغتائی صاحب کے کاموں میں:

۱۔ کھٹو......راجستھان کی ایک قدیم بستی۔

۲۔ قدیم تاریخی بستی ......بیانیہ۔

۳۔ Nagaur.......A Forgotten Kingdom اور

۴۔ Some Inscriptions from Didwana, Jalore, Ladnun and Nagaur. قابل ذکر ہیں۔

۱۵ یہ کتاب "Published Muslim Inscription of Rajasthan" اس مکتوب سے پندرہ نہیں بلکہ انیس سال پہلے سنہ ۱۹۷۱ء میں جے پور سے شائع ہوئی تھی۔

۱۶ خواجہ صاحب نے ایک بار انھیں دو مخطوطوں، جن میں ایک حضرت شاہ عالم گجراتی کے حالات پر مبنی ضخیم تالیف "روضات شاہی" تھی (جس کا منحصر بفرد مخطوطہ ڈاکٹر معین الحق مرحوم کے پاس تھا) کے تقریباً آٹھ سو صفحات کے فوٹو اسٹیٹ بنوا کر ارسال کیے تھے۔

۱۷ اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں اور ڈاک خانے کی مہریں مبہم ہیں۔

۱۸ قاضی محمود دریائی بیرپوری کے دیوان کا واحد معلوم نسخہ درگاہ پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد میں تھا۔ پروفیسر ابراہیم ڈار نے شیرانی صاحب کی فرمائش پر اس کی نقل تیار کروا کر روانہ کی تھی۔ بعد میں اصل مخطوطہ ضائع ہو گیا۔ اس لیے ڈیسائی صاحب کو لاہور والی نقل درکار تھی۔

۱۹ یہ امریکن دوست تھے پروفیسر ڈاکٹر بیگلے (W.E.Begley) جو ۱۹۸۰ء کے نصف دوم میں امریکن انسٹی ٹیوٹ برائے پاکستانی مطالعات لاہور میں ریسرچ فیلو کے طور پر کام کرتے رہے تھے۔ بعد میں یہ امریکن انسٹی ٹیوٹ فار انڈین سٹڈیز (دہلی) سے وابستہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر ڈیسائی کے اشتراک سے شاہ جہاں اور اس کے عہد سے متعلق خاصا کام کیا۔ ان کاموں کا تعارف آگے ڈیسائی صاحب کی تالیفات کے تذکرے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۰ ڈیسائی صاحب واقعی فنافی العلم تھے۔ ان کے نزدیک زندگی اور علمی مصروفیت مترادف حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کے اس شغف کے بارے میں ان کے پڑوسی پروفیسر محبوب حسین عباسی کا بیان ہے "میں ڈیسائی صاحب سے آخری بار ۲۱ تاریخ کی صبح یعنی وفات سے صرف تین روز قبل) ملا تو آکسیجن لگا ہوا تھا۔ پھر بھی اچھی طرح بات چیت کی۔ کچھ وقت پہلے امریکہ کے پروفیسر ڈاکٹر جان سیلر (John Seyller) کے ایک مقالے پر نوٹس لکھے تھے۔ اس کی کاپی مجھے دی اور امریکہ روانہ کرنے کے لیے کہا۔ ان کا پتہ خود انھوں نے ڈائری سے تلاش کر کے مجھے لکھوایا......" (ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی" از پروفیسر سید عبدالرحیم، مطبوعہ "معارف" جون ۲۰۰۲ء)

۲۱ آرٹ پیپر پر یہ دیدہ زیب کتاب شیخ راشد صاحب نے سنہ ۱۹۹۸ء میں ادارہ علم و فن، کراچی کے زیر اہتمام شائع کی۔ اس میں عالم اسلام سے تعلق رکھنے والے دور جدید کے تیس بڑے خطاطوں کا تذکرہ اور ان کی خطاطی کے نمونے شامل ہیں۔

۲۲ ملاحظہ ہو "پاک و ہند میں اسلامی خطاطی" لاہور، ۱۹۷۶ء

۲۳ دیکھیے "فہرست مخطوطات شیرانی" (جلد دوم) صفحہ ۳۳۴، لاہور، جون ۱۹۶۹ء

۲۴ چنانچہ "مکاتیب حافظ محمود شیرانی" (صفحہ ۲۹۸، لاہور، ۱۹۸۱ء) میں میں نے ضیاء الدین احمد ہی درج کیا تھا اور میں ہی کیا بیشتر لوگ یہی سمجھتے تھے۔ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی تالیف "پیر حسام الدین راشدی اور ان کے علمی کارنامے" (صفحہ ۳۵، کراچی، ۱۹۸۴ء) میں بھی ضیاءالدین احمد لکھا ہے۔

خطوط مہر بنام بشیر احمد ڈار

مرتبہ محمد حمزہ فاروقی

ان خطوط کے مکتوب الیہ بشیر احمد ڈار مرحوم تھے۔ آپ اس زمانے میں اقبال اکادمی کے ڈائریکٹر تھے۔ یہ اکادمی کا سنہری دور تھا۔ ڈار صاحب نے مشنری جذبے کے تحت اقبال کے فکر و فن پر عمدہ کتابیں لکھیں اور دیگر اہل قلم حضرات کو بھی اس طرف مائل کیا۔ چنانچہ "انوار اقبال" "مکاتیب اقبال بنام گرامی" مرتبہ محمد عبداللہ قریشی، ڈار صاحب کے دور میں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ جب تک ڈار صاحب کو ممتاز حسین مرحوم کا تعاون میسر تھا اکادمی کا کام بحسن و خوبی چلتا رہا۔ ممتاز صاحب خود بڑے درجے کے عالم اور علم دوست انسان تھے۔ ان سے بہت سے علمی ادارے فیض یاب ہوتے رہے۔ ۱۹۷۹ء میں سید عبدالواحد اکادمی کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ یہ "پیر مرد" اکادمی اور ڈار صاحب کے حق میں پیر تسمہ پا ثابت ہوئے۔ نتیجہ یہ کہ اکادمی کے علمی کاموں میں خلل آنے لگا اور ڈار صاحب کی پریشانیوں میں اضافہ ہوا۔

ڈار صاحب نے مہر سے استدعا کی کہ وہ شیخ منظور الٰہی جو اس وقت وزارت تعلیمات کے سیکرٹری تھے، سے کہہ کر سید عبدالواحد کی ریشہ دوانیوں سے نجات دلائیں۔ ڈار صاحب کے نام خطوط میں بعض علمی مباحث بھی ملتے تھے۔ ڈار صاحب نے کلام اقبال کے انگریزی تراجم کیے تھے۔ مولانا مہر نے شیخ غلام علی اینڈ سنز کے ذریعے سے ان تراجم کی اشاعت کا بندوبست کیا تھا۔

ڈار صاحب اکادمی سے مستعفی ہونے کے بعد روزگار کے ہاتھوں پریشان رہے۔ ان پریشانیوں کا عکس ان مکاتیب میں ملتا تھا۔ مولانا مہر نے حتی الامکان ڈار صاحب کی دل دہی کی اور ان کا حوصلہ بڑھایا۔ بتیس سال قبل جب ڈار صاحب نے یہ خطوط میرے حوالے کیے تو انھوں نے ان سے متعلق حواشی بھی لکھوا دیے تھے۔

﴿۱﴾

۲۶/۱۲/۶۹ باسمہ سبحانہ

برادر عزیز کتاب[1] مل گئی، اب میں اسے دیکھ کر آپ کی خدمت میں کچھ عرض کر سکوں گا۔ یہ یقین رکھنا چاہیے کہ میری طرف سے کوئی کوتاہی نہ ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

آپ نے جن[2] صاحب کے متعلق تحریر فرمایا ہے میں ان کے سلسلے میں اکرام صاحب کو کیا کہوں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا، اگر وہ صاحب ان چار آدمیوں کا مشورہ قبول کرنے کے بجائے آپ کو تنگ کر رہے ہیں تو اکرام صاحب انھیں کیا کہہ کر روکیں؟ جب وہ ان کی بات سننے ہی کے لیے تیار نہ ہوں تو میرے ذمے کیا فرض ہے؟ مہربانی فرما کر وضاحت سے لکھیے تا کہ خدمت گزار کو

اپنے دائرۂ عمل میں کچھ سوچنے اور ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع ملے۔امید ہے آپ بخیر ہوں۔

مہربانی فرما کر آپ اور حسام الدین[3] مل کر کوشش کریں کہ میرا مسودہ[4] واپس آجائے۔میں نے سخت غلطی کی کہ ان حضرات پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ مسودہ حوالے کر دیا۔حسام الدین سے کہیے کہ جو کچھ ہو چکا ہے،اس کو کافی سمجھیں اور مجھے پریشانی کا تختۂ مشق نہ بنائیں۔والسلام علیکم

آپ کا مہر

﴿۲﴾

۱۲/۲/۷۰ باسمہ سبحانہ

بھائی۔میں پندرہ سولہ روز انفلوئنزا کا شکار رہا۔ضعف نے بہت پریشان کیا۔اب اچھا ہوں لیکن ابھی ضعف پیچھا نہیں چھوڑتا۔

میں کچھ نہ کر سکا۔اب طبیعت ذرا بہتر ہو تو بات چیت کروں اور دیکھوں کہ تلوں میں تیل ہے تو کس قدر ہے۔[5]

آیا اس سے یہ ہو سکتا ہے کہ جدوجہد نا خوشگوار معلوم نہ ہو۔

معلوم ہوتا ہے آپ کی توجہ اس عاجز پر کم ہو گئی ہے۔بھائی ہم لوگ توجہ میں نشیب و فراز کے متحمل نہیں۔فطرۃً انتہا پسند ہیں۔دوستی ہو تو ایسی جسے دوستی کہتے ہیں۔یہ نہ ہو تو پھر عداوت ہو۔

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو کیجیے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

نیز قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

یہ شبنم کی طرح قطرہ قطرہ بن کے گرنا ہمیں منظور نہیں۔ہمارا ظرف اس سے بہت وسیع ہے۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

والسلام علیکم

آپ کا

مہر

﴿۳﴾

۲/۴/۷۰ باسمہ سبحانہ

برادر عزیز۔آپ کے دونوں خط مل گئے۔گلشن راز جدید[6] کا شکریہ۔ابھی دیکھنے کی نوبت نہیں آئی جو تعلق پیدا ہوا ہے، اسے ذرا استوار ہونے دیں۔پریشان نہ ہوں۔ایسی باتوں کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے اور وہ مناسب وقت پر ہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔کتاب چھپنے اور بکری شروع ہونے دیں۔نیز دوسری تیار کریں[7]۔اطمینان رکھیں کہ ان شاءاللہ آپ کو تکلیف نہ ہوگی۔ابھی ایسے اذکار چھیڑے جائیں تو فریقین کے درمیان خواہ مخواہ اور بے ضرورت وساوس پیدا ہوں گے۔میں

اس کے حق میں نہیں۔ البتہ مناسب وموزوں وقت پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے (نہ کہ انسان کی سعی سے) جو کچھ ہو سکے گا ہو رہے گا۔

امید ہے آپ بخیر ہوں۔ ''پس چہ باید کرد'' کی فکر کریں۔

ایک مردِ کراچی میں ہے جس کا نام حسام الدین ہے اور وہ اپنے آپ کو سید یا پیر لکھتا ہے۔ اس سے کہیے کہ اپنا علم و فضل بگھارنے کی یہ کوئی صورت نہیں کہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی[8] سے میرے متعلق باتیں کی جائیں اور میری ناموجودگی میں۔ کوئی اور طریقہ سوچو۔

والسلام

مہر

﴿۴﴾

۱۰/۷/۷۰ باسمہٖ سبحانہ

بھائی، اس خط میں کون سی بات جواب طلب تھی؟ کیا میں آپ کے اس ارشاد کی تائید کرتا کہ واقعی میرا دوست[9] آپ کے لیے وجہِ مصیبت بنا؟ حالانکہ وہ میرا ''دوست'' بھی نہیں اور غالباً وہ اس معاملے میں اثر انداز بھی نہ ہوا ہوگا۔ ہمارے ہاں جو انتظامات ہو رہے ہیں، ان میں حقیقت نا پید ہے۔ جعل ونمائش زیادہ ہے۔ اب جو صاحب[10] براجمان ہوئے ہیں وہ تو اقبال کے متعلق چند حرف بھی نہیں جانتے اور نہ مقاصد کے اندازہ شناس ہیں۔ اپنے جیسے لائیں گے اور جو کچھ ہو چکا ہے اس کا بیڑا غرق کریں گے؟ اس پر تعجب کا کون سا مقام ہے؟ مقرر کرنے والے جاہل اور وہ اپنے مقاصد کے درپے، اگلے اپنے مقاصد کے درپے۔ باقی رہے کام تو وہ اللہ کے حوالے۔ قوموں کی بربادی کے اسباب وعوامل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آپ میرے افکار پر بہت جز بز ہوا کرتے ہیں۔ کیا اب بھی آپ کو یقین نہیں آیا کہ جو حقیقت ہے وہی ہمیشہ میری زبان پر ہوئی[11]۔ پھر میں نہ کسی سے تنخواہ کا خواہاں ہوں، نہ پنشن یا وظیفے کا نہ جاگیر کا۔ ایک مرتبہ قدرت اللہ شہاب نے میرے لیے ''میرٹ پر فورمینس'' کا انتظام کیا تھا۔ حالانکہ میں ان سے کبھی نہ ملا تھا۔ وہ اس وجہ سے جہنم رسید ہوا کہ میں نے خطاب قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور خوش ہوں کہ خدا نے اپنی رحمت سے میرا دامن ایک داغ سے بچا لیا[12] مجھے فرصت نہیں کہ ''پس چہ باید کرد'' نکالوں اور دیکھوں۔ شعر کا مطلب واضح ہے۔

۱۔ رہ نشین اسے کہتے ہیں جو راستے میں بیٹھا ہو اور چل نہ رہا ہو۔

۲۔ ''صد'' ایک لفظ ہے۔

۳۔ 'می کند صد را ولا نمورد' کے لفظی معنی یہ ہوئے اس کا جذبہ ایک زندہ انسان کے دل میں پیدا ہو جائے تو راستے میں سیکڑوں ہزاروں بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی منزل پر آمادہ کر دے۔ اس میں کوئی پیچ نہیں۔ خدا کرے کوئی اچھا انتظام ہو جائے۔ میری سمجھ میں تو کوئی بات آتی نہیں۔ یہاں کس ادارے میں امکان ہے؟ ہر ادارہ پہلے سے لبریز ہے یعنی بظاہر وہاں مواقع زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کیوں ممتاز صاحب اور راشدی صاحب سے نہیں کہتے۔ ان کے تصرفات میں بیسیوں چیزیں ہیں۔ آخر کسی نہ کسی کو دیں۔[13]

کچھ زیادہ اونچے اڑنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ جانتے (ہیں) کہ جو کچھ تصرف میں آیا ہے، عارضی طور پر آیا ہے۔ اس لیے اپنے خاص حلقہ نشینوں کو ممنون کر لیں۔ یہاں ایسی کئی مثالیں میرے سامنے آئیں اور دل کو افسوس ہوا۔ آخر کیوں انسان خواہ

مخواہ کی معلومات سے اپنے دل کو مکدر کرے۔ بہتر یہی ہے کہ سب کے لیے دعا کرو اور کان، آنکھ، لب بند کر کے بیٹھو۔

گر نہ بینی راہ حق بر من مخند

امید ہے آپ میری طرف سے ہر خط کے جواب کی توقع کیے بغیر وقتاً فوقتاً اپنے حالات آگاہ کرتے رہیں گے۔ مجھے شاید یقین دلانے کی ضرورت نہیں کہ میں اپنے ادعائے دوستی میں ہمیشہ مخلص رہا اور یقین رکھیں کہ جو حالات پیش آئے ان پر میرا دل واقعی مضطرب ہے لیکن:

بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

اگر راشدی وغیرہ کے ساتھ اب بھی تعلقات کی نوعیت بدلی نہ ہو تو مہربانی فرما کر میرا اسلام پہنچائیں۔ والسلام

نیازمند

مہر

﴿۵﴾

۲۸/۹/۷۰ باسمہ سبحانہ

بھائی۔ آپ کے حالات کا کوئی پہلو میری نگاہوں سے مخفی نہیں۔ یہ بھی عرض کرنا غیر ضروری ہے کہ میری طرف سے کسی بھی دائرے میں تلاش و تجسس کے لیے دریغ نہیں ہو سکتا۔ تاہم کوئی جگہ پیدا کرنا بالفعل خارج از بحث ہے۔ خصوصاً نئے آدمی کے لیے جس نے کل کام سنبھالا ہے خالی جگہ کے لیے کہنا سہل اور سعی آسان (نہیں) معدوم محض کو حیات میں لانے کی آرزو کا انجام واضح۔ اگر آپ کے نزدیک محض میری تگ و دو میں بھی کوئی امکان منفعت ہو تو خدا شاہد ہے اس وقت تک دوڑ سکتا ہوں جب تک آپ کے حالات دوڑانے کے متقاضی ہوں۔ لیکن خود آپ اسے شاید پسند نہ فرمائیں۔ سوچتا رہتا ہوں خدا کوئی صورت پیدا کر دے اور یہ اس پاک ذات کی رحمت سے ہرگز بعید نہیں۔ اپنے اس نیازمند سے وہ خدمت لیجیے، جو انجام دے سکوں۔ نیز اس سے آپ کے اطمینان قلب کا سامان میسر ہو۔ امید ہے آپ بخیر ہوں۔ ہم لوگ محبت کے بندے ہیں جہاں دل اٹک گیا۔ عہدوں اور اختیارات کا وجود و عدم ہمارے لیے بالکل ہیچ ہے۔ یہ محبت پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

مہر

﴿۶﴾

۲۲/۶/۷۱ باسمہ سبحانہ

برادر مکرم۔ واقعی اب تو میں بہت بیمار ہو گیا اور بعض اوقات تو خیال آتا تھا کہ بس اب ناقہ منزل پر پہنچ گئی۔ تین ساڑھے تین مہینے بعد امراض سے جانبری ہوئی۔ پھر ضعف نے گھیرے رکھا۔ اب بفضل اللہ اچھا ہوں اگرچہ تا حال صحت پہلے درجے پر نہیں پہنچی۔ مگر شکر ہے کہ ابھی اس دنیا میں کچھ اور سانس لینے کی امید بندھی ہے۔ آپ کی پرسش کے لیے تہ دل سے

شکر گزار ہوں۔اللہ جزا دے۔امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ　　نیازمند

مہر

حواشی وتعلقات

۱۔ جناب بشیر احمد ڈار صاحب نے اپنی انگریزی تصنیف A Study in Iqbal's Philosophy کا مسودہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کو بھیجا تھا۔یہ کتاب انھوں نے ۱۹۷۱ء میں شائع کی تھی۔

۲۔ اس زمانے میں ڈار صاحب اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے۔آپ چند انتظامی دشواریوں سے دوچار تھے اور گردوپیش کے چند افراد سے نالاں تھے۔ڈار صاحب نے مولانا مہر کو لکھا تھا کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر شیخ محمد اکرام سے کہیں کہ وہ اپنا اثر شیخ منظور الٰہی صاحب وزارت تعلیمات کے سیکرٹری پر استعمال کر کے انھیں مخمصے سے نجات دلائیں۔اقبال اکیڈمی مرکزی وزارت تعلیمات کے تحت تھی۔

۳۔ پیر حسام الدین راشدی اردو اور سندھی ادب کے مشہور محقق اور ادیب ہیں۔یہ سندھی ادبی بورڈ سے منسلک تھے۔

۴۔ مولانا مہر نے ''تاریخ سندھ'' کلہوڑوی کے عہد میں مرتب کی تھی۔اس کا مسودہ سندھی ادبی بورڈ کو اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔اشاعت میں دیر ہوئی تو مولانا نے مسودے کی واپسی پر زور دیا تھا۔بعد میں یہ کتاب بورڈ نے ہی شائع کی۔

۵۔ مراد یہ تھی کہ شیخ محمد اکرام سے گفتگو کے بعد معاملات کی درستی کے لیے کوشش کرنی تھی۔

۶۔ ڈار صاحب نے ''زبور عجم'' کے دو حصوں ''گلشن راز جدید'' اور ''بندگی نامہ'' کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔یہ ترجمہ Institute of Islamic Reserch نے جون ۱۹۶۴ء میں شائع کیا تھا۔ڈار صاحب نے مولانا کو یہ کتاب ملاحظہ کے لیے بھیجی تھی۔

۷۔ اس دوران میں ڈار صاحب نے ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔آپ کی خواہش تھی کہ اس ترجمے کو شیخ غلام علی اینڈ سنز شائع کرے۔مولانا مہر نے مشورہ دیا تھا کہ پہلے A Study in Iqbal's Philosophy چھپ جانے دیں۔پھر دوسری تصنیف کی اشاعت کا انتظار کریں۔عجلت سے معاملات کے سنورنے کا امکان نہ تھا۔

۸۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی کے بھائی تھے۔آپ علامہ اقبال کے ساتھیوں میں سے ہیں۔آپ کی اسلامی فن تعمیر پر بہت گہری نظر تھی۔بالخصوص تاج محل سے متعلق آپ کا تحقیقی مقالہ سند کا درجہ رکھتا ہے۔

۹۔ اشارہ ہے شیخ محمد اکرام کی جانب۔ڈار صاحب اقبال اکیڈمی سے مستعفی ہو چکے تھے۔آپ اپنے ساتھیوں اور نوکر شاہی کی ریشہ دوانیوں سے بہت پریشان تھے۔

۱۰۔ سید عبدالواحد صاحب اس زمانے میں اقبال اکیڈمی کے نائب صدر رہے تھے۔

۱۱۔ مولانا مہر نے گوشہ نشینی میں رہ کر جو علمی اور ادبی کارنامے انجام دیے تھے بیشتر سرکاری اداروں کی کارکردگی مہر صاحب کے کام کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔

۱۲۔ اس واقعہ کا تذکرہ مولانا نے راقم الحروف سے بھی کیا تھا۔

۱۳۔ ڈار صاحب اقبال اکیڈمی سے مستعفی ہونے کے بعد کچھ عرصے تک پیروزگار رہے تھے۔آپ وقتاً فوقتاً مولانا مہر کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔اس وقت علمی اداروں میں مزید گنجائش نہ تھی۔

پاکستانی اردو شاعری پر پنجابی زبان کے اثرات

ڈاکٹر ضیاء الحسن

اردو زبان کے آغاز وارتقا اور مولد و مسکن کے حوالے سے مختلف محققین نے مختلف نظریات پیش کیے۔ ان تمام نظریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کی تعمیر و تشکیل ہندوستان کے مختلف خطوں میں ہوتی رہی اور اس کے خزانے میں فارسی ہندی اور عربی زبانوں کے علاوہ متعدد مقامی زبانوں نے اپنا اپنا حصہ جمع کیا۔ اس ضمن میں پشتو اور اردو کے محقق و ادیب حنیف خلیل لکھتے ہیں:

"اردو کی ماخذ زبانوں پر کافی تحقیق ہو چکی ہے۔ مختلف محققین و ماہرین لسانیات نے اپنی اپنی زبانوں سے اردو کو جوڑنے کی کوششیں کی ہیں اور اردو زبان پر اپنی زبانوں کے اثرات کو واضح کیا ہے۔ بعض محققین نے براہِ راست اردو پر مختلف زبانوں کے اثرات کی نشاندہی کی ہے اور بعض نے مختلف علاقوں اور خطوں کو اردو کی جنم بھومی قرار دیا ہے جس سے ان کا مقصد اس علاقے یا خطے کی زبان کے اثرات ہیں۔ اس ضمن میں اردو پر فارسی و عربی کے علاوہ کئی اور زبانوں کی اثر اندازی کی کوششیں ہوئی ہیں جن میں سندھی، پنجابی، ہندی، بلوچی، براہوی ترکی، پالی، راجستھانی، برج بھاشا وغیرہ نمایاں ہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے پنجاب، دکن، دہلی، سندھ، بلوچستان، بہار وغیرہ کے علاقے اس زبان کے مولد قرار دیے گئے۔ اس موضوع پر بیسیوں کتب لکھی جا چکی ہیں مگر مشکل سے دو چار ہی کتب میں محض چند اشارے ایسے ملیں گے جن میں پشتون قوم، ان کے خطہ اور زبان کا اس حوالے سے ذکر کیا گیا ہو"۔[1]

ان مقامی زبانوں میں پنجابی زبان کے کردار کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ ابتدائی خطۂ پنجاب اردو زبان و ادب کے سلسلے میں بھرپور کردار ادا نہیں کر سکا لیکن جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ جن زمانوں میں اردو زبان و ادب ہندوستان کے کچھ دیگر خطوں میں پھل پھول رہے تھے، پنجاب میں بھی اردو کے حوالے سے قابلِ قدر کام ہوا۔ حافظ محمود شیرانی، عین الحق فرید کوٹی اور کچھ دیگر محققین نے اردو کے ابتدائی ذخیرے میں پنجابی زبان کی لفظیات و محاورات کی نشان دہی کی ہے۔ دکنی، دہلوی اور لکھنوی ادب میں متعدد ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو پنجابی زبان سے لیے گئے ہیں لیکن پنجابی زبان و ثقافت کے اردو پر اثرات اس وقت زیادہ نمایاں ہونا شروع ہوئے جب لاہور کو اردو زبان کا مرکز بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اگرچہ اس کی ابتدا انجمن مطالب مفیدہ پنجاب کے زمانے سے ہو گئی تھی لیکن یہ اثرات قیامِ پاکستان کے بعد زیادہ واضح ہوئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد کراچی اور لاہور اردو زبان و ادب کا مرکز قرار پائے۔ کراچی میں تخلیق ہونے والے ادب میں

دہلوی ولکھنوی مزاج ومحاورے پر اصرار کیا گیا جس کی وجہ سے کراچی کے ادب میں مقامی ثقافت اور زبان کے اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں۔لاہور میں تخلیق ہونے والے ادب میں ہیئتی ،اسلوبیاتی ،موضوعاتی اور لسانی سطوح پر نو بہ نو تنوعات نظر آتے ہیں۔ ان تنوعات میں ایک طرف عالمی ادب اور دوسری طرف مقامی ثقافت اور زبان دونوں کے اثرات کارفرما ملتے ہیں۔لاہور میں پنجاب کے تمام علاقوں سے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد آ کر آباد ہوئی جس کی وجہ سے لاہور کی ثقافت میں پنجاب کے تمام رنگ جمع ہیں۔لاہور کے علاوہ پنجاب کے دیگر علاقوں میں تخلیق ہونے والے ادب نے بھی اردو کی نئی تہذیب کی تشکیل میں گراں قدر خدمات پیش کیں۔پاکستانی اردو زبان کی تشکیل میں ساٹھ کی دہائی میں آغاز ہونے والی بعض تحریکوں نے بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ اگر چہ ان تحریکوں کا بنیادی مقصد پنجاب کی زبان وثقافت کو اردو زبان میں شامل کرنا نہیں تھا لیکن ان کا ایک فائدہ بہر حال یہ ضرور ہوا کہ اردو ادیب اس طرف متوجہ ہوئے۔اس ضمن میں قدرے مختلف بات عطش درانی نے بھی کی ہے۔لکھتے ہیں:

''تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو پاکستانی اردو کا واضح نکھار ۱۹۶۵ء کے بعد سامنے آتا ہے۔اس سال پاک بھارت جنگ نے پاکستانی اردو کی انفرادیت کو بہت حد تک آگے بڑھانے اور کلاسیکی اردو کا رخ موڑنے کے لیے کسی طاقت ور بم کا سا کردار ادا کیا بلکہ ۱۹۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد تو اس اردو نے بھی نئی سمتوں کا واضح تعین کر لیا ہے جن میں معنویاتی ''انحراف'' زیادہ واضح ہے۔اردو شعر وادب میں ایسی ہزاروں مثالیں ملتی ہیں جن سے پاکستانی اردو کے اس اصول ''معیار سے انحراف'' کا ثبوت فراہم ہوتا ہے''۔[۲]

حقیقت یہ ہے کہ ساٹھ کی دہائی سے اردو پر پاکستان کی مقامی زبانوں اور ثقافتوں کے اثرات واضح طور پر نظر آنا شروع ہوئے۔عطش درانی صاحب نے ان کو لسانی وثقافتی تناظر میں دیکھنے کے بجائے سیاسی وہنگامی تناظر میں دیکھا اور ۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگوں کو اس کا سبب بتایا جو یقیناً لسانی حوالے سے درست نہیں۔زبانیں اور ثقافتیں کسی ایک واقعے سے نہیں بدلتیں بلکہ یہ ایک سست روعمل ہے جو آہستہ آہستہ اپنے نتائج تک پہنچتا ہے۔زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان جنگوں نے اہل پاکستان میں یگانگت ومحبت کے احساسات مضبوط کیے جس کا اثر اردو زبان پر بھی کسی حد تک پڑا۔

اگر چہ لسانی تشکیلات کی تحریک کو مطلوبہ پذیرائی ملی نہ مطلوبہ نتائج لیکن اس کے باوجود اردو زبان وادب پر اس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔اس تحریک کا مرکز لاہور اور نظریہ ساز افتخار جالب تھے۔ان کا خیال تھا کہ موجودہ تہذیبی صورت حال سے ظہور کرنے والے تخلیقی تجربے کو موجودہ زبان بیان کرنے سے معذور ہے بلکہ بعض اوقات وہ تخلیقی تجربے کے اظہار کی راہ میں مزاحم ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کے بہت سے قیمتی عناصر ضائع ہو جاتے ہیں۔افتخار جالب آرڈی لینگ اور ڈی جی کوپر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مابعد الطبیعیاتی زبان کو روزمرہ کی زبان کے مقابلے پر زیادہ خرافات پیدا کرنے والی زبان شمار نہیں کرنا چاہیے۔ خرافات اس وقت جنم لیتے ہیں جب زبان اور تجربے میں خلل کی خلیج پیدا ہو جائے۔تجربے کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ ہمیشہ زبان کے ذرائع کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے''۔[۳]

ان کے خیال میں متعین زبان میں یہ خرابی ہوتی ہے کہ وہ تجربے کا ساتھ دینے سے قاصر رہتی ہے،اس لیے زبان کو مسلسل نئی تشکیل دیتے رہنا چاہیے۔زبان سادہ، عام فہم یا مشکل نہیں ہوتی بلکہ تجربے کے مطابق ہوتی ہے۔برطانوی استعمار نے

استحصالی مقاصد کے تحت اردو زبان کو سادگی کی جس راہ پر ڈالا ہے اور فارسی ہندی، عربی اور مقامی زبانوں سے اس کا رشتہ جس طرح منقطع کیا ہے، اس نے اردو زبان کو تہی دامن کیا ہے۔ لازم ہے کہ اسے ہندی فارسی عربی کے ساتھ مقامی و بین الاقوامی زبانوں سے ہم رشتہ کیا جائے۔ انھوں نے نہ صرف نظری وتنقیدی کام کیا بلکہ ایک نئی تخلیقی زبان بھی وضع کی۔ یہ زبان وضع کرتے ہوئے تخلیقی تجربے کا آزادانہ اظہار ان کے پیشِ نظر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ تخلیقی تجربے کے دوران میں تخلیق کار کو جو لفظ سوجھتا ہے، وہ اس تجربے کے بیان کے لیے بہترین ہوتا ہے۔ تخلیق کار کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے موضوع اور تجربے کی مناسبت سے کسی بھی زبان کے کسی بھی لفظ کو منتخب کرے یا نئے لفظ و تراکیب وضع کرے۔ وہ اردو زبان کے بعض ایسے ضابطوں کو بھی توڑنے کا مشورہ دیتے ہیں جو ان کے خیال میں اردو زبان پر مصنوعی طور پر اس لیے نافذ کیے گئے کہ اردو زبان محدود ہو کر فنکشنل زبان بن کر رہ جائے اور اپنی تخلیقی قوت سے بھی محروم ہو جائے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں نہ صرف مقامی زبانوں سے الفاظ منتخب کیے بلکہ انگریزی اور کچھ دیگر بین الاقوامی زبانوں سے بھی استفادہ کیا۔ اس مخلوط لفظیات سے انھوں نے نظموں کے لیے ایک بالکل نئی فضا تعمیر کی جو غرابت کی وجہ سے قبول تو نہیں کی گئی لیکن اس نے اردو میں مقامی زبانوں کے داخلے کو ممکن بنا دیا۔ اردو میں پنجابی زبان کی لفظیات کا بھرپور اور مربوط شعوری استعمال افتخار جالب کی نظموں میں بہت قوت کے ساتھ ہوا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے۔

شدید تھور یکس درد، ہر جزو متصل، ٹوٹنے کے لگ بھگ ہتراث اختی ہے۔ (نفس لامرکزیت اظہار) [4]

تن ڈرم سے، جاناں، تمھیں پیچانا، بے معنی جنوں سے رلتے ملتے
الیش ٹرے ہوگی؟...... نچڑے بھی رکھ دو
پہلے پڑھا تھا: ہم زاد کی اُچکل پر
کیا بات ہے لیونا لساٹے کی [5]   (ہم زاد کے فوکس میں)

کچرے کے ڈھیر پر، ہتھ دروں کی بات ہے بچگے! احشر دیہاڑ
میں بولے، میں بولے، اور کیا بولے گا
اوے گینڈے اتری لگا تا؟ ...... باج آ، اوئے! اجی چھڈ و بھی، شالا شاد رہو [6]   (کچرے کے ڈھیر پر)

افتخار جالب کے اثرات ان کے عہد کے بہت سے تخلیق کاروں پر مرتب ہوئے جنھوں نے ایسی ہی زبان میں افسانے، نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ افسانے میں انور سجاد اور سمیع آہوجا، نظم میں عباس اطہر، انیس ناگی، عبدالرشید، سعادت سعید، اظہر غوری اور غزل میں ظفر اقبال جیسے شاعر نے ان سے اثرات قبول کیے۔

ظفر اقبال نے نئی لسانی تشکیل کا تجربہ ابتداً افتخار جالب کے زیرِ اثر کیا۔ اس کی دو ایک جھلکیاں آبِ رواں میں بھی مل جاتی ہیں لیکن فی الاصل یہ گلافتاب کا تجربہ تھا۔ اگرچہ انھوں نے اپنے کلیات کو ترتیب دیتے ہوئے جس قدر ممکن تھا، اس لسانی تشکیل میں سے اصل تخلیقی تجربے کو برآمد کر لیا ہے لیکن اب بھی اس میں متعدد غزلیں اور اشعار اسی تجرباتی رنگ میں ہیں۔ ان اشعار میں انھوں نے پنجابی لفظیات کو کئی طرح سے استعمال کیا ہے۔ کہیں خالص پنجابی الفاظ ہیں، کہیں اردو الفاظ کو پنجابی تلفظ میں استعمال کیا اور کہیں پنجابی کی لسانی ساختوں کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ گلافتاب میں انھوں نے لکھا تھا:

''اصلاً یہ پنجابی، انگریزی، بنگلہ وغیرہ اور اردو کا درمیانی فاصلہ کم کرنے کی ایک ابتدائی کوشش ہے۔ پنجابی پیوند میں نے خاص طور پر جابجا لگائے ہیں۔ یہ تازہ خون اردو زبان کی موجودہ تھکن اور پژمردگی دور کرنے کے لیے ضروری تھا''۔[7]

سِل سنگ ثبات سنساہٹ
آہنگ اُسار ٹوٹتے ہیں

تلک تنبیہہ ریگ تختی
تحریر ترنگ موبہ مو ہے

راکھ سراب سیہ جنگلاں میں پیاسا نام نشاں کا
پھرتا تھا اک واء ورولا کچی پکی تھاں کا

میں اس کیفیت تو نہیں جانتا
مجھے تیسری بار آیا صبر[8]

ظفر اقبال نے گلافتاب کے لسانی تجربے کو مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ آگے ہی آگے اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھا، وہ جان گئے کہ اس لسانی تشکیل کو فی الحال اردو میں سندِ قبولیت نہیں مل سکتی لیکن انھوں نے اپنے اس تجربے کو دیگر لسانی تجربوں کی اساس ضرور بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعد کی شاعری میں پنجابی لفظیات معاشرتی صورتِ احوال کے بیان اور موضوع کی مناسبت سے استعمال ہوئی ہے۔ انھوں نے اسے بے محابا استعمال کرنے کے بجائے حسبِ ضرورت غزل کے متفرق اشعار میں استعمال کیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے ''طبع رواں، ہنر معنی اور بے شمار امکان'' میں لکھا:

''ظفر اقبال جب بے تکلفی یا ملنگ پن یا لفنگے پن یا بذلہ گوئی اور رجز جوئی کا اظہار کرتے ہیں تو اس کے پیچھے بڑا گہرا، ریاض اور اردو غزل کی روایت کا بڑا گہرا عرفان ہوتا ہے۔ آہنگ کی بے ساختہ بوقلمونی، حدودِ فن پر کامل دسترس، دوسری زبانوں خاص طور پر پنجابی کے شعری آہنگ کا پورا پورا رچاؤ، زبانِ اردو کے تخلیقی امکانات کو بروئے کار لانے کی بھرپور صلاحیت، یہ سب چیزیں موجود ہوتی ہیں''۔[9]

دیکھے تجھے کوئی بات کرتے
مندری ترے ہونٹ، لفظ تھیوا
دیتے ہیں ادھار اس دکاں پر
لیکن ذرا تولتے ہیں کتنا

جان چھیڑواؤ اس غزل سے بھی
لکھو مقطع، تلفر، نکالو بھڑاس

اردو میں انٹی غزل کا تجربہ بھلے ساٹھ کی دہائی میں ہوا۔ یہ تجربہ لسانی کم اور اسلوبیاتی زیادہ تھا۔ یہ موجودہ زندگی کی افراط و تفریط اور انتشار کو طنز آمیز مضحک اسلوب میں بیان کرنے کی سعی تھی۔ لسانی حوالے سے بعض شاعروں نے کہیں کہیں انگریزی، پنجابی یا اردو کے غریب لفظوں سے کام لے کر انٹی غزل کی فضا تشکیل دی۔ اگرچہ اس کا مقصود پنجابی الفاظ کو برتنا نہیں تھا لیکن اس کی ایک صورت بہرحال یہ بھی تھی۔

اردو تھی اور دلی کے روڑے کبھی، مگر
لاہور کی بھی اس میں ہے اب اِٹ لگی ہوئی
(کوئے ملامت، انجم رومانی)

تقریباً اسی زمانے میں اشفاق احمد نے بھی اردو زبان کے نئے لسانی پیکر کی بات کی۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستانی اردو پاکستان کے تمام صوبوں کی ثقافتوں اور قومی زبانوں کا مظہر ہونی چاہیے۔ انھوں نے اس کے لیے کئی پمفلٹ اور مضامین لکھے اور اپنی تحریروں اور گفتگوؤں میں ایسی زبان استعمال کی۔ اس زمانے میں دیہاتی زندگی کو پیش کرنے والے تمام افسانہ نگاروں کی تحریروں میں پنجابی زبان کے الفاظ تواتر سے استعمال ہوئے☆۔ شاعری میں سب سے نمایاں نام شیر افضل جعفری کا ہے جنھوں نے ایک طرف تو پنجابی ثقافت اور دوسری طرف پنجاب کی صوفیانہ شاعری کے تسلسل میں نہایت ہنرمندی سے پنجابی لفظیات کا استعمال کیا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پنجابی الفاظ کو نہ تو کسی تحریک کے زیر اثر، نہ فیشن پرستی میں اور نہ محض نئے پن کے شوق میں استعمال کیا بلکہ اس کے لیے وہ شعری فضا مہیا کی جو اس لفظیات کی متقاضی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں استعمال ہونے والے پنجابی الفاظ غرابت کا احساس پیدا نہیں کرتے۔ مجید امجد نے ان کی شاعری پر اپنے مضمون ''باغی پیغمبر کا جلال'' میں بہت پتے کی بات کی ہے:

''یہاں ضمناً یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ جھنگ کی بولی جسے گریرسن لہندا کے نام سے یاد کرتا ہے، اسی مٹی کی دین ہے، اسی دھرتی کی نمود ہے، اسی کے سینے پر کبھی پرانی تہذیب آنکھیں ملتی بیدار ہوئی تھی۔ اس تہذیب کے ڈانڈے اس تہذیب سے ملے ہوئے تھے جو ہڑپہ کے کتبوں کی صورت محفوظ ہے اور جو آج تک پڑھی نہیں گئی۔ باوجود کاوشوں کے ابھی تک اردو کے آغاز کا مسئلہ پورے طور پر طے نہیں ہو سکا لیکن اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اردو کے ارتقا میں جہاں اور بولیوں اور پراکرتوں نے حصہ لیا ہے، وہاں اس پنجابی بولی نے بھی جو جھنگ، سرگودھا، فتحگری کے اضلاع میں بولی جاتی ہے اور جس کو گریرسن نے مشرقی ہندی سے جداگانہ تصور کیا ہے، کسی نہ کسی حد تک اردو کے مزاج و منہاج کی نشاندہی کی ہے اور اگر راوی اور چناب کے علاقوں کے وہ لفظ جنھیں وہاں کے لاکھوں انسان اپنی روزمرہ کی بول چال میں استعمال کرتے ہیں، شیر افضل جعفری کے شعروں میں آ گئے ہیں، تو انھیں غیر مانوس نہیں کہا جا سکتا، ایک تو ان بولیوں کا تاریخی رشتہ مسلّم ہے، دوسری طرف ان الفاظ کا اس روایت کے ساتھ گہرا

☆ بیدی اور ربلونت سنگھ کے افسانوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ (مدیر)

تعلق ہے جواشعار میں مضمراور منعکس ہے"۔[11]

جوانی چیت میں کرلا رہی ہے
محبت کونج مٹتی جا رہی ہے

......

یہ جل ترنگ، یہ بیلے، یہ ٹل ٹل چھناں
گھٹا نے جھوم کے لہرا دیا ہے بالوں کو

......

ترا کے لہندے کے لہجے کے لال لال گلاب
کیا ہے سانولی اردو کو سرخ رو میں نے[12]

شیر افضل جعفری کے کئی ہم عصروں کے ہاں بھی پنجابی الفاظ کا استعمال نظر آتا ہے لیکن اس حوالے سے زیادہ قابل قدر کام ان کے ایک نسبتاً جونیئر شاعر علی اکبر عباس نے کیا۔ان کے پہلے مجموعے برآ ب نیل میں چند غزلیں پنجاب کی ثقافتی زندگی کے اظہار پر مشتمل ہیں ۔ان غزلوں کی نمایاں خصوصیت پنجابی الفاظ کا استعمال نہیں ہے بلکہ وہ فضا ہے جو لسانی حوالے سے اردو اور موضوعاتی حوالے سے پنجابی ہے۔بعد میں علی اکبر عباس نے اس کام کو مربوط انداز میں مکمل کیا اور رچنا کے نام سے اسے شائع کیا۔رچنا میں پنجاب کی دیہی زندگی مکمل ثقافتی تفصیلات کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

مائیوں بیٹھی دلہن سرسوں، سہرے وار کماد
جھمکے پہن کپاسیں ناچیں، دلہن کی عم زاد

......

یہ رہٹ سدا چلتے ہی رہیں، یہ لوگ سدا جیتے ہی رہیں
اس بھاگاں والی دھرتی کو، یہ دی ہے دعا پیراں ولیاں

......

چیتر کے مٹے موسم میں یہ گرمی سردی کی چوہلیں
اور جاتے جاڑے کے تحفے ہیں یہ سیو خستہ ہوئیں[13]

علی اکبر عباس کا تعلق شاعروں کی جس نسل سے ہے، وہ داستانوی لفظیات کے تخلیقی استعمال سے معروف ہوئی لیکن ان کے بیشتر ہم عصروں نے کم یا زیادہ پنجابی لفظیات کو ضرور استعمال کیا۔صابر ظفر کا تازہ مجموعہ کلام 'سانول موڑ مہاراں' اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے قاری کو متوجہ کرتا ہے۔اس مجموعے کی بنیادی خصوصیت پنجاب کی ثقافت اور صوفیانہ فضا ہے۔صابر ظفر کے گزشتہ مجموعوں میں پنجابی الفاظ مل جاتے ہیں لیکن اس مجموعے کی تو پوری فضا میں پنجاب کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔انھوں نے پنجاب رنگ کو اردو کی تہذیب کا حصہ بنایا ہے۔

ویران ہیں اب تمام لاکھے
دریا کبھی منچلا تو ہوگا
بولوں گا کہ جانی رات رہ پو
مانے گا تو رت جگا تو ہوگا

......

جب تانگھ تجن کی ختم ہووے
تب اس کو وصال جانتا ہوں

......

دوام ہے جسے حاصل وہ رنگ تھل کا ہے
کہ یہ تو سارا علاقہ مرے *تھل کا ہے[۱۲]

پاکستان کے موجودہ ادبی منظرنامے پر جو نسل موجود ہے، اس نے اس کام کو اور بھی تخلیقی انداز میں کیا ہے۔ پنجابی لفظیات الگ سے کوئی خوبی نہیں جو اس نسل کے شاعروں نے اختیار کی ہو بلکہ ان کے پیش رووں نے نصف صدی کی کاوشوں سے جو فضا بنائی، اس نسل نے اسے باغ و بہار کیا ہے۔ ہمارے شاعروں نے روایتی اسالیب کو چھوڑ کر اپنے عہد اور خطے کے رنگوں سے اردو شاعری کی نئی زبان تخلیق کی ہے۔ انھوں نے مقامی زبانوں کے الفاظ کو بے محابا استعمال نہیں کیا بلکہ پنجابی زبان و ثقافت سے ایسے الفاظ منتخب کیے ہیں جو اردو کے مزاج سے قریب ہیں۔ یہ زبان لسانی تشکیلات والوں سے مختلف اور زیادہ تخلیقی ہے۔ یہ وہ اردو زبان ہے جو مزاج اور محاورے میں دکن، دہلی اور لکھنو سے بھی مختلف ہے۔ اس بات کی دلیل میں نئے شاعروں کی شاعری سے اختصاراً چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

واہگہ میں بکھرے کا منظر
ایک عرب اور اک افغان
باپ بھی دونوں کا سانجھا ہے
دونوں کا راکھا بھگوان

(صلاح الدین ایوبی)

عمروں کا پینڈا کاٹے ہیں
اور گنبد خضرا نظر آتا ہے

(قیوم طاہر)

اتر اتر کر آنگن میں بول رہا ہے کوا آج
دیا جلاؤں مسجد میں، ویر ملا دے ربا آج

(حمیدہ شاہین)

حیاتی قرض ہے سعدی خدا کا
اسے اک دن ادا کرنا پڑے گا
(سعید اقبال سعدی)

کسی کے ہجر کا چھلا کسی وصال کی چھاپ
بچھڑ کے مجھ سے تجھے کیا ملا، دکھا تو سہی
(جاوید انور)

بس اک وصال نے اب تک سنبھال رکھا ہے
نہیں تو ہجر کا دکھ لیر لیر کرتا مجھے
(اشرف سلیم)

سجدہ گاہوں میں چاروں طرف
شو کتے سانپ لہرا رہے ہیں
(انوار فطرت)

اور بھی میرے جیسے ہزاروں بدن
خاک کا چولا پہنے
فقط اپنی آنکھوں کے ٹل چل رہے ہیں
(اعجاز رضوی)

ایک بگولہ
گھمن گھیری کھاتا
بھیتر کے تھل میں ریگ اڑاتا ہے
(داؤد رضوان)

دل کے بیلے میں نہ آئے کوئی
یاں کبھی چاند اتر آتا ہے
(اختر شمار)

درج بالا سطور میں چند اہم اردو شاعروں کی چیدہ چیدہ مثالیں پیش کی گئی ہیں ورنہ موجودہ اردو شعر وادب میں پنجابی لفظیات کا استعمال کوئی نیا تجربہ نہیں رہا۔اب پنجاب میں بیٹھ کر شعر کہنے والے تقریباً ہر شاعر کے ہاں کم یا زیادہ پنجابی الفاظ مل

جاتے ہیں۔کہیں ان کا استعمال سلیقے سے ہوا ہے اور کہیں یہ اوپر سے اوپر سے محسوس ہوتے ہیں۔کہیں یہ محض لفظ کی سطح پر رہتے ہیں اور کہیں استعارے کی سطح کو چھو لیتے ہیں۔ان الفاظ کے علاوہ ان شاعروں کے لب و لہجے پر بھی پنجاب کے مخصوص مزاج کی چھاپ صاف محسوس ہوتی ہے۔کہیں کہیں اردو محاورے اور روزمرہ پر بھی پنجابی زبان کے اثرات نظر آتے ہیں۔عین ممکن ہے کہ لکھنو اور دہلی کو معیار ماننے والے قارئین اور نقادوں کے لیے یہ بات قابل قبول نہ ہو لیکن یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ پاکستانی اردو پر اب لامحالہ مختلف صوبوں کی مقامی زبانوں اور ثقافتوں کے اثرات ضرور مرتب ہوں گے۔یہ ایک فطری عمل ہے جسے شعوری طور پر نہ تو اختیار کیا جا سکتا ہے اور نہ رد۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو ہی ان زبانوں کے اثرات قبول کرے گی یا یہ اثرات اردو کے مزاج کے مطابق آئیں گے۔اس سوال کا جواب اس مضمون میں پیش کردہ مثالوں میں ہی مضمر ہے۔ان مثالوں کا اگر بغور تجزیہ کیا جائے تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ کہیں پنجابی لفظ شعر کی فضا میں کھپ نہیں سکے۔یہ اس وقت ہوتا ہے جب ان الفاظ کو اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنائے بغیر استعمال کیا جائے۔جب نئی لفظیات شاعر کے تخلیقی تجربے کا حصہ بنتی ہے تو وہ فضا بھی تخلیقی ہوتی ہے جو اس لفظیات کو غرابت کے عیب سے پاک کرتی ہے۔اس کی دو صورتیں ہیں۔ایک یہ کہ دیگر الفاظ بھی نئے الفاظ کے مزاج کے مطابق منتخب کیے جائیں اور دوسرے یہ کہ نئے لفظ منتخب کرتے وقت شاعر اس زبان کے مزاج کو بھی مدنظر رکھے جس کے لیے ان الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے۔اس اصول کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم اس مضمون میں دی گئی مثالوں کو دیکھیں تو ہمیں دونوں صورتیں نظر آ جائیں گی۔پہلے ہم ان مثالوں کا جائزہ لیتے ہیں جن میں نئے لفظ غرابت کا احساس پیدا نہیں کرتے۔

میں اس کیفیت کو نہیں جانتا
مجھے تیسری بار آیا صبر
(ظفر اقبال)

جوانی چیت میں کرلا رہی ہے
محبت کونج بنتی جا رہی ہے
(شیر افضل جعفری)

یہ جل ترنگ، یہ بیلہ، یہ سیل سیل چٹھاں
گھٹا نے جھوم کے لہرا دیا ہے بالوں کو
(شیر افضل جعفری)

یہ رہٹ سدا چلتے ہی رہیں، یہ لوگ سدا ہنستے ہی رہیں
اس بھاگاں والی دھرتی کو، یہ دی ہے دعا پیراں ولیاں
(علی اکبر عباس)

سجدہ گاہوں میں چاروں طرف
شوکتے سانپ لہرا رہے ہیں
(انوارفطرت)

اتر اتر کر آنگن میں بول رہا ہے کوا آج
دیا جلاؤں مسجد میں ویر ملا دے ربا آج
(حمیدہ شاہین)

کسی کے ہجر کا چھلا، کسی وصال کی چھاپ
بچھڑ کے مجھ سے تجھے کیا ملا، بتا تو سہی
(جاوید انور)

درج بالا مثالوں میں کہیں محسوس نہیں ہوتا کہ نئی لفظیات شامل کی گئی ہے۔صبر کو اس تلفظ میں اردو ئے معلی کے محافظ بہادر شاہ ظفر نے بھی اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔اسی طرح بیلہ، کرلانا، چناں، چیت، شوکنا، چھلا، چھاپ اپنے مزاج میں ہندی الاصل ہیں یا ہندی کے صوتی آہنگ کے قریب ہیں، اس لیے بھی اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔حمیدہ شاہین کے شعر میں ویر اور ربا کے الفاظ بھی نہ صرف یہی کیفیت لیے ہوئے ہیں بلکہ پنجاب کی ثقافتی زندگی کا مظہر بھی ہیں لیکن فطری انداز میں استعمال ہوئے ہیں۔علی اکبر عباس نے بھاگاں، بیراں اور ولیاں کو پنجابی قاعدے کے مطابق جمع کے صیغے میں تبدیل کیا ہے۔یہ الفاظ بھی خالص پنجابی فضا کا حامل ہوتے ہوئے اردو میں مستعمل ہوئے ہیں، صرف جمع کا قاعدہ بدلا گیا ہے۔لیکن ہر جگہ ایسا نہیں ہے۔لسانی تشکیلات والوں نے تو اس قاعدے کا ذرا بھی خیال نہیں رکھا، بس پنجابی الفاظ کو اپنی نظموں غزلوں میں شامل کر لیا ہے، اس لیے ان کے ہاں استعمال ہونے والے بیشتر شعر غرابت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔اینٹی غزل والوں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ انھوں نے فضا ہی اینٹی غزل کی بنائی ہے۔بعد کے شاعروں کی شاعری سے چند مثالیں دیکھیے:

تو آ گیا ہے تو آ رانجھڑے! چراغ جلا
لہو اچھال کے، ہڈ بال کے، چراغ جلا
(صابر ظفر)

جانے وہ لگے گا کس کنارے
روہی میں جو بیڑا ٹھل رہا ہے
(صابر ظفر)

ایلوں کے پھول منڈیروں پر، صحنوں میں بھوری بچ کلیاں
اور چاند مکئی کی روٹی پر تاروں سی مکھن کی ڈلیاں
(علی اکبر عباس)

ایک بگولہ
گھمن گھیری کھاتا
بھیتر کے تھل میں ریگ اڑاتا ہے

(داؤد رضوان)

ان مثالوں میں ہڈ بال، گھلنا، ایلوں کے پھول، بچ کلیاں اور گھمن گھیری جیسے الفاظ نہ تو استعارہ بنے ہیں اور نہ ہی پوری طرح شاعری کی فضا میں کھپ سکے ہیں۔ مستقبل کے شاعروں کو نئے الفاظ شامل کرتے ہوئے ان امور کی طرف توجہ مرکوز رکھنی پڑے گی۔ نئے الفاظ و استعارات کی زبان میں شمولیت ہمیشہ اسے ثروت مند کرتی ہے لیکن یہ کام پھوہڑپن سے نہیں ہونا چاہیے بلکہ تمام تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کرنا چاہیے، خاص طور پر شاعری میں یہ کام بے حد نزاکت کا حامل ہے۔

موجودہ دور میں پنجابی لفظیات کی شمولیت کا کام افسانوی نثر میں بہت خوبصورتی سے ہوا ہے۔ موجودہ فکشن لکھنے والوں میں یہ کام محمد حمید شاہد، امجد طفیل، زاہد حسن، محمد عاصم بٹ، اشفاق رشید اور عامر رانا نے بہت ہنرمندی سے کیا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے دیگر صوبوں کی ثقافت اور زبان کے اثرات وہاں تخلیق ہونے والے اردو شعر و ادب میں نمایاں ہے۔ اس تمام صورت حال کو پیش نظر رکھ کر یہ بات نہایت وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ نئی پاکستانی اردو زبان معرض وجود میں آ چکی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اردو کی تشکیل میں پشتونوں کا کردار، حنیف خلیل، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۸۱۔
۲۔ پاکستانی اردو کے خد و خال، مرتبہ: عطش درانی، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۹۔
۳۔ لسانی تشکیلات اور قدیم تجزیہ، افتخار جالب، فرہنگ میر پور خاص، ۲۰۰۱ء، ص:
۴۔ ایضاً، ص: ۱۸۵
۵۔ یہی ہے میرا لحن، افتخار جالب، فرہنگ میر پور خاص، ۲۰۰۱ء، ص: ۱۹
۶۔ ایضاً، ص: ۲۰
۷۔ اب تک (کلیات) ظفر اقبال، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۲۸۵
۸۔ ایضاً، ص: ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۲، ۲۶۰
۹۔ ایضاً، ص: ۳
۱۰۔ ایضاً، ص: ۳۱۷، ۳۲۰، ۳۲۳
۱۱۔ باغی پیغمبر کا جلال، مجید امجد، مشمولہ سہ ماہی شیبہ سرگودھا شیر افضل جعفری نمبر، شمارہ ۳۴، ۳۵، ۳۶، اپریل تا دسمبر ۲۰۰۰ء، ص: ۳۶
۱۲۔ سانولے من بھانولے، شیر افضل جعفری، انجمن لاہور، اپریل ۱۹۶۵ء، ص: ۲۸، ۷۱، ۹۳
۱۳۔ بر آب نیل، علی اکبر عباس، مکتبہ فکر لاہور، ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۸ء، ص: ۱۰۱، ۱۰۸، ۱۱۱
۱۴۔ سانول موڑ مہاراں، صابر ظفر، سٹی بک پوائنٹ کراچی، جون ۲۰۰۶ء، ص: ۲۸، ۴۸، ۹۶، ۲۹

مابعد جدیدیت کی اہم اصطلاحات (وضاحتی فرہنگ)

ناصر عباس نیر

اے پوریا Aporia

اے پوریا کی اصطلاح یونانی الاصل ہے۔ جس کا لفظی مطلب ''تعطل، معما'' ہے۔ یونانیوں نے اسے فلسفے اور خطابت میں برتا، بعد ازاں پال دی مان نے ژاک دریدا کے فلسفیانہ طریق کار کی وضاحت کے لیے موزوں سمجھا اور اسے ڈی کنسٹرکشن کی تھیوری میں مرکزی اہمیت تفویض کی۔

افلاطون نے اپنے مکالمات میں اے پوریا کو فلسفیانہ تحقیق کے ایک حربے کے طور پر اختیار کیا ہے۔ مکالمات میں سقراط اپنے مخاطب سے کسی تصور کی تعریف کرنے کے لیے کہتا ہے اور پھر تعریف کے جواب میں اس سے سوالات کر کے، اس کی تعریف کو ناقص ثابت کر کے اسے ''تعطل اور معمے'' کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ کیفیت اے پوریا ہے جس میں تذبذب، عدم تعین اور بے یقینی کے عناصر ہیں۔ تاہم اے پوریا مخاطب کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے موقف پر نظر ثانی کرے اور مزید تحقیق و جستجو سے کام لے۔ خطابت میں اے پوریا اسی سے ملتی جلتی حالت ہے۔ جب مقرر اپنے سامعین کے سامنے اپنی تشکیک (جو زیادہ تر فرضی ہوتی ہے) کا اظہار کر کے اپنی گفتگو کو آگے بڑھانے کا ایک ایسا طریقہ دریافت کرتا ہے جس سے گفتگو میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔

ڈی کنسٹرکشن کی تھیوری میں اے پوریا کے ان دونوں مفاہیم کو ملا دیا گیا ہے۔ اور اس سے مراد کسی متن کی وہ حالت لی گئی ہے جس میں گرفتار ہو کر متن تعطل، عدم تعین اور ایک قسم کی کش مکش کی زد پر آ جاتا ہے۔ یہ کش مکش دراصل متن کی منطق اور خطابت میں ہوتی ہے۔ متن کی منطق کچھ کہتی ہے مگر خطابت کچھ اور ظاہر کرتی ہے۔ سادہ ترین لفظوں میں کسی متن کے اسلوب اور مواد میں ہم آہنگی نہیں، دوئی ہوتی ہے، یا سگنی فائر اور سگنی فائیڈ میں یک جائی نہیں، ثنویت ہوتی ہے، یا لفظ اور معنی میں اتحاد نہیں، جدائی ہوتی ہے۔ اے پوریا کسی مطالعاتی حربے سے پیدا نہیں ہوتا، یہ متن کا وقوع (Occurance) ہے یا متن کی اپنی صورت حال ہے۔

افتراق والتوا Differance

لوگومرکزیت کی اصطلاح، مغربی فلسفے کے مخصوص لسانی تصور کے ضمن میں دریدا نے وضع کی تھی اور Differance کی اصطلاح، اس نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی خاطر تشکیل دی ہے۔ لہٰذا مانی الذکر اصطلاح لوگومرکزیت کی متضاد اور متبادل ہے۔ یہ اصطلاح فرانسیسی فعل Differer سے ماخوذ ہے۔ جس کا مطلب بیک وقت مختلف ہونا (to diffar) اور ملتوی ہونا (to defer) ہے۔ دریدا کے مطابق زبان میں افتراق اور التوا کا کھیل ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ لوگومرکزیت کے ذریعے

سے، دریدا نے سوسیئر کو تنقید کا نشانہ بنایا کہ اس نے تحریری لفظ کو بولے ہوئے لفظ کا نمائندہ تسلیم کیا تھا، مگر Differance کا بنیادی تصور دریدا نے سوسیئر سے ہی اخذ کیا ہے۔ سوسیئر نے لسانی نشانات میں فرق کے رشتوں کی نشان دہی کی تھی۔ دریدا فرق کے تصور کو اس کی منطقی انتہا تک لے جاتا ہے۔ دریدا کے نزدیک زبان میں محض افتراقات ہیں اور چونکہ افتراقات ہیں اس لیے التوا بھی ہے۔ ایک معنی اس لیے متفرق ہوتا ہے کہ وہ ملتوی ہوتا ہے۔ Differance کی تھیوری میں دو باتوں پر بالخصوص زور ہے۔

ا۔ کوئی متن حتمی مطلق اور واحد معنی نہیں رکھتا۔ متن کے معانی مسلسل متفرق اور ملتوی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہم متن کے ایک معنی تک پہنچتے ہیں تو اس کی تہ میں اور اردگرد دیگر معانی سر اٹھائے موجود ہوتے ہیں۔ افتراق اور التوا کا ''انٹر پلے'' مسلسل اور لامتناہی ہے۔

ب۔ افتراق والتوا، متن کی ساخت صورت حال میں ہے۔ یہ باہر سے مسلط ہوتا ہے نہ کسی مخصوص مطالعاتی طریقے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ از خود موجود ہوتا، تاہم دریافت کیا جاتا ہے۔

بین المتونیت (Intertextuality)

مابعد جدید تنقید اور طریق ہائے مطالعہ کی وضاحت جس عمدگی سے بین المتونیت کرتی ہے، کوئی دوسری اصطلاح نہیں کرتی۔ مابعد جدید تنقید اور مطالعاتی طریقے بین العلومی اور بین المتونی ہیں۔ مابعد جدیدیت ایک ایسا چوراہا ہے جہاں پر چاروں طرف سے آنے والے علوم اور متون کے قافلے ایک دوسرے میں آمیز ہوتے اور مکالمہ کرتے ہیں۔

بین المتونیت کی اصطلاح جولیا کرستیوا نے ۱۹۶۶ء میں وضع کی۔ Intertextuality کا لفظ اس نے لاطینی لفظ Intertexto سے وضع کیا۔ جس کا مطلب ہے 'بنتے ہوئے باہم ملانا' (to intermingle while weaving) اور اس سے جو اصطلاحی مفہوم اس نے منتج کیا، اس نے سوسیئر کے لسانی فلسفے اور میخائل باختن کے مکالمیت (dialogism) سے اخذ کیا۔

روسی نقاد میخائل باختن نے اپنی کتاب ''دستوفسکی کی شعریات کے مسائل'' (۱۹۲۹ء) میں دو قسم کے متون، خود کلامیہ (monologic) اور ''آزاد کلامیہ'' (dialogic) کا ذکر اور ان میں فرق کیا تھا۔ اس کے مطابق وہ متن خود کلامیہ یا Monologic ہے جس کے کردار فقط مصنف کے نجی اور محدود نقطہ نظر کی ترسیل پر مامور ہوتے ہیں، یعنی کرداروں کی اپنی جداگانہ شخصیت نہیں ہوتی، وہ مصنف کی ذہنی دنیا کا عکس ہوتے ہیں۔ ایسے متن میں دراصل مصنف خود کلامی کرتا ہے اور یہ متن واحد معنی کا حامل ہوتا ہے، جب کہ آزاد کلامیہ یا dialogic متن مصنف کے جبر اور اس کے نجی سوانحی حصار سے آزاد ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں مختلف اور متنوع نقطہ ہائے نظر کے اظہار کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس کے کرداروں کی اپنی آزادانہ حیثیت اور شخصیت ہوتی ہے، وہ اپنے زاویے سے سوچ سکتے اور اپنی رضا سے عمل کر سکتے ہیں۔ باختن نے دستوفسکی کے ناولوں کو ''آزاد کلامیہ'' اور ٹالسٹائی کے ناولوں کو ''خود کلامیہ'' قرار دیا تھا۔ اردو میں نذیر احمد کے بعض ناول خود کلامیہ اور قرۃ العین حیدر کے بیشتر ناول ''آزاد کلامیہ'' کہے جا سکتے ہیں۔ ''آزاد کلامیہ'' متن میں ظاہر ہونے والے ہر نقطہ نظر کو ایک متن قرار دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ dialogism کے نظریے میں بین المتونیت کے ابتدائی خدوخال موجود تھے۔

سوسیئر کے لسانی فلسفے کے مطابق زبان، نشانات پر مشتمل ہے اور یہ نشانات ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہو کر زبان کا

نظام تشکیل دیتے ہیں اور یوں زبان دراصل رشتوں کا ایک نظام ہے (یعنی الفاظ یا نشانات کا مجموعہ نہیں) زبان کے تمام عناصر ایک دوسرے سے مربوط اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں اور اسی ربط وانحصار سے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ بین المتونیت بھی ''رشتوں کے نظام'' اور ''متون کے ربط وانحصار'' کا تصور رکھتی ہے، نیز وہ متن کو مصنف کے جبر سے آزاد سمجھتی اور متن کو مختلف متون کی رزم گاہ خیال کرتی ہے۔اس کے مطابق ایک متن میں متعدد دوسرے مضمون شامل اور کارفرما ہوتے ہیں۔لہٰذا کوئی سخن خودمختار رہوتا ہے نہ اپنے آپ میں قائم ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔جولیا کرستیوا کے مطابق:

''ہر متن حوالہ جات کے موزیک کے طور پر وجود میں آتا ہے..... ہر متن دوسرے متون کو جذب اور ان کی تغلیب کرتا ہے''۔

نیا متن جن پرانے، سابق یا دوسرے متون کو بروئے کار لاتا اور ان کی قلب ماہیت کرتا ہے وہ کئی قسم کے ہیں۔ادبی، ثقافتی، نشانیاتی، روایاتی وغیرہ۔جوناتھن کلر نے پانچ متون کی نشان دہی کی ہے: ''سماجی متن'' جسے حقیقی دنیا سمجھا جارہا ہے۔''ثقافتی متن'' وہ اجتماعی اور مشترکہ علم'' جسے ایک گروہ کے افراد مل کر تشکیل دیتے اور کام میں لاتے ہیں۔اور جو انھیں فطری لگتا ہے، صنفی ضابطوں اور کنونشنز سے مرتب ہونے والا متن، مصنوعی کی طرف قدرتی رویے سے عبارت متن، ادبی متن، جس پر نیا متن استوار ہو رہا ہے۔بنابریں بین المتونیت محض ادبی متون کی آمیزش کا تصور نہیں دیتی بلکہ ان تمام نشانیاتی، ثقافتی، علامتی، روایاتی، لسانی متون کے ذہنی وفکری رویوں کا مطالعہ بین المتونیت کرتی ہے، جو کسی متن میں مضمر وفعال ہوتے ہیں۔

بعض لوگ بین المتونیت سے ادبی متون کا تقابلی مطالعہ مراد لیتے ہیں جو ہرگز درست نہیں، اس لیے کہ کسی متن کی تشکیل میں جو دوسرے متون کام آتے ہیں وہ محض ادبی نہیں ہوتے، نیز ان کی تغلیب ہو جاتی یا وہ ڈی کنسٹرکٹ ہو جاتے ہیں۔تقابلی مطالعہ تو اس وقت ممکن ہے، جب متون اپنی وہ صورت قائم رکھ سکیں، کسی متن میں جذب ہونے سے پہلے جس کے وہ حامل ہوتے ہیں۔بین المتونیت کا زور تین باتوں پر ہے۔اول یہ کہ کوئی متن خود اپنے آپ میں قائم اور خود مکتفی نہیں۔دوم یہ کہ متن میں دوسرے متون کے ٹکرانے سے معنی کی کثرت پیدا ہوتی ہے۔سوم یہ کہ متن کی طرح قرأت اور مصنف بھی بین المتونی حیثیت رکھتے ہیں۔قرأت سے کئی حوالوں اور تناظرات کو بروئے کار لائی ہے اور مصنف بہ قول بارت، ایک ایسا ظرف ہے جس میں مختلف ''تحریریں'' باہم آمیز اور ٹکرا رہی ہوتی ہیں، مصنف نہیں تحریریں فعال ہوتی ہیں۔

حوالے

1. Derrida, Jacques. Of Grammatology (Trans. Gayatri Chakravarty Spiv).— Baltimore: John Hopkins University Press, 1974

2. Powell, Jim.Derrida for Begnners.— New York: Writers and Reachers Publishing, 1997

3.Bartha, Roland. Image- Music-Text (Trans. S. Heath).— New York: Hill & Wang, 1977

4. Kirsteva, Julia. The Kristeva reader (ed. Toril Moi).— Oxford: Basil Black Well, 1986

اشعار غالب اور ہمارا نعتیہ شعور

سید مشکور حسین یاد

مجھے شارحین غالب پر بعض اوقات عجیب حیرت ہوتی ہے کہ یہ حضرات اپنی سوچ کو ذرا بھی عام ڈگر سے ہٹانا پسند نہیں کرتے اور اشعار غالب کو سمجھنے کے لیے یہ بہت اہم اور ضروری شرط ہے کہ آپ اگر غالب کے اشعار کو واقعی ان کے صحیح تناظر میں سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنے سوچنے کے انداز میں تبدیلی لانا ضروری ہے۔ غالب کی یہ غزل بہت مشہور ہے جس کا مطلع یہ ہے:

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

اس غزل کا مزاج شروع سے لے کر آخر تک یعنی مطلع سے لے کر مقطع تک قطعی طور پر طنزیہ ہے اور طنزیہ بھی شدید انداز کا۔ ایسی صورت حال میں میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آ رہی ہے کہ اس پوری طنزیہ غزل میں شارحین نے تین اشعار کس طرح الگ نکال کر یہ فرما دیا کہ یہ اشعار نعتیہ ہیں اور پھر ان تین اشعار کو نعتیہ کہنے والے ابتدائی زمانے کے شارحین ہی نہیں بلکہ طباطبائی سے لے کر غلام رسول مہر تک نے ان اشعار کو نعتیہ کہہ دیا ہے۔ حالاں کہ یہ نعتیہ اشعار کسی طرح بھی نہیں ہیں۔ میری پہلی گزارش تو یہی ہے کہ ان اشعار کو نعتیہ کہنے سے قبل پوری غزل کے طنزیہ انداز کو پیش نظر رکھنا بے حد ضروری ہے۔ غزل روایتی انداز کے معشوقانہ رویوں پر بھی بھرپور طنز ہے اور اس میں زمانہ کے عام رویوں پر بھی بڑے زوردار انداز کی طنز موجود ہے۔

یہ تین اشعار جو مذکورہ بالا غزل کے ۵۔۶۔۷ ویں شعر ہیں ان سے پہلے غلام رسول مہر صاحب واضح طور پر لکھ رہے ہیں ''یہ تینوں شعر نعتیہ سمجھے جاتے ہیں۔ یقیناً انھیں اور معنی پر محمول نہیں کیا جا سکتا'' گویا مولانا مہر نے بات ہی ختم کر دی۔ حالانکہ ان اشعار کے لب و لہجہ سے کسی طرح بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ اشعار نعتیہ ہیں۔ میں یہاں ان میں سے سب سے پہلے پانچواں شعر لکھ رہا ہوں:

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

اس شعر کے مصرع اول میں جو سوالیہ انداز ہے وہ ایک عام محبوب یا معشوق کے لیے تو درست کہا جا سکتا ہے لیکن ہم اپنے رسول کریم

ﷺ سے اس طرح کا سوال کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ تو ایک طرح کی گستاخی بن جاتی ہے۔ اے رسول آپ مجھے کس لیے عزیز نہیں جانتے؟ ذرا سوچنے کی بات ہے کیا ہم اپنے رسول ﷺ سے اس طرح مخاطب ہو سکتے ہیں۔ کیا وہ ہماری پوزیشن سے بے خبر ہیں۔ ہم آنحضرت ﷺ کو اپنی انسانی صورت حال سے کسی طرح بھی بے خبر تصور نہیں کر سکتے۔ البتہ ایک عام محبوب یا معشوق سے اس طرح کی توقع رکھی جا سکتی ہے اور اس سے پوچھا جا سکتا ہے۔ اے محبوب تو جو مجھے قابل قدر و منزلت نہیں سمجھتا کیا اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ میں لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں کیونکہ تو ان قیمتی پتھروں کو اکثر اپنے سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ تیری نظر میں ان پتھروں کی تو قیمت ہے لیکن اپنے ایک انسان عاشق کی کوئی قدر نہیں۔

جس طرح ہمارے شارحین نے اس شعر کو نعتیہ قرار دیا ہے وہ بھی دیکھ لیجیے، غلام رسول فرماتے ہیں:

''یا رسول اللہ اس عاجز کو کس واسطے عزیز نہیں جانتے؟ میں لعل نہیں زمرد نہیں، سونا نہیں موتی نہیں۔ یعنی مجھ میں دنیاوی دولت کی کوئی خصوصیت موجود نہیں۔ دنیاوی دولت تو حضور والا کی نگاہوں میں برابر بے وقعت رہی''۔ اول تو رسول اللہ سے یہ شکوہ کرنا کہ وہ عزیز نہیں جانتے رسول کے بارے میں بہت ناشائستہ اور غیر اخلاقی بات ہے۔ رسول تو جب تک کسی کے بارے میں واضح طور پر کوئی برائی معلوم نہ ہوتی تھی اسے برا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ رحمۃ اللعالمین ہونے کے باعث ان کے بارے میں اس طرح سوچنا اچھی خاصی بے ادبی ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ ''دنیوی دولت تو حضور والا کی نگاہوں میں برابر بے وقعت رہی'' یہ بھی سراسر ایک طرح سے آنحضرت ﷺ کے بارے میں غلط سوچنے کے مترادف ہے۔ دولت تو خیر کثیر کا حصہ رکھتی ہے۔ آنحضرت نے دولت کو براہ راست مطعون کبھی نہیں کیا۔ لہٰذا یہ شعر نعتیہ ہونے کے بجائے عام معشوق سے گلے شکوے کا درجہ رکھتا ہے۔ عاشق یہ شکوہ اپنے معشوق سے بہت زوردار انداز میں کر سکتا ہے اور اس کو غیرت دلانے کے لیے کہہ سکتا ہے کہ وہ لعل و زمرد کو تو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن اپنے عاشق کی محبت اور جذبہ عشق پر توجہ نہیں کرتا۔ حالانکہ عشق و محبت کے مقابلے میں زمرد و زر و گوہر کیا معنی رکھتے ہیں۔ اس شعر میں غیرت دلانے کا جو ایک واضح سا انداز ہے اس کے پیش نظر ہم اپنے رسول کو غیرت دلانے کی کس طرح جرأت کر سکتے ہیں۔

اسی طرح اب اس غزل کے بقایا دونوں شعروں کی طرف آیئے جن کو ہمارے شارحین نے نعتیہ اشعار کہا ہے۔ مذکورہ بالا شعر کے بعد اگلے دو شعر یوں ہیں:

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ — رتبے میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے — کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

اول تو میں نہیں سمجھتا کہ احترام آدمیت کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی کو اپنے قدم چھونے کی اجازت دی ہو۔ چلیے اگر کوئی آنحضرت کے قدم چھونا چاہتا ہے یا انھیں آنکھوں سے لگانا چاہتا ہے تو ایسا کرتے وقت کون یہ جرأت کر سکتا ہے کہ آنحضرت کو اس طرح خطاب کر کے کہے کہ واہ حضرت آپ جب معراج پر تشریف لے جا رہے تھے تو چاند سورج راستے میں آئے ہوں گے انھوں

نے تو آپ کے قدموں کو اپنی آنکھوں سے لگالیا اور آپ ہیں کہ مجھے منع فرما رہے ہیں کہ میں آپ کے قدموں سے اپنی آنکھیں نہ لگاؤں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ پھر وہی بات کہ رسول اللہ کو آپ انصاف اور عدل کا سبق پڑھا رہے ہیں یا کوئی رسول اللہ سے یہ کہے کہ حضرت آپ معراج پر جاتے وقت آسمان سے گزر کر گئے ہوں گے تو اس طرح آسمان نے آپ کے قدموں کو بوسہ ضرور دیا ہے۔ کیا آپ مجھے آسمان سے بھی کم تر سمجھ رہے ہیں جو اپنے قدموں کو چومنے سے منع فرما رہے ہیں۔ یہاں بھی مسئلہ وہی غیر شائستہ خطاب کا ہے اور پھر رسول اللہ سے یہ کہنا کہ کیا میں آسمان کے برابر بھی نہیں ہوں کسی لحاظ سے بھی مناسب اور زیبا نظر نہیں آتا۔

اصل میں ساری بات جمالیاتی شعور کی ہے۔ ممکن ہے کوئی اجڈ اور گنوار آدمی آنحضرت سے اس طرح خطاب کر سکتا ہو۔ ایک شائستہ اور احساس جمال رکھنے والا شخص اس طرح کبھی خطاب نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر کوئی اپنے معشوق کو غیرت دلانے کے لیے اس طرح کا خطاب کرے تو پھر ان اشعار میں موجود جمالیات کو ذرا تھیس نہیں پہنچتی بلکہ بغور دیکھا جائے تو معشوق سے اس طرح خطاب کرنے سے احساس جمال اپنے ہی انداز میں فروغ پاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ عاشق اپنے معشوق کے قدموں کو اپنی آنکھوں سے چھونا چاہتا ہے۔ یہ ایک بہت ہی عمدہ اور لطیف پیرایہ ہے جس میں نہ صرف محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے بلکہ حسن و جمال کے بھی فوارے پھوٹ رہے ہیں۔ ادھر محبوب ہے کہ وہ اپنے پاؤں پیچھے ہٹا رہا ہے اور ساتھ ساتھ کہہ رہا ہے کہ میرے قدموں کو تو اے عاشق تم خوب جانتے ہو چاند سورج ہی چھو سکتے ہیں اور تم ایک معمولی سے خاکی انسان ہو۔ میں تمہیں اپنے قدم چھونے کی کس طرح اجازت دے سکتا ہوں۔ اس کے جواب میں عاشق کہتا ہے مجھے تسلیم ہے کہ اے محبوب تمہارے قدموں کو مہر و ماہ ہی چھو سکتے ہیں لیکن تم نے میری محبت میری عاشقی کے حوالے سے میری ذات کو اچھی طرح نہیں دیکھا۔ اگر تم ایسا کر لیتے تو تمہیں پتہ چل جاتا کہ میں کسی چاند کسی سورج سے رتبے میں کم نہیں ہوں۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے مہر و ماہ ہیں جو محبوب کے قدموں کو بوسہ دے سکتے ہیں تو ایسی صورت میں انسان کا وہی جمالیاتی شعور اپنی پوری تخلیقی قوت کے ساتھ سامنے آتا ہے جو عاشق کی نظر میں محبوب کے دعوے کو سچ ثابت کر رہا ہے۔ عاشق ایک لمحے کے لیے بھی اپنے محبوب کی اس بات کو جھوٹ نہیں سمجھ رہا ہے کیونکہ محبوب کے اس دعوے کے ساتھ عاشق کی اپنی شخصیت ٹھوس صورت میں مہر و ماہ کی طرح اسے یعنی عاشق کو محسوس ہوتی ہے بلکہ سچ پوچھیے تو وہ اپنے آپ کو مہر و ماہ سے بڑھ کر ہی تصور کر رہا ہے جبکہ شائستہ لب و لہجے کے تحت وہ اتنا کہنے پر ہی اکتفا کر رہا ہے ''رتبے میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں''۔

بالکل اسی طرح اگلے شعر کو لے لیجیے۔ اس سے پہلے کے شعر میں جیسا کہ بیان ہوا عاشق اپنے محبوب کے قدموں کو آنکھوں سے چھونا چاہتا ہے۔ اب اس شعر میں جو اس طرح ہے:

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے　　کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

یہاں صورت حال یہ ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے قدموں کو بوسہ دینا چاہتا ہے اور محبوب اسے اس کی اجازت نہیں دے رہا۔ عاشق محبوب کے اس منع کرنے کی وجہ سمجھ گیا ہے۔ محبوب اپنے آپ کو اس قدر بلند شخصیت سمجھتا ہے کہ آسمان بھی اس کے قدموں

کے نیچے ہے۔محبوب کا اپنی ذات کو اپنے پیکر کو اتنا اونچا سمجھنا اس کے جمالیاتی شعور کی وجہ سے ہے۔آپ جانتے ہیں جب کسی شخص کو اپنے پیکر اپنے جسم کے بارے میں احساس ہو جاتا ہے کہ وہ بہت خوبصورت ہے تو خوبصورتی کے ساتھ ہی بلندی کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔اپنے بلند ہونے کا احساس خیالی اور تصوراتی ضرور ہے لیکن اس تصوراتی احساس کی بنیاد نہایت ٹھوس ہے یعنی محبوب کا اپنا جسم اپنا سراپا جو اپنی جگہ خوبصورت ہے جمالیاتی شعور کی ساری بنیاد یہی جسم کا احساس ہے جو کہ اپنی جگہ مضبوط اور ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔بس ایک ٹھوس بنیاد کیا ملی پھر وہ بھی خوبصورت قسم کی یوں سمجھیے کہ اب کیا اس جسم کے دیکھنے والا اور کیا خود اس جسم کا مالک دونوں ہی کے خیالات کے وہ پر لگ گئے کہ اب دیکھنے والا اور خود صاحب جسم سارے جہاں کے ڈائمنشنز ابھار کو اپنے احاطے میں اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔اگر محبوب یہ سمجھتا ہے کہ آسمان ایسی بلند اور وسیع چیز اس کے قدموں کے نیچے ہے تو عاشق بھی محبوب کے جسم کو دیکھ کر اور اس کا عاشق ہونے کے باعث اپنے خیالات میں اس قدر وسیع و بلند ہو جاتا ہے کہ اس کے سامنے آسمان بھی کوئی خاص چیز نہیں رہتا۔یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جمالیاتی شعور اور ہماری قوت متخیلہ ایک لمحے کے لیے بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے جس کے نتیجے میں آفاق عالم کے سارے اطراف پر ان کا قبضہ ہو جاتا ہے۔لہٰذا عقیدے کے حوالے سے جمالیاتی شعور ایک الگ حقیقت ثابت ہوتا ہے جس کی ان تین اشعار غالب میں کوئی جگہ نہیں البتہ عام محبوب کے لیے ان اشعار کی آغوش وا ہے جس کی کچھ تشریح میں نے یہاں کر دی ہے۔ اس پر غور کرنے کی سخت ضرورت ہے ورنہ اگر ان اشعار کو ہم نعتیہ کہنے پر اصرار کرتے ہیں تو کسی طرح بھی ہم اپنے آپ کو حق بجانب تصور نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عقیدت اور عقیدہ کی صورت میں انسان کا جمالیاتی شعور کس طرح عمل کرتا ہے اور عام انسانی صورت حال میں ہمارا یہ شعور کس طرح فعال ہوتا ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ویسے تو میں نے اس ضمن میں پہلے ہی کچھ بات کر دی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس فرق پر مزید کچھ روشنی ڈالنا ضروری ہے۔اگر ہمارے شارحین غالب اس فرق کو پیش نظر رکھتے کہ عام انسانی صورت حال میں ہمارا جمالیاتی شعور کس طرح عمل پیرا ہوتا ہے اور عقیدت کی صورت حال میں ہمارا یہ شعور کس طرح عمل کرتا ہے تو وہ یعنی شارحین غالب زیر بحث تین اشعار کو کبھی بھی نعتیہ اشعار کہنے کی جرأت نہ کرتے۔ان زیر بحث اشعار میں مہر و ماہ اور آسمان کے الفاظ نے شارحین کے ذہن کو خاص انداز میں متاثر کیا ہے۔ان شارحین کے خیال میں انسان کی رسائی چاند سورج اور آسمان تک عام انسانی صورت حال میں ممکن ہی نہیں ہے سوائے اس حقیقت کے پیش نظر کہ آنحضرت ﷺ معراج میں آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے عرش تک پہنچے۔دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ شارحین غالب نے انسان کی قوت متخیلہ پر توجہ نہیں دی اور پھر متخیلہ بھی ایک غالب جیسے شاعر کی قوت متخیلہ یا آپ اسے عام شاعرانہ متخیلہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ویسے تو عام انسان کی قوت متخیلہ بھی کوئی کم کمالات نہیں دکھاتی لیکن شاعر کی قوت متخیلہ تو شاعر کے ذہن کو تمام عرش و فرش کی سیر کرانے میں ذرا تاخیر سے کام نہیں لیتی۔اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے ہم شارحین غالب پر تیسرا حملہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ انھوں نے مہر و ماہ اور انسان کے الفاظ کو احتیاط سے کام نہ لے کر آنحضرت کی معراج کے واقعہ تک پہنچا دیا۔ جس کی وجہ سے وہ، یعنی شارحین غالب ان اشعار زیر بحث کے سمجھنے میں ہوشمندی

سے کام نہ لے سکے ۔ان اشعار کو نعتیہ کہہ کر جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں شارحین نے آنحضرت ﷺ کے حضور میں عقیدت کا اظہار نہیں کیا جتنا کہ ان حضرات سے اس ضمن میں کوتاہی سرزد ہوئی ہے ۔اگر وہ ذرا توجہ سے کام لیتے تو اس کوتاہی سے آسانی کے ساتھ بچ سکتے تھے ۔بس ذرا غالب کے طنزیہ لہجے پر توجہ کرنے کی ضرورت تھی ۔اگر شارحین غالب کی غزل کے لب و لہجے کو پیش نظر رکھتے تو اشعار زیر بحث کو کبھی نعتیہ کہنے کی ہمت نہ کرتے ۔نعت کہتے وقت شاعر کا احساس جمال قطعی طور پر حسن و جمال انسانی کی جداگانہ بلندیوں پر ہوتا ہے ۔اس حقیقت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں نے عرض کیا ہے کہ شارحین نے مہر و ماہ اور آسمان کے الفاظ کو ان کے لغوی الفاظ کے سیاق وسباق میں دیکھنے کے بجائے اپنی عقیدت کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔اور یوں وہ، یعنی شارحین اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ نعت میں الفاظ کا استعمال عام اصناف سخن میں الفاظ کے استعمال سے ایک الگ حیثیت رکھتا ہے جس کے لیے شاعر کو اور نعت فہم دونوں ہی کو بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے ۔زیر بحث اشعار میں غالب تو استعمال الفاظ میں پوری طرح محتاط رہا ہے لیکن شارحین بہ حیثیت نعت فہم محتاط نہیں رہ سکے اور میری تمام گفتگو کا ماحصل یہی ہے کہ نعت فہم حضرات کو بھی اس ضمن میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے ۔

ہم بند کیے آنکھ تصور میں پڑے ہوں
ایسے سے کوئی چھم سے جو آ جائے تو کیا ہو

(ریاض خیرآبادی)

تمام عمر کی بے تابیاں اب آ کے مٹیں
سکون قلب کے غار حرا میں رہتا ہوں

(وحید قریشی)

علامہ اقبال۔ جدید دنیا کے تناظر میں

پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

ہر فن کار اور صاحب فکر اپنے زمانے کی پیداوار ضرور ہوتا ہے مگر وہ صرف اپنے زمانے تک محدود نہیں رہتا۔ اس کی نگاہ تند و تیز ماضی پر بھی ہوتی ہے اور اپنے مستقبل پر بھی۔ علامہ اقبال کی عظمت اور جدید دنیا کے تناظر میں ہمارے لیے نشان راہ بننے کا راز یہ ہے کہ وہ حال کا کرب ناک احساس رکھتا ہے، آتش رفتہ کا سراغ بھی لگاتا ہے اور کسی اور زمانے کا خواب بھی دیکھتا ہے۔ علامہ اقبال کی اس دائمی معنویت کا احساس کرتے ہوئے پروفیسر نکلسن نے کہا تھا:

''اقبال اپنے زمانے کے آدمی ہیں وہ اپنے زمانے سے آگے کے بھی آدمی ہیں اور اپنے زمانے سے اختلاف بھی رکھتے ہیں''۔

پروفیسر نکلسن کے قول کی تصدیق میں علامہ اقبال کے فارسی اور اردو کلام سے متعدد مثالیں داخلی شہادت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثنوی اسرار و رموز کے آغاز میں علامہ اقبال اپنا فکری تعارف اس طرح کے اشعار سے کراتے ہیں:

ذرہ ام مہر منیر آن من است — صد سحر اندر گریباں من است
نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم — من نوائے شاعر فرداستم
نغمہ من از جہان دیگر است — این جرس را کاروان دیگر است

''یعنی گو میں ایک ذرہ ہوں لیکن سورج کی ساری روشنی میرے ایک لحظہ کے برابر ہے۔ میرے گریبان میں سینکڑوں صبحیں مستور ہیں۔ میں ایسا نغمہ ہوں جو مضراب سے بے نیاز ہے۔ میں آنے والے دور کا شاعر ہوں۔ میرے نغمے کا تعلق ایک اور ہی دنیا سے ہے۔ اس جرس کے لیے کوئی نیا قافلہ آئے گا''۔

یہ اشعار علامہ اقبال کے فکری وجدان اور وژن کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ کہ میرے نغمے کا تعلق ایک اور ہی دنیا سے ہے یا میں آنے والے دور کا شاعر ہوں کو محض شاعرانہ تعلی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ عام شعرا کی طرح ان کی شاعری گل و بلبل کے ذکر یا ہجر و فراق کے گیتوں پر مبنی نہیں بلکہ اس شاعری میں ایک توانا و جاندار نظریہ سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظریاتی شاعری انسان کے مذہبی، اخلاقی، سماجی، سیاسی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل اور ان کے حل سے متعلق ہے، گویا علامہ کی شاعری کا مرکزی نقطہ

انسان اوراس کے مادی وروحانی مسائل ہیں ۔اس حوالے سے جب تک دنیا میں بسنے والے انسان کا وجود باقی ہے علامہ اقبال کے افکار کی اہمیت ،صداقت اور دوامیت سے انکار ممکن نہیں ۔بلا شبہ ان کا کشف آئندہ کئی صدیوں کے انسانی مسائل سے ہم کلام ہونے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے ۔ہاں مگر اس کے لیے ان کے آئینۂ گفتار میں آنکھیں کھول کر دیکھنے کی شرط ہے ۔

اس وقت جدید دنیا کا منظر نامہ کسی قدر تکلیف دہ ہے کیونکہ اس دنیا میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون رائج الوقت ہے ۔طاقتور قومیں حاکم اور کمزور قومیں محکوم ہیں ۔معاشی وسائنسی اعتبار سے آسودہ حال قومیں طاقت کے نشے میں اس قدر سرشار ہیں کہ وہ کمزور قوموں کے قدرتی ومعدنی وسائل پر قابض ہو کر ان سے جینے کا حق چھیننے کے درپے ہیں اور انھیں ہمیشہ کے لیے محکوم اور دست نگر دیکھنا چاہتی ہیں ۔ستم ظریفی یہ کہ محکوم اور کمزور قومیں اس وقت مسلم اقوام ہیں ۔ان حالات میں آپ خود فیصلہ کیجیے کہ برصغیر کی اردو شاعری کی تاریخ میں علامہ اقبال کے علاوہ کوئی دوسرا شاعر قوموں کی راہبری کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے؟ یقیناً علامہ اقبال کے علاوہ اور کوئی نہیں کیونکہ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ اپنی بھرپور وسعت اور گہرائی کے ساتھ جو بصیرت، معرفت اور آگہی جو اس تلمیذ رحمٰن شاعر کو عطا ہوئی تھیں دوسرے کسی شاعر کے ہاں اس کی مثال نہیں ملتی ۔وہ علامہ اقبال ہی تھے جن کی زبان ترجمان الہام بن کر پکار اٹھتی تھی:

آب روان کبیر تیرے کنارے کوئی　　دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں　　میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

(بال جبریل)

جدید دنیا میں مسلم اقوام کی پامالی اور زبوں حالی کا جو نقشہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں کھینچا تھا آج بھی صورت حال اس سے مختلف نہیں ۔اس حوالے سے ملت اسلامیہ کی عظمت رفتہ کا مرثیہ خواں اقبال ہی تھا اور اس کے احیا اور نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا حدی خواں بھی وہی ہے ۔اس کے کلام میں مرض کی تشخیص اور علاج دونوں موجود ہیں ۔علامہ نے قوموں کی ترقی کو سائنسی تعلیم سے مشروط کیا ہے اور انھوں نے اپنی ذات کو بطور مثال پیش کیا اور تعلیم کے لیے برطانیہ اور جرمنی کا سفر طے کیا ۔مگر ان کے ہاں تعلیم سے مراد وہ تعلیم ہے جو جسم کے ساتھ ساتھ روح کی بالیدگی کا فریضہ بھی سرانجام دے ۔اسی لیے وہ موجودہ نظام تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں کیونکہ یہ تعلیم صرف جسم کی بھوک مٹانے تک ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں وہ اس نظام تعلیم کو اہل کلیسا کا نظام تعلیم کہتے ہیں جو دین ومروت کے خلاف ایک سازش ہے ۔اسی لیے وہ اہل مدرسہ کے ہاں لا الہ الا اللہ کی صدا کی گم شدگی کے شاکی ہیں ۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مضبوط معیشت کے بغیر کسی قوم کی ترقی محض ایک خواب ہے ۔جدید دنیا میں بیشتر مسلم اقوام معاشی ابتری کا شکار ہیں البتہ چند اقوام مضبوط معیشت کے باوجود علمی افلاس کے باعث غیر ترقی یافتہ ہیں ۔معاشی اعتبار سے مضبوط قوموں، یعنی امریکہ، برطانیہ، فرانس، جاپان وغیرہ نے معاشی طور پر پسماندہ مسلم اقوام کو قرضے فراہم کر کے انھیں سود

درسود کے نظام میں جکڑ کر اپنامحتاج بنالیا ہے۔علامہ اقبال نے اس کے لیے الگ عالمی اسلامی منڈی کی تجویز پیش کی تھی اور یہود کی سازش سے متنبہ بھی کیا تھا:

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سودخور
جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زور پلنگ

نام نہاد اقوام متحدہ میں جس طرح کمزور مسلم ممالک کی آواز کو ویٹو پاور سے خاموش کردیا جاتا ہے۔علامہ اقبال نے موجودہ عالمی سیاسی حالات میں باوقار طریقے سے جینے کے لیے مغربی جمہوریت کے بجائے اسلامی شورائی نظام کی طرف متوجہ کیا اور اتحاد ملت اسلامیہ پر زور دیتے ہوئے مسلمانوں کو الگ سلامتی کونسل تشکیل دینے کی تجویز دی:

طہران ہو اگر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرہ ارض کی تقدیر بدل جائے

ان کی دور بینی اور طاقت وربصیرت کا سرچشمہ قرآن پاک میں غوطہ زن ہونے کا نتیجہ تھا۔اسی لیے وہ ہا ربار مسلمانوں کی ترقی وفلاح وکردار سازی کوقرآنی تعلیمات سے مشروط کرتے ہیں اور مسلمانوں کی ناکامی کوقرآن سے دوری سے تعبیر کرتے ہیں تو:

خوار از مہجوری قرآں شدی شکوہ سنج از گردش دوراں شدی
گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

احیائے دین کی بات ہو یا دنیاوی کامیابی کی! علامہ کے نزدیک اس کا علاج صرف اور صرف قرآن فہمی ہے۔آخر میں بقول جیلانی کامران:

''اقبال اسلامی تہذیب کی وہ دائمی آواز ہے جو ایک لمبے عرصے تک انسان کو فلاح کی جانب بلاتی رہے گی۔زمانے نے جو رخ اختیار کیا ہے اس میں اس آواز کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔اقبال ہر زمانے کے لیے نشان راہ ہے مگر ہر زمانے کے لیے اس نشان کی دریافت ضروری ہے''۔

کلیاتِ میرؔ کے قلمی نسخے۔ تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

رفاقت علی شاہد

میر سید محمد تقی میرؔ (۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء تا ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) اردو کے معروف ترین، اہم ترین، صاحب طرز، پُرگو، پُراثر شاعر ہیں۔ وہ بیک وقت خوش قسمت اور بدقسمت شاعر ہیں۔ خوش قسمت ان معنوں میں کہ اول: اردو کے تقریباً تمام اہم نقادان ادب نے میرؔ شناسی یا میریات کی توانا روایت میں اپنا اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ دوسرے: ان کے اردو کلام کے بہت سے مخطوطات موجود ہیں جو ان کے کلام کی ہردل عزیزی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ میرؔ صاحب کی عظمت و فن کاری کا اعجاز ہے کہ ان کے کلام کے قلمی نسخے اٹھارویں صدی عیسوی/ بارھویں صدی ہجری کے وسط سے لے کر چودھویں صدی ہجری/ بیسویں صدی عیسوی کے شروع تک تیار ہوتے رہے۔ اگرچہ میرؔ کی کلیات ۱۸۱۱ء میں کلکتہ سے شائع ہو گئی تھی لیکن یہ محدود اشاعت تشنگان سخن میرؔ کی تشنہ کامی کا مداوا نہ کر سکی، چنانچہ عشاقان میر اور صاحبان ذوق، کلام میرؔ کی نقول تیار کراتے، اپنے ذوق سخن کی آب یاری کرتے اور ان نقول کو سینت سنت کر دل سے لگائے رکھتے۔ اسی وجہ سے آج کلام میرؔ کے نصف صد سے زائد مخطوطات مختلف ادارہ جاتی، ذاتی و سرکاری کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ تیسرے: کلام میر کے معاصر مخطوطات اتنی قابل قدر تعداد میں موجود ہیں کہ ان کی مدد سے کلیات میر کا بہت حد تک مستند اور منشائے مصنف کے مطابق متن تیار کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت ہے تو وسائل اور ہمت کی۔

میرؔ ان معنوں میں بدقسمت ہیں کہ ان کے جادو اثر کلام کا مستند اور مکمل متن موجود نہیں۔ کلیات میرؔ سب سے پہلے وفات میرؔ کے اگلے سال ۱۸۱۱ء میں کلکتہ سے شائع ہو گیا تھا۔ تب سے اب تک تقریباً دو سو سال کے عرصے میں کلیات میرؔ کم سے کم سات بار مرتب ہو کر ایک درجن سے زیادہ بار شائع ہو چکا ہے، لیکن ان میں سے شائع شدہ کسی متن کو مستند اور جامع نہیں کہا جا سکتا۔ دو سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے پر بھی میرؔ کے کلیات کی تحقیقی تدوین ہنوز اردو دنیا پر قرض ہے۔

کلیات میرؔ کی تحقیقی تدوین کی سمت پہلا قدم اٹھاتے ہوئے میں نے اس تحقیق کا ڈول ڈالا ہے کہ کلام میرؔ کے مخطوطات کہاں کہاں ہیں، ان کی کیا اہمیت ہے اور کلام میرؔ کی تدوین جدید میں کون کون سا مخطوطہ کس قدر کارآمد ہو سکتا ہے؟ یہ تفصیلی مطالعہ ہے جو ایک سے زائد قسطوں میں شائع ہوگا۔ سر دست مکمل کلیات میرؔ کے معلومہ قلمی نسخوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ میرے وسائل محدود ہیں، اس لیے ممکن ہے بعض نسخوں یا معلومات تک میری رسائی نہ ہو سکی ہو۔ ارباب علم اور صاحبان ذوق سے راہنمائی اور اعانت کی درخواست ہے۔

(۱) نسخۂ بارکر، ملائشیا

انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ اینڈ سویلائزیشن، ملائشیا میں کینیڈا کے عبدالرحمٰن بارکر کا ذخیرہ اردو مخطوطات موجود ہے۔ اس ذخیرے میں کلیاتِ میرؔ کا ایک نادر ترین نسخہ ہے۔ اس نسخے کا فہرست نمبر ۲۶۵ ہے۔ اور یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں دیوان اول، دوسری میں دیوان دوم وسوم اور تیسری میں دیوان چہارم، پنجم، ششم، ہفتم (دیوانچہ) ہیں۔ نسخے کی کتابت شکستہ آمیز نستعلیق میں ہے، عنوان سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ جلد دوم میں عنوانات کی جگہ عموماً چھوڑ دی گئی ہے۔ غالباً بعد میں عنوان لکھنے کا ارادہ ہوگا، جو پورا نہ ہوسکا۔ نسخے کا کاغذ باریک ہے۔ نسخہ قدرے کرم خوردہ ہے۔ کرم خوردہ حصوں کی مرمت کر دی گئی ہے۔ جلد دوم میں کرم خوردگی کا اثر جلد اول کی نسبت زیادہ ہے جبکہ جلد سوم میں کرم خوردگی کے آثار پہلی دونوں جلدوں کی نسبت کم ہیں۔ کرم خوردگی کے باوجود مخطوطے میں متن مکمل طور پر محفوظ اور پوری طرح قابل استفادہ ہے۔

اس مخطوطے کی جلد اول میں ۲۱۴ ورق ہیں اور اس کا ناپ ۷ ۱/۴" × ۱۱ ۳/۸ ہے۔ جلد دوم میں ۲۰۹ ورق ہیں اور اس کا ناپ ۷ ۳/۴" × ۱۱ ۳/۴ ہے جب کہ جلد سوم میں ۱۹۳ ورق ہیں اور اس کا ناپ ۱۰ ۷/۸ × ۷ ۱/۲" ہے۔ یوں پورا مخطوطہ ۶۱۶ اوراق پر مشتمل ہے۔ فی صفحہ سطور کی تعداد ۲۰ ہے۔ مخطوطے کی تینوں جلدوں کے اوراق کا ناپ پہلے یکساں رہا ہوگا لیکن کرم خوردہ حصوں کی مرمت کرنے کے بعد اس میں تبدیلی آ گئی۔

کاتب نے ہر دیوان میں پہلے ردیف وار غزلیات اور پھر دیگر اصناف کا کلام نقل کیا ہے۔ فہرست نگار نے مشمولہ کلام کی جو تفصیلات مہیا کی ہیں، ان کے مطابق جلد اول میں غزلیات کے بعد مخمسات، ہجو اور ''مثنوی دریائے عشق'' وغیرہ کتابت ہوئے ہیں۔ بقیہ دواوین کے مشمولات میں سوائے غزلیات کے کسی اور صنف کی نشان دہی فہرست میں نہیں ملتی۔

جلد سوم میں دیوان چہارم کے ترقیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلمی نسخہ کلب علی خاں عرف کالے خاں نے نواب مرزا صاحب پسر نواب احمد علی کے لیے کتابت کیا تھا۔ جلد دوم کے تعارف میں بھی فہرست نگار نے لکھا ہے کہ یہ جلد یا نسخہ نواب مرزا صاحب کے لیے کالے خاں نے کتابت کیا۔ جلد اول میں اگرچہ کسی کاتب کا نام تحریر نہیں لیکن فہرست نگار نے واضح کیا ہے کہ انداز کتابت سے اس جلد کا کاتب بھی کالے خاں ہی لگتا ہے۔ یوں یہ پورا مخطوطہ ایک ہی کاتب نے کتابت کیا [۱]۔

اس قلمی نسخے کا کاتب کالے خاں کافی مشاق اور پیشہ ور کاتب معلوم ہوتا ہے۔ اس نے پیش نظر نسخے کے ۶۱۰ ورق تقریباً پونے دو سال کے عرصے میں تسلسل اور مستقل مزاجی کے ساتھ کتابت کیے۔ اس نے ہر دیوان کے اختتام پر اس کی تاریخ تکمیل بھی لکھ دی ہے جس سے رفتارِ کتابت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل فہرست نگار کے مطابق یوں ہے:

۱۔ دیوان اول ۔ جلد اول: ورق ۱ تا ۲۱۴	تاریخ تکمیل: ۱۷ رجب ۱۲۴۹ھ (مطابق ۳۰ نومبر ۱۸۳۳ء)
۲۔ دیوان دوم ۔ جلد دوم: ورق ۱، ب تا ۱۳۰، ب	تاریخ تکمیل: ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۹ھ (مطابق ۲۲ اپریل ۱۸۳۴ء)
۳۔ دیوان سوم ۔ جلد دوم: ورق ۱۳۱، ب تا ۲۰۹ ا	تاریخ تکمیل: ۹ ربیع الاول ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۶ جولائی ۱۸۳۴ء)
۴۔ دیوان چہارم ۔ جلد سوم: ورق ۱ ا تا ۵۹ ب	تاریخ تکمیل: ۱۰ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۸۳۴ء)
۵۔ دیوان پنجم ۔ جلد سوم: ورق ۶۱ [۲] ب تا ۱۱۵ ا	تاریخ تکمیل: ۱۲ شعبان ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۸ دسمبر ۱۸۳۴ء)

۶۔ دیوانِ ششم۔جلد سوم: ورق۱۱۶ب تا ۱۴۳ ل تاریخ تکمیل: ۵ رمضان ۱۲۵۰ھ (مطابق ۵ جنوری ۱۸۳۵ء)

۷۔ دیوانِ ہفتم۔جلد سوم: ورق ۱۶۴ ل تا ۱۹۳ ل تاریخ تکمیل: ۱۹ رمضان ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۹ جنوری ۱۸۳۵ء)[۳]

فہرست پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کاتب نے مخطوطے کی جلد دوم کا آغاز جلد اول کے اختتام ۱۷ رجب ۱۲۴۹ھ (مطابق ۳۰ نومبر ۱۸۳۳ء) کے بعد کیا اور ۲۰۸ اوراق کی جلد دوم (کل ۲۰۹ اوراق میں سے ایک ورق سادہ ہے) آٹھ ماہ سے کچھ کم وقت میں ۹ ربیع الاول ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۶ جولائی ۱۸۳۴ء) کو کتابت کر لی۔ اسی طرح اس نے جلد سوم کے تقریباً ۱۹۰ اوراق (۱۹۳ اوراق میں ساڑھے تین ورق خالی) اگلے چھے ماہ اور کچھ دنوں میں کتابت کر کے ۱۹ رمضان ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۹ جنوری ۱۸۳۵ء) کو مخطوطے کی کتابت مکمل کر لی۔ کاتب کی اس رفتار کتابت کو مدنظر رکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اس قلمی نسخے کی جلد اول کے ۲۱۴ ورق کتابت کرنے میں کم و بیش آٹھ ماہ لگائے ہوں گے۔ اس صورت میں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کاتب نے اس مخطوطے کی کتابت کا آغاز اواخر ۱۲۴۸ھ (مطابق ۱۸۳۳ء کے وسط) میں کیا ہوگا۔

زیر بحث قلمی نسخہ بعض وجوہ سے زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ اول: اس لیے کہ کلیات میر کا یہ نسخہ دیگر معلومہ نسخوں کی نسبت ضخیم ترین ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس نسخے میں میرؔ کا نسبتاً مکمل اور دیگر نسخوں کی نسبت زیادہ کلام درج ہوگا۔ دوسرے: اس میں میرؔ کا دیوان ہفتم یا دیوانچہ بھی شامل ہے، جو انتہائی کم یاب بمنزلہ نایاب ہے۔ اس دیوانچے کی کم یابی کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تمام تر تلاش و تحقیق کے بعد بالآخر اپنی تاریخ میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے:

''اس دیوانچے میں دیوان ششم کے بعد سے لے کر وفات تک کا کلام شامل تھا۔ یہ نایاب ہے۔''[۴]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے قیاس قائم کیا ہے کہ میرؔ کا دیوان ششم ۱۲۲۳ھ یا اس سے قبل لکھنو میں مکمل ہو چکا تھا[۵] میرؔ کی وفات ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ (مطابق ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء) کو ہوئی[۶]۔ گویا دیوان ششم کی تکمیل کے بعد میرؔ کم و بیش دو سال زندہ رہے۔ اس دوران میں انھوں نے جو کلام کہا، وہ ان کے دیوان ہفتم یا دیوانچے میں شامل ہے۔ زیر بحث نسخہ کلیات میں میرؔ کے اسی دیوان ہفتم کا متن ورق ۱۶۴ ل تا ۱۹۳ ا (یعنی تقریباً تیس اوراق (۵۹ صفحات) پر مشتمل ہے۔ یہ میرؔ کا ایسا کلام ہے جو ان کے کسی مطبوعہ اور معلومہ حد تک کسی غیر مطبوعہ نسخے میں نہیں ملتا۔

تیسرے: یہ معلوم ہے کہ میر کا دیوان ہفتم وفات میرؔ کے باعث نامکمل رہا۔ اسی باعث اس کی ضخامت بقیہ دواوین کی نسبت کم رہی اور یہ دیوان عام بھی نہیں ہو سکا۔ اس تناظر میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ میرؔ کا یہ دیوان ہفتم مسودے کی صورت میں رہا اور میرؔ کے کسی بہت ہی قریبی متعلق فرد کے پاس ہی اس کی نقل ہوگی، چنانچہ نسخۂ بارکر رملائنشیا میں اس دیوان ہفتم کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ نسخۂ بارکر اگر میرؔ کے ذاتی مسودے کی نقل نہیں تو میرؔ کے کسی ایسے ہی قریبی عزیز کے معتبر نسخے سے ضرور نقل ہوا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ براہ راست مسودہ میرؔ یا میرؔ کے نسبتی نسخے کے بجائے نسخۂ بارکر کسی نقل شدہ مسودے یا نسخے کی نقل بھی ہو سکتا ہے؟ اس کا امکان اس لیے نہیں کہ ابھی تک کسی ایسے قلمی نسخے کی نشان دہی نہیں ہو سکی جو وفات میرؔ (۵ شعبان ۱۲۲۵ھ مطابق ۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء) اور نسخۂ بارکر کے آغاز (اواخر ۱۲۴۸ھ مطابق وسط ۱۸۳۳ء) کی درمیانی مدت میں کتابت کیا گیا ہو اور جس میں کم سے کم میرؔ کا دیوان ہفتم بھی مکتوب ہو۔

مندرجہ بالا امتیازات کے باعث کلیات میرؔ کی تحقیقی تدوین میں نسخہ بارکر رملائنشیا کو ماخذی نسخے کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

(۲) نسخۂ لندن

برٹش میوزیم لائبریری، لندن میں کلیاتِ میرؔ کا ایک نادر نسخہ دو حصوں میں موجود تھا۔ یہ نسخہ اب دیگر مخطوطات کے ساتھ برٹش لائبریری، لندن کے شرقی مخطوطات کے ذخیرے کا حصہ ہے۔ برٹش میوزیم میں اردو مخطوطات کے فہرست نگار[7] اور ڈاکٹر عبادت بریلوی[8] نے ان دونوں حصوں کا تعارف دو الگ مخطوطات کے طور پر کیا ہے، لیکن آثار و شواہد سے مجھے یہ کلیاتِ میرؔ کے دو حصے معلوم ہوتے ہیں۔ تفصیلی ذکر آگے آتا ہے۔

ان دونوں نسخوں میں سے پہلا نسخہ میرؔ کے دیوانِ اول پر مشتمل ہے[9] جبکہ دوسرے نسخے میں میرؔ کے دیوان دوم تا ششم کتابت ہوئے ہیں۔ ان دونوں نسخوں کی فہرست نمبر ۱۶۳ اور ۱۶۴ جبکہ لائبریری نمبر OR 378 اور OR 379 ہیں۔ دونوں نسخوں کی بالترتیب ضخامت ۲۲۶ اور ۴۲۰ ورق، فی صفحہ سطور کی تعداد ۱۹ اور ۱۷، مخطوطے کی پیمائش ۱۰x۴ ۱/۲ ۹ انچ اور ۱۲x۴ ۱/۲ ۷ انچ، سطور کی لمبائی ۲/۱ ۴ اور ۳/۴ ۴ انچ اور کتابت نستعلیق خط میں کی گئی ہے۔[10] یہ دونوں نسخے دہلی کے چیف کمشنر کرنل ولیم ہملٹن کے پاس تھے۔ ۱۸۶۳ء کے بعد ان کے ساتھ یہ نسخے برطانیہ پہنچے اور ۱۸۶۸ء میں ان کی بیوہ سے دیگر مخطوطات کے ساتھ یہ نسخے بھی برٹش میوزیم لائبریری، لندن کے لیے خرید لیے گئے۔[11]

فہرست نگار بلوم ہارٹ نے ان میں سے نسخۂ اول (دیوانِ اول) کی تاریخ کتابت ۳/اپریل ۱۸۶۳ء لکھی ہے اور کاتب کا نام سید زین الدین ساکن امروہہ ضلع مرادآباد تحریر کیا ہے، جس نے یہ نسخہ کرنل ولیم ہملٹن (مالک مخطوطہ) کے لیے تیار کیا[12]۔ دوسرے نسخے (دیوان دوم تا ششم) میں دو جگہ تاریخ کتابت درج ہوئی ہے۔ دیوان سوم کے آخر میں کاتب نے تاریخ کتابت ۲۶ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ لکھی ہے، گویا اس نسخے میں دیوان دوم و سوم کی کتابت ۲۶ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ/ (یکم مئی ۱۸۱۰ء) کو مکمل ہوئی۔ مخطوطے کے آخر میں کاتب نے اتمامِ کتابت کی تاریخ ۲۲ محرم ۱۲۲۷ھ/ (۶ فروری ۱۸۱۲ء)[13] لکھی ہے، گویا ۲۶ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ کے بعد سے ۲۲ محرم ۱۲۲۷ھ، یعنی تقریباً پونے دو سال کے عرصے میں کاتب نے مخطوطے میں شامل میرؔ کے بقیہ تین دواوین (دیوان چہارم و پنجم و ششم) کتابت کیے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق دیوان پنجم کے اختتام پر کاتب نے اپنا نام ''سید محمد حسین السبزواری المختاری الحسنی'' لکھا ہے۔[14]

فہرست نگار کی صراحت کے مطابق اس نسخہ دوم میں میرؔ کے دیوان چہارم، پنجم اور ششم معروف ترتیب سے کتابت نہیں ہوئے۔ کاتب نے چوتھے دیوان کی جگہ میرؔ کا پانچواں دیوان، پانچویں کے مقام پر چھٹا اور آخر میں چھٹے کی جگہ چوتھا دیوان کتابت کیا ہے۔ فہرست نگار نے موازنے کے لیے کلیاتِ میرؔ کی اشاعت اول (کلکتہ ۱۸۱۱ء کو) پیشِ نظر رکھا ہے۔[15]

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے برٹش میوزیم کے ان دونوں نسخوں کو خود ملاحظہ کر کے ان پر تعارفی مضمون قلم بند کیا تھا۔[16] اس میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ دیوانِ اول کے نسخے کے کاتب سید زین الدین نہیں اور نہ یہ نسخہ کرنل جارج ولیم ہملٹن کے لیے تیار کیا گیا۔ ان کے مطابق اس نسخے کی کتابت ۱۸۶۳ء سے بہت پہلے کی ہے۔ نسخے میں کاتب اور سنہ کتابت مذکور نہیں۔ نسخے کے شروع میں سید زین الدین کا ایک نوٹ درج ہے جس کے مطابق اس نسخے میں کچھ اشعار کے مصرعے کٹ گئے تھے۔ کرنل ہملٹن کے حکم پر سید زین الدین نے مخطوطہ مرمت کر کے یہ اشعار مکمل کر دیے[17] اور اس امر کا ایک نوٹ مخطوطے کے آغاز میں تحریر کر

دیا۔فہرست نگار بلوم ہارٹ نے سید زین الدین کے اس بیان یا نوٹ سے التباس کرتے ہوئے انھیں کاتب مخطوطہ اور نوٹ لکھنے کی تاریخ ۳/اپریل ۱۸۶۳ء کو اس مخطوطے کی تاریخ کتابت باور کرلیا۔

بلوم ہارٹ نے اس نسخے کے دیوان اول کے مشمولات کی درج ذیل تفصیل دی ہے: غزلیات ردیف وار (ورق ۲ ب)، مطلعات (ورق ۱۴۳ ا)، رباعیات، چند فارسی نظموں کے ساتھ (ورق ۱۴۷ ا)، مخمسات، ترکیب بند، ترجیع بند اور مسدسات (ورق ۱۴۳ ب)، مثنویات (ورق ۱۶۹ ا) مثنویات میں ''اجگرنامہ'' یا ''اژدرنامہ'' (ورق ۱۶۹ ا)، ''جوش عشق'' (ورق ۱۸۷ ا)، ''دریائے عشق'' (ورق ۱۹۷ ا)؛ ''اعجاز عشق'' (ورق ۲۰۴ ب) اور ''شعلۂ عشق'' (ورق ۲۱۷ ب)۔[۱۸]

فہرست نگار بلوم ہارٹ کی مہیا کردہ یہ فہرست نامکمل اور غیر مشروح ہے۔ڈاکٹر عبادت بریلوی نے چوں کہ یہ مخطوطہ خود ملاحظہ کیا تھا اور اس کے مشمولات اپنے مرتبہ ''کلیات میرؔ'' میں بھی استعمال اور شامل کیے تھے، اس لیے انھوں نے اس نسخے (نسخۂ اول، دیوان اول) کے مشمولات کی نسبتاً مکمل فہرست اپنے مضمون میں پیش کی ہے۔ان کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق دیوان اول کے اس نسخے میں الف بائی ترتیب سے غزلیات کے بعد ''مطلعات میرؔ'' کے عنوان سے فردیات شامل ہیں اور ''کاتب نے بعض ایسے اشعار کو بھی مطلع تصور کرلیا ہے، جو مطلع نہیں ہیں، اس لیے اس کا عنوان 'فردیات' ہونا چاہیے''۔ڈاکٹر عبادت بریلوی کی صراحت کے مطابق اس نسخے کی ''تمام غزلیں مختلف مطبوعہ نسخوں میں بھی موجود ہیں۔ان میں کوئی غزل ایسی نہیں ہے، جو اب تک شائع نہ ہوئی ہو۔'' فردیات کے بعد نسخے میں ۵۳ رباعیاں درج ہیں، ان میں سے ۶ رباعیاں مستزاد ہیں۔''رباعیوں کے بعد ایک تضمین ہے جس کا عنوان ہے ''شعر فارسی با شعر ہندی ضم کردہ شد''۔اس میں ایک شعر اردو میں ہے اور دوسرا فارسی میں ..... اسی کے ساتھ .....ایک اور تضمین درج ہے جس کا پہلا مصرع اردو میں ہے اور بقیہ دو مصرعے فارسی میں .....ان نظموں کے بعد تین مخمس ہیں۔پہلے دو میں فارسی کے مصرعے ہیں لیکن تیسرا اردو میں ہے .....ان کے بعد ایک واسوخت ترکیب بند ہے .....پھر ایک مسدس ہے .....اس کے بعد ایک ترجیع بند ہے .....اس کے بعد .....ایک مسدس شامل ہے جس کو واسوخت کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس واسوخت کے بعد اس نسخے میں پانچ مخمس ہیں جو حضرت علیؓ کی منقبت میں لکھے گئے ہیں۔.....منقبت کے بعد .....دو مخمس ہیں جن کا عنوان ہے ''مخمس در ہجو شاہ عالم بادشاہ''۔یہ مخمس دوسرے عنوانات سے مختلف نسخوں میں شائع ہو چکے ہیں۔اس نسخے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ نے یہ مخمس شاہ عالم بادشاہ کی ہجو میں لکھے تھے۔.....ان کے بعد ایک مخمس ''در ہجو شیخ'' ہے۔.....اس ہجو کے بعد ایک اور مخمس در ہجو شہر آشوب ہے۔.....مخمسات کے بعد اس نسخے میں میرؔ کی مختلف مثنویاں ملتی ہیں۔ان میں مثنوی اجگرنامہ در تنبیہ ہمہ شاعران، مثنوی در ہجو محمد بقا، مثنوی در ہجو آئینہ دار، مثنوی در ہجو شخصے عاقل نام کہ باسگاں میل تمام داشت، مثنوی در ہجو برسات، مثنوی در تعریف سگ وگربہ، مثنوی در ہجو خانہ کہ پسر میرؔ صاحب دراں جا غرق شدہ، مثنوی در ہجو اکول، مثنوی در تعریف خروس، ساقی نامہ، مثنوی مسمّی بہ جوش عشق، دریائے عشق، مثنوی نقل کردن آں درویش با معشوق او مردن ہر دو را، ساقی نامہ میرؔ، مثنوی بخواب و خیال اور شعلۂ شوق شامل ہیں۔.....اس نسخے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مثنوی کسی جاہل کی ہجو میں لکھی گئی تھی، وہ دراصل محمد بقا کی ہجو میں ہے۔..... یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ برسات کے بارے میں میرؔ نے جو ہجو یہ مثنوی لکھی، وہ دراصل اپنے بیٹے کی موت سے متاثر ہو کر لکھی تھی، جو اس مکان میں ڈوب کر مر گیا تھا۔مثنوی دریائے عشق سے قبل وہ فارسی نثر بھی اس نسخے میں موجود ہے جو خود میرؔ نے لکھی تھی اور جس میں دریائے عشق کے قصے کو بیان کیا تھا۔ابھی تک یہ نثر شائع نہیں ہوئی .....مثنویوں کے

بعد اس نسخے میں تین قطعے درج ہیں۔ ایک قطعہ در ہجو اسپ نواب آصف الدولہ بہادر، دوسرا قطعہ در ہجو یک خواجہ سرا ے اور تیسرا قطعہ در بیان صحت آصف الدولہ بہادر''۔[19]

موسومہ کلیات میرؔ (نسخۂ لندن) کے قلمی نسخے کے دوسرے حصے میں میرؔ کے بقیہ دواوین، یعنی دیوان دوم و سوم و چہارم و پنجم و ششم شامل ہیں۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ اس حصہ دوم کی کتابت ۲۲ محرم ۱۲۲۷ھ کو مکمل ہوئی۔ بلوم ہارٹ نے اس نسخے کے مشمولات کی تفصیل یہ دی ہے:

۱۔ دیوان دوم: غزلیات (ورق ۲ب) رباعیات (ورق ۷۵ب)، ہفت بند اور مخمسات (ورق ۸۰ل)، ترجیع بند (ورق ۹۳ل)، مثنویات (ورق ۹۷ل)، مسدسات اور مخمسات (ورق ۱۲۴ل)۔

۲۔ دیوان سوم: غزلیات (ورق ۱۳۲ب) رباعیات (۱۹۲ب)، مثنویات اور چند مرثیے (۱۹۳ ل)۔ ان میں سے تین مثنویوں پر ''شکار نامہ'' کا عنوان ہے جو نواب آصف الدولہ کی شکار مہموں پر مشتمل ہیں۔ اس دیوان کے آخر میں کتابت کی تاریخ ۲۶ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ (مطابق یکم مئی ۱۸۱۰ء) درج ہے۔

۳۔ دیوان چہارم: اصل میں یہ دیوان پنجم ہے۔ غزلیات (۲۲۳ب) کے بعد چند رباعیاں اور قطعے، ترکیب بند اور قصیدہ (ورق ۲۷۸ب)، مثنویات (۲۸۳ب) ہیں۔

۴۔ دیوان پنجم: اصل میں چھٹا دیوان ہے۔ غزلیات (۲۹۵ب) کے بعد رباعیات، قطعات اور کہینؔ تخلص کے شاعر کی مثنوی (ورق ۳۳۹ب) ہیں۔[20]

۵۔ دیوان ششم (۳۴۵ب) اصل میں دیوان چہارم۔ غزلیات کے بعد چند رباعیاں اور مثنویاں (ورق ۳۹۱ب)۔
دیوان کے اختتام پر کتابت کی تاریخ ۲۲ محرم ۱۲۲۷ھ (۶ فروری ۱۸۱۲ء) درج ہے۔[21]

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس نسخے کے بارے میں مزید معلومات دیتے ہوئے لکھا ہے کہ پانچویں دیوان (دراصل دیوان ششم) کے آخر میں کاتب نے اپنا نام سید محمد حسین السبزواری المختاری الحسنی لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بلوم ہارٹ نے یہ عبارت نہیں دیکھی، اس لیے اس نے اس نسخے کے کاتب کا نام نہیں لکھا۔ اس نسخے کے پہلے صفحے پر یہ عبارت درج ہے:

''دیوان دوم و سوم و چہارم و پنجم و ششم میر تقی میرؔ شاعر لکھنوی در نظم اردو۔ کرنیل جارج ولیم ہملٹن صاحب بہادر''۔

یہ عبارت انھی سید زین الدین کے قلم سے ہے جنھوں نے دیوان اول کے نسخے پر نوٹ لکھا تھا۔ اس نسخے میں دیوان دوم کے تحت غزلیات کے بعد ۲۴ رباعیاں، پھر ''ہفت بند و دیگر مناقب'' ہیں۔ مناقب میں پہلے دو مخمسات در مناقب حضرت علیؓ ہیں۔ اس کے بعد مسدس، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں تین مخمس، پھر ایک نعتیہ مسدس، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دو منقبتی مخمس اور ایک ترجیع بند، پھر آصف الدولہ کی مدح میں ایک قصیدہ اور پھر مثنویات شروع ہوتی ہیں۔ مثنویات میں ''ذم الفصول''، جھوٹ کے بارے میں، اپنے حالات میں، منوا بوزنہ کے بارے میں، موہنی بلی کے بارے میں، اپنے عشقیہ معاملات سے متعلق نظم نما مثنویاں شامل ہیں اس کے بعد ایک مسدس، پھر بلاس رائے کی مذمت میں ایک مخمس درج ہے۔ یہ مخمس مطبوعہ نسخوں میں اس عنوان سے شائع نہیں ہوا، یہ عنوان اسی قلمی نسخے میں موجود ہے۔ اسی مخمس پر دیوان دوم ختم ہوتا ہے۔ آخر میں یہ عبارت درج ہے: ''با تمام رسید دیوان دویم میر تقی میرؔ مرحوم''۔

دیوان سوم میں ردیف وار غزلوں کے بعد ۶ رباعیاں، ''شکارنامہ نواب وزیرالمما لک نواب آصف الدولہ''، مثنوی ''مرغ نامہ'' دنیا کے بارے میں ایک مثنوی، پھر دو مرثیے شامل ہیں ۔ اسی پر دیوان سوم کا اختتام ہوتا ہے ۔ آخر میں یہ ترقیمہ درج ہے: ''تمت بالخیر دیوان سوئم میر محمد تقی میر، بست وششم ربیع الاول ۱۲۲۵ ہجری نبوی صلعم''۔

دیوان چہارم (اصل میں دیوان پنجم) میں ردیف وار غزلوں کے بعد چار رباعیاں، چند متفرق اشعار اور چند قطعات ہیں، پھر ایک ترکیب بند، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں قصیدہ، پھر دو مثنویاں شامل ہیں ۔ ان میں آخری مثنوی ''موہنامہ'' ہے اور اس پر اس دیوان کا اختتام ہوتا ہے ۔

پانچویں (اصل میں چھٹے) دیوان کے آخر میں یہ عبارت درج ہے، جس سے کاتب کے نام کا علم ہوتا ہے: ''من متملکات فقیر الحقیر سید محمد حسین السبزواری المختاری الحسنی غفر الذنوبہ وستر عیوبہ''۔

دیوان ششم (دراصل میں دیوان چہارم) میں غزلوں کے بعد چند رباعیاں اور تین مثنویاں شامل ہیں ۔ ان مثنویوں میں ''درصفت نواب وزیرالمما لک نواب آصف الدولہ بہادر''، مثنوی ''درتوصیف عشق'' اور مثنوی ''قصۂ رام پور'' شامل ہیں ۔ اسی پر اس دیوان کا اختتام ہوتا ہے ۔ آخر میں ذیل کا ترقیمہ درج ہے: ''تمت تمام شد بتاریخ بست ودوم محرم الحرام ۱۲۲۷ ہجری نبوی صلعم باتمام رسید۔''[۲۲]

اگرچہ بلوم ہارٹ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان دونوں نسخوں کا تعارف الگ نسخوں کے طور پر کرایا ہے، لیکن بعض شواہد سے میں نے یہ قیاس قائم کیا ہے کہ یہ دونوں نسخے دراصل کلیات میرؔ کے حصے ہیں ۔ تفصیل درج ذیل ہے:

۱) حصۂ اول یا مخطوطے کے نسخۂ اول میں میرؔ کا دیوان اول اور نسخۂ دوم میں میرؔ کے بقیہ پانچوں دیوان کتابت ہوئے ہیں ۔ یہ امر غیر فطری وغیر موزوں ہے اور اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی کہ کلیات میرؔ کے نسخے میں دیوان اول کو چھوڑ کر بقیہ تمام دیوان نقل کیے جائیں ۔ اس لیے اس کا قوی امکان موجود ہے کہ یہ مخطوطہ مکمل کلیات (چھ دواوین) پر مشتمل ہو، جس کا دیوان اول نسخہ اول میں اور بقیہ پانچ دواوین نسخہ دوم میں کتابت کیے گئے ہوں ۔

۲) دونوں نسخوں کی ایک ہی شخص، یعنی کرنل جارج ولیم ہملٹن کے پاس موجودگی بھی اس قیاس کے قائم کرنے کی بڑی وجہ ہے ۔ چونکہ دونوں نسخے کلیات میرؔ کا حصہ ہوں گے، اس لیے کرنل ہملٹن کے پاس یک جا اور اکٹھے پہنچے یا کم سے کم اپریل ۱۸۶۳ء تک یہ دونوں حصے کرنل ہملٹن کے پاس موجود تھے، کیونکہ دونوں کے آغاز میں سید زین الدین کے تحریر کردہ نوٹس ملتے ہیں ۔

۳) دونوں نسخوں کی ظاہری تفصیلات میں بھی کوئی خاص بُعد نہیں ۔ دونوں کا ناپ (۱۰×۶ ۱/۴ ۔ ۱۲×۷ ۱/۲)، سطور کی لمبائی (۴ ۱/۴″ ۔ ۴ ۳/۴″) اور تعداد سطور (۱۹ ۔ ۱۷) میں زیادہ فرق نہیں ۔ دونوں حصوں کی کتابت بھی نستعلیق خط میں کی گئی ہے ۔ ان لوازمات سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کہ دونوں ایک ہی نسخے کے دو حصے ہیں ۔ ناپ اور سطور وغیرہ میں تھوڑا بہت فرق پیدا ہونا بدیہی ہے، کیوں کہ دونوں مطبوعہ نہیں بلکہ قلمی نسخے ہیں ۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دونوں حصے ایک ہی قلمی نسخے سے متعلق ہیں تو کاتب نے علیحدہ علیحدہ کتابت کرنے کے بجائے دونوں نسخوں کے متن کو ایک ہی جلد میں کیوں نہیں لکھا؟ ایسا غالباً مخطوطے کی ضخامت بڑھ جانے کے سبب نہیں کیا گیا ہوگا ۔ مثال کے طور پر کلیات میرؔ کے نسخۂ بارکر رملائنشیا کو پیش نظر رکھا جا سکتا ہے، جس کے کاتب نے کلیات میرؔ تین جلدوں میں کتابت

کیا۔اسی طرح کلیات کے نسخۂ کلکتہ(۱)اور نسخۂ کلکتہ(۲) بھی دو دو جلدوں میں منقسم ہیں۔

اس مقام پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ برٹش لائبریری کے ان دونوں نسخوں کو کلیات کا حصہ متصور کرنے کا محض قیاس قائم کیا گیا ہے۔دونوں نسخے پیش نظر ہوتے تو زیادہ بہتر طور پر فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔

کلیات کے اس نسخے کے حصہ دوم میں دو جگہ کتابت کی تاریخ درج کی گئی ہے۔دیوان سوم کے آخر میں اور نسخے میں شامل آخری دیوان کے خاتمے پر۔دیوان سوم کے اختتام پر کاتب نے ۲۶ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ کی تاریخ لکھی ہے، گویا دیوان سوم کی کتابت اس تاریخ کو مکمل ہوئی۔میر کا انتقال ۲۰ رشعبان ۱۲۲۵ھ (۲۰ رستمبر ۱۸۱۰ء) کو ہوا۔[۲۳] اس سے معلوم ہوا کہ اس نسخے میں دیوان سوم تک کی کتابت میر کی حین حیات مکمل ہو چکی تھی اور میر کی وفات کے وقت کاتب امکانی طور پر دیوان چہارم کی کتابت کر رہا تھا۔مخطوطے کے اختتام پر تکمیل کتابت کی تاریخ ۲۲ محرم ۱۲۲۷ھ (۶ فروری ۱۸۱۲ء) درج ہے، گویا اس مخطوطے کی کتابت وفات میر کے بعد مکمل ہوئی۔

مخطوطے میں درج مذکورہ بالا دونوں تاریخوں کی مدد سے مخطوطے کے آغاز کتابت کی تاریخ کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ہمیں معلوم ہے کہ اس نسخے میں شامل میر کے دیوان دوم اور سوم کی کتابت ۲۶ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ کو مکمل ہوئی جبکہ مخطوطے میں شامل میر کے بقیہ تینوں دواوین (چہارم، پنجم، ششم) اس کے ایک سال تقریباً دس ماہ بعد ۲۲ محرم ۱۲۲۷ھ (۶ رفروری ۱۸۱۲ء) کو کتابت ہوئے۔بلوم ہارٹ نے مخطوطے میں شامل ہر دیوان کی ضخامت درج کر دی ہے، جس سے یہ اندازہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے کہ کتنی ضخامت کے دیوان کی کتابت میں کاتب کو کتنا وقت صرف کرنا پڑا ہوگا۔مخطوطے میں شامل پانچوں دواوین کی ضخامت بلوم ہارٹ کے مطابق درج ذیل ہے:[۲۴]

۱۔ دیوان دوم	ورق ۲ ب تا ۱۳۲ ا	=۱۳۰ ورق
۲۔ دیوان سوم	ورق ۱۳۲ ب تا ۲۲۳ ا	=۹۱ ورق
۳۔ دیوان پنجم	ورق ۲۲۳ ب تا ۲۹۵ ا	=۷۲ ورق
۴۔ دیوان ششم	ورق ۲۹۵ ب تا ۳۴۵ ا	=۵۰ ورق
۵۔ دیوان چہارم	ورق ۳۴۵ ب تا ۴۰۴	=۵۹ ورق

درج بالا گوشوارے سے علم ہوا کہ دیوان دوم وسوم کی مجموعی ضخامت ۱۳۰+۹۱=۲۲۱ ورق ہے، جو مخطوطے کی مجموعی ضخامت (۴۰۴ ورق) کے نصف (۴۰۴÷۲=۲۰۲ ورق) سے بھی زائد ہے، جبکہ مخطوطے میں شامل بقیہ تینوں دواوین (پنجم، ششم، چہارم) کی مجموعی ضخامت ۷۲+۵۰+۵۹=۱۸۱ ورق بنتی ہے، جو مخطوطے کی مجموعی ضخامت کے نصف (۴۰۴÷۲=۲۰۲ ورق) سے کافی کم ہے۔جب کم ضخامت (۱۸۱ ورق) کے تین دواوین ۲۶ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ کے بعد سے ۲۲ محرم ۱۲۲۷ھ تک تقریباً ایک سال دس ماہ میں کتابت ہوئے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زیادہ ضخامت (۲۲۱ ورق) کے دو دواوین کی کتابت میں کاتب کو دو سال سے کچھ زیادہ کا عرصہ لگا ہوگا۔یوں قیاسی طور پر اس مخطوطہ دوم کے آغاز کتابت کا زمانہ اوائل ۱۲۲۳ھ (اوائل ۱۸۰۸ء) قیاس کیا جا سکتا ہے۔[۲۵]

اب تک کی معلومات کے مطابق یہ کلیات میر کا واحد نسخہ ہے، جس کی کتابت حین حیات میر شروع ہوئی اور تکمیل وفات میر کے بعد ہوئی، یوں یہ نسخہ حیات میر کا آخری مکتوبہ نسخہ اور وفات میر کے بعد پہلا مکتوبہ نسخہ بن جاتا ہے۔اس کی اہمیت محتاج بیان نہیں۔کلیات میر کی تدوین جدید میں اس نسخے کا پیش نظر رہنا از حد ضروری بدرجہ لازمی ہے۔

(۴) نسخۂ رام پور۔اول

کتب خانۂ رضائیہ یا رضا لائبریری رام پور میں کلیاتِ میر کے دو نسخے موجود ہیں۔ان میں سے ایک اہم ترین نسخے کا تعارف مولانا امتیاز علی عرشی نے کرایا تھا۔[۲۶] اس تعارف سے کلیات کے اس نسخے کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس نسخے کا فہرست نمبر ۱۷۶۱ اور کتاب نمبر ۹۱۷ ہے۔[۲۷] عرشی صاحب کے مطابق کلیاتِ میر کا یہ نسخہ اچھی حالت میں ہے۔ یہ ضخیم ترین نسخہ کل ۸۲۳ اوراق پر مشتمل ہے۔مسطر فل اسکیپ ناپ کا ۱۷ اسطری ہے۔ نسخے پر اگرچہ کرم خوردگی کے آثار ہیں لیکن متن مکمل طور پر محفوظ ہے۔یہ نسخہ خاصے اہتمام سے تیار کیا گیا ہے۔''ذکرِ میر'' کے سوا اس مخطوطے میں شامل میر کی ہر تصنیف کے شروع میں طلائی لوح اور پورے مخطوطے میں رنگین جدول کھینچی گئی ہے۔

عرشی صاحب کے مطابق اس مخطوطے میں دیوان اول کے خاتمے پر ذیل کا ترقیمہ ملتا ہے:

''دیوان اول میں تصنیف میر محمد تقی صاحب بتاریخ بیست وہفتم شہر رمضان سنہ یک ہزار ودوصد وچہل وپنج ہجری۔بخط بد ربط فقیر حقیر پُر تقصیر بندہ شیخ لطف علی حیدری، حسب فرمایش مرزا صاحب کرم گستر مرزا قنبر علی صاحب دام اشفاقہٗ اختتام پذیرفت''۔

اسی طرح مخطوطے کے اختتام پر ذیل کا ترقیمہ درج ہے:

الحمد للہ کہ بفضل ایزد مستعان وعنایات ائمہ علیہ الصلوٰت والسلام کہ کلیات میر محمد تقی صاحب غفر اللہ ذنوبہ بتاریخ سلخ شہر رمضان المبارک سنہ کی ہزار ودوصد وچہل وشش ہجری بروز دوشنبہ یک پاس روز باقی ماندہ از خط بد ربط احقر العباد شیخ لطف علی حیدری بپاس خاطر وفرمایش مرزا قنبر علی صاحب زاد اشفاقہٗ صورت اختتام پذیرفت''۔

ان ترقیموں سے معلوم ہوا کہ اس مخطوطے کی کتابت شیخ لطف علی حیدری نے مرزا قنبر علی کے لیے کی۔اس قلمی نسخے میں میر کی درج ذیل تصانیف کے متون کتابت ہوئے ہیں:

فارسی = دیوان میر، فیض میر، ذکر میر

اردو = دیوان اول تا دیوان ششم (مکمل چھ دواوین)

عرشی صاحب نے واضح کیا ہے کہ مخطوطے میں شامل ''ذکر میر'' کا متن اس کی روایت اول کے مطابق ہے، جو میر نے پچاس سال کی عمر میں لکھا تھا۔اس متن کے آخر میں بقدر ایک صفحے کے وہ عبارت بھی موجود ہے، جو دوسری روایت یا نظر ثانی میں میر نے نکال دی تھی۔

عرشی صاحب نے نشان دہی کی ہے کہ اس مخطوطے میں دیوان اول ورق ۲۴۷ ب پر ختم ہوتا ہے۔اس کے علاوہ کسی صاحب ذوق نے میر کے اردو دیوان اول، دیوان دوم اور دیوان سوم کی ردیف لام تک کے متن کو نشان زد کر کے، جگہ جگہ بین السطور اور حاشیوں میں الفاظ ومحاورات کے معنی، مصرعوں اور شعروں کی تشریح اور متبادل الفاظ درج کیے ہیں۔جن میں سے اکثر اختلاف نسخ کی حیثیت رکھتے ہیں، نیز میر صاحب کے بہت سے لفظوں کے عیوب گنائے اور ان کی جگہ مناسب لفظ بھی اپنی طرف سے تجویز کیے ہیں ...... یہ سب کچھ فارسی زبان میں کیا گیا ہے۔''اس کے علاوہ ان صاحب نے ایسے اشعار حاشیوں میں اضافہ بھی کیے

ہیں جو کسی سبب کاتب سے چھوٹ گئے تھے۔

عرشی صاحب نے اس نسخے کے متن سے متعلق یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ ''ہمارے نسخے میں کچھ نظم ونثر مطبوعہ سے زائد بھی ہے''۔اس سے معلوم ہوا کہ کلیات کا یہ نسخہ میرؔ کے کچھ نہ کچھ غیر مطبوعہ وغیر مدون کلام کے سلسلے میں اہم ہے۔

مذکورہ بالا دونوں تر قیموں کی بنیاد پر عرشی صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''ان دونوں تحریروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ لطف علی حیدری (غالباً بمعنی شیعی) نے مرزا قمبر علی صاحب کے لیے ایک برس اور دو یا تین دن میں اسے لکھا اور ۲۹ رمضان ۱۲۴۶ھ (۱۲ مارچ ۱۸۳۱ء) اس کی تاریخ اختتام تھی''۔[۲۸]

عرشی صاحب نے ''ایک برس اور دو یا تین دن'' کا نتیجہ اس حساب سے نکالا کہ اس مخطوطے میں میرؔ کے دیوان اول کے اختتام پر تاریخ کتابت ۲۷ رمضان ۱۲۴۵ھ/ (۲۲ مارچ ۱۸۳۰ء) لکھی ہے جبکہ مخطوطے کے اختتام پر تاریخ تکمیل کتابت ۲۹ یا ۳۰ رمضان ۱۲۴۶ھ درج ہے۔یوں دونوں تاریخوں کا زمانی بُعد ایک سال دو یا تین دن ہی بنتا ہے۔لیکن یہ درست نہیں کہ پورا مخطوطہ اتنے عرصے میں کتابت ہوا۔عرشی صاحب نے غور نہیں کیا، ورنہ یہ ذہن میں ضرور رکھتے کہ ۲۹ رمضان ۱۲۴۵ھ دیوان اول کے اختتام کی تاریخ ہے، یعنی اس تاریخ تک کاتب مخطوطے کے ۲۴۷ ورق کتابت کر چکا تھا۔جو مخطوطے کی کل ضخامت کا تیس فی صد ہے۔چنانچہ ایک سال اور دو یا تین دن میں کاتب نے مخطوطے کے ورق ۲۴۸ (تا آخر، یعنی کل ۵۷۶ اوراق کتابت کیے۔اس طرح یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کاتب اگر مخطوطے کا ستر فی صد حصہ ایک سال میں کتابت کرتا ہے تو اسے ابتدائی تیس فی صد حصہ کتابت کرنے میں کم وبیش پانچ ماہ ضرور لگے ہوں گے۔اس حساب سے قیاساً اس نے مخطوطہ ہذا کی کتابت کا آغاز اواخر ربیع الاول یا اوائل جمادی الاول ۱۲۴۵ء (مطابق نومبر ۱۸۲۹ء) میں کیا ہوگا اور پورے مخطوطے کی کتابت میں اسے کم وبیش ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا ہو گا۔اتنے کم عرصے میں ۸۲۳ اوراق کے ضخیم ترین مخطوطے کی کتابت کرنے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شیخ لطف علی حیدری پیشہ ور اور مشاق کاتب رہے ہوں گے۔ اسے یوں بھی تقویت ملتی ہے کہ بقول عرشی صاحب یہ نسخہ خاصے اہتمام سے تیار کرایا گیا ہے، اس لیے ظاہر اس مقصد کے لیے کسی اچھے کاتب کی خدمات ہی حاصل کی گئی ہوں گی۔

کلیات میرؔ کے اس نسخۂ رام پور میں ''نکات الشعرا'' کے سوا میرؔ کی تقریباً تمام فارسی و اردو تصانیف نقل ہوئی ہیں[۲۹]۔ اس سے یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ اس نسخے میں میرؔ کا نسبتاً مکمل اور مستند کلام نقل ہوا ہوگا۔اس کے علاوہ عرشی صاحب نے یہ نشان دہی بھی کی ہے کہ اس نسخے میں مطبوعہ سے کچھ کلام زیادہ بھی ہے۔اسی زائد کلام میں سے کچھ شعر اور مثنوی ''دریائے عشق'' کی غیر مطبوعہ فارسی نثر عرشی صاحب نے اپنے مضمون میں نقل بھی کی ہے۔ان خصوصیات کے باعث کلیات میرؔ کا نسخہ رام پور (اول) بنیادی اہمیت کا حامل ٹھہرتا ہے۔کلیات میرؔ کی تدوین جدید میں اس نسخے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

(۴) نسخۂ ندوہ

ندوۃ العلما شبلی اکیڈمی لکھنو میں کلیات میرؔ کا ایک نادر نسخہ محفوظ ہے۔اس نسخے کا لائبریری نمبر ۵۸۹ ہے۔۱۴۵۰ اوراق پر مشتمل اس قلمی نسخے کا ناپ ۱۱×۹ ہے اور مسطر ۲۰ سطری ہے۔یہ اہم قلمی نسخہ وفات میرؔ کے تیرہ (۱۳) سال بعد ۱۲۳۸ھ میں مکمل ہوا۔[۳۰] ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے اس نسخے کی کچھ تفصیلات اپنے مضمون میں دی ہیں۔ان کے مطابق کلیات کے اس نسخے کی ابتدا میں

''قصائد درنعت وغیرہ ہیں'' پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ ،حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور نواب آصف الدولہ کے مدحیہ قصائد ہیں ۔ یہ تمام قصائد آٹھ اوراق پر مشتمل ہیں ۔قصائد کے بعد میرؔ کا دیوان اول شروع ہوتا ہے جو ورق ۱۲۱ ب پر ختم ہوتا ہے ۔اس کے بعد ترقیمے کی درج ذیل عبارت ہے:

''تمام شد دیوان اول میر تقی عفی اللہ عنہ ۱۳ جمادی الاول ۱۲۳۸ھ مطابق ۲۶ جنوری ۱۸۲۳ء یوم یک شنبہ''۔اس کے بعد دیوان دوم ہے جو ۹۱ اوراق پر مشتمل ہے ۔اس کے آخر میں یہ ترقیمہ ہے:

''تحت دیوان دوم بعونہ تعالیٰ بتاریخ ۱۶ جمادی الاول''۔

اس ترقیمے سے واضح ہوتا ہے کہ کاتب نے اس دیوان دوم کے ۹۱ ورق محض تین دن میں کتابت کیے۔دیوان دوم کے بعد دیوان سوم ،دیوان چہارم اور دیوان پنجم کتابت ہوئے ہیں ۔دیوان پنجم کا ترقیمہ حسب ذیل ہے:

''تمام شد دیوان پنجم من تصنیف میر تقی عفی اللہ عنہ بتاریخ بیجدہم جمادی الاول ۱۲۳۸ھ مطابق ۳۰ جنوری ۱۸۲۳ء یوم جمعہ''۔

اس ترقیمے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے میرؔ کے دواوین سوم و چہارم و پنجم ،یعنی تین دواوین محض ایک یا دو دن میں کتابت کر لیے ۔اس سے کاتب کی ہوش ربا رفتار کتابت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔اس کے بعد مخطوطہ ہذا میں میرؔ کا دیوان ششم کتابت ہوا ہے، جس کے آخر میں ذیل کا ترقیمہ درج ہے:

''تمت دیوان ششم میر تقی علیہ الرحمۃ بتاریخ بیست و دوم جمادی الآخر ۱۲۳۸ھ''۔

حیرت ہے کہ صبا رفتار کاتب نے آخری، یعنی دیوان ششم کی کتابت میں ایک ماہ اور پانچ چھ دن لگا دیے، حالانکہ اس دیوان کی ضخامت میرؔ کے بقیہ دواوین کی نسبت بہت کم ہے ۔اس سے قبل یہی کاتب میرؔ کا دیوان سوم ، دیوان چہارم اور دیوان پنجم محض ایک یا دو دن میں کتابت کر چکا تھا ۔حالانکہ ان تینوں دواوین کی ضخامت دیوان ششم سے کم و بیش چار گنا زیادہ ہوتی ہے ۔

دیوان ششم کے بعد ۵۵ ۔اوراق میں مثنویاں اور اگلے ۵۵ ۔اوراق میں فردیات ، رباعیات ، ترکیب بند، مخمسات ، مناقب اور آصف الدولہ کا مدحیہ قصیدہ کتابت ہوئے ہیں ۔کلیات کے اختتام پر ''ہجو خواجہ سرائے'' ہے[۳۱]۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نسخے کا کاتب کافی زیادہ مشاق اور پیشہ ور ہوگا ۔اس کی رفتار کتابت فطری رفتار کتابت سے کہیں زیادہ ہے ۔اس نے اس مخطوطے میں شامل میرؔ کے دیوان اول کی کتابت ۱۳ جمادی الاول ۱۲۳۸ھ/ ۲۶ جنوری ۱۸۲۳ء کو مکمل کی اور پھر اگلے چار دواوین: دیوان دوم وسوم و چہارم و پنجم کی کتابت اگلے چار پانچ روز میں ۱۷ جمادی الاول ۱۲۳۸ھ/۳۰ جنوری ۱۸۲۳ء کو مکمل کر لی ۔اگرچہ اس نے آخری، یعنی دیوان ششم کی کتابت میں اپنی روایتی رفتار سے کام نہیں لیا لیکن شروع کے پانچ دواوین کی کتابت میں اس کی رفتار کتابت طوفانی رہی ہے ۔اسی رفتار کے پیش نظر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اس مخطوطے کی کتابت کا آغاز جمادی الاول ۱۲۳۸ھ کے ربع دوم کے شروع میں کیا ہوگا، یعنی دیوان اول کے اختتام کتابت ۱۳ جمادی الاول ۱۲۳۸ھ سے ایک یا دو یا تین دن قبل ۔

کلیات میرؔ کا یہ نسخہ ندوہ، وفات میرؔ کے محض تیرہ سال بعد کا کتابت شدہ ہے اور مکانی حد تک میرؔ کے کسی معاصر یا قریبی عہد کے نسخے کی نقل ہے ۔اس میں میرؔ کے چھ دیوان اور دیگر کلام بھی شامل ہے ۔مصنف کے قریبی عہد اور میرؔ کے نسبتاً مکمل کلام (دیوان ہفتم کو چھوڑ کر) کی شمولیت کے سبب کلیات میرؔ کی تدوین جدید میں اس نسخے کا پیش نظر رہنا بھی از حد ضروری بمنزلہ لازمی ہے ۔

۵۔ نسخۂ علی گڑھ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں کلیاتِ میرؔ کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اس کا فہرست نمبر ۵۹۰ اور کتاب نمبر ۴۵۳ں ہے۔ فی صفحہ سترہ سطور اور کل ضخامت ۴۰۳ ورق ہے۔[۴۲]

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے اس نسخے کا تعارف کراتے ہوئے واضح کیا ہے کہ اس مخطوطے میں کل ۳۹۵ ورق ہیں۔ یہ مخطوطہ ناقص الاوسط ہے۔ مخطوطے کے درمیان سے نو اوراق غائب ہیں۔ اگر وہ اوراق موجود ہوتے تو مخطوطے کی مجموعی ضخامت ۴۰۴ ورق ہوتی۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے اس مخطوطے سے متعلق مزید معلومات دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مخطوطے کی پیمائش ۲/۱ ۱۲×۸ اور متن کی تقطیع مع جدول ۱۰×۵ ہے۔ مخطوطے میں دیسی چکنا بادامی کاغذ استعمال ہوا ہے۔ مخطوطے کا سال کتابت ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء، یعنی وفاتِ میرؔ سے دو سال قبل کا ہے۔

اس مخطوطے میں میرؔ کے پانچ دواوین اور کچھ دوسرا کلام شامل ہے۔ یہ پانچ دواوین، دیوان دوم، سوم، چہارم پنجم اور ششم ہیں۔ دیوان دوم کا اختتام ورق ۱۴۳ الف پر ہوتا ہے۔ اس کا ترقیمہ یہ ہے:

''تمام شد نسخہ دیوان میر تقی صاحب بتاریخ بست و چہارم ربیع الاول ۱۲۲۳ھ''۔

اس دیوان دوم کا اختتام ایک ہجویہ مخمس پر ہوتا ہے۔ ورق ۱۴۴ الف بیاض الاصل ہے۔ ورق ۱۴۴ ب سے دیوان سوم کا آغاز ہوتا ہے اور یہ دیوان ۲۳۳ ب پر ختم ہوتا ہے۔ دیوان سوم کا اختتام حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مربع مرثیے پر ہوتا ہے۔ ورق ۲۳۴ الف بھی بیاض الاصل ہے اور یوں دیوان چہارم ورق ۲۳۴ ب سے شروع ہو کر ورق ۲۹۲ الف پر ختم ہوتا ہے۔ ورق ۲۹۲ ب تا ۲۹۳ ب سادہ ہیں۔ ورق ۲۹۴ الف بیاض الاصل ہے اور ورق ۲۹۴ ب سے دیوان پنجم کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دیوان میں ورق ۳۳۶ اور آخری، یعنی ورق ۳۶۱ موجود نہیں۔ ورق ۳۶۲ الف بھی بیاض الاصل ہے اور دیوان ششم کا آغاز ورق ۳۶۲ ب سے ہوتا ہے۔ اسی دیوان میں ورق ۳۸۵ کے بعد آٹھ اوراق، یعنی ورق ۳۹۳ تک موجود نہیں، جس کے باعث نسخے سے دیوان ششم کا اتنا متن ضائع ہو گیا ہے۔ دیوان ششم ورق ۴۰۳ الف پر ختم ہوتا ہے نسخے کے آخر میں بغیر عنوان کے دو مثنویاں ہیں۔

کلیاتِ میرؔ کے اس نسخے پر جلال الدین مہدی علی خاں بہادر شجاعت جنگ ۱۲۱۳ ہجری کی متعدد مہریں ثبت ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کے مطابق یہ مہدی علی خاں، مہدی تخلص، نواب سعادت علی خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے مفصل حالات ریاض الفصحا کے ص ۲۸۳ پر درج ہیں۔[۴۳] اس سے معلوم ہوا کہ یہ نسخہ نواب اودھ کے بیٹے نے تیار کرایا اور بہت حد تک امکان ہے کہ یہ نسخہ شاہان اودھ کے کتب خانے سے تعلق رکھتا ہو۔

کلیات کے اس نسخے میں میرؔ کے دیوان دوم تا ششم کتابت ہوئے ہیں۔ ممکن ہے نسخۂ لندن کی طرح کلیات کا یہ نسخہ بھی دو جلدوں پر مشتمل ہو جس کی جلد اول میں میرؔ کا دیوان اول کتابت ہوا ہو اور امتداد زمانہ سے وہ دیوان اول یا تو کہیں گم ہو گیا ہو یا ضائع ہو چکا ہو۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے زیر بحث نسخہ کلیاتِ میرؔ سے ہی اس امر کا اندازہ قائم کیا ہے کہ میرؔ کا دیوان ششم اس نسخے کی کتابت ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء سے قبل مکمل ہو چکا تھا۔[۴۴] بہرحال، یہ نسخہ میرؔ کی حین حیات تیار ہونے والا دوسرا اہم نسخہ ہے۔ کلیاتِ میرؔ کی تحقیقی تدوین میں اس نسخے کا پیش نظر رہنا اور اختلاف نسخ میں اسے استعمال کرنا ضروری ہے۔ یہ نسخہ شاہ اودھ کے بیٹے نے تیار کرایا۔ اس

وقت میرؔ بھی لکھنو میں موجود تھے، اس لیے امکان ہے کہ شاہان اودھ سے اپنے تعلق کی بناپر اس نسخے کی تیاری میں میرؔ نے کسی حدتک حصہ لیا ہو۔ یوں اس نسخے کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔

(۲) نسخۂ آصفیہ

کتب خانہ آصفیہ/ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد دکن میں کلیات میرؔ کا قلمی نسخہ موجود ہے۔ فہرست نگار کے مطابق اس کا فہرست نمبر ۱۲۶ اور نمبر دواوین ۹۶ ہے اور ۸/۱۸×۸ سائز کا یہ نسخہ ۷۳۱ صفحات پر مشتمل ہے، خط نستعلیق میں فی صفحہ ۱۱ تا ۱۵ سطور کتابت کی گئی ہیں۔ فہرست نگار نے اس نسخے کا یہ ترقیمہ نقل کیا ہے:

''تمت بالخیر بعون الملک وہاب بدستخط ذوالفقار علی باتمام رسید۔ دیوان کلیات میرؔ تقی سلّمہٗ اللہ تعالیٰ'' فہرست نگار کے مطابق اس نسخے کا آغاز و اختتام درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

آغاز: تھا مستعار حسن سے اوس کی جو نور تھا — خورشید میں بھی او سہی کا ذرہ ظہور تھا

اختتام: حق میرؔ یہی تھا دے مردود سارے باطل — پردہ اٹھا دیا تھا اوس قوم بے حیا کا[۳۵]

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے اس نسخے کے متعلق کچھ مزید تفصیلات مہیا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کلیات کے اس نسخے میں پہلے ردیف وار غزلیں، پھر تین مخمس، دو مسدس، منقبت، مخمس درحال لشکر، رباعیات، فردیات، مثنویات ہیں اور آخر میں مرثیے اور سلام کتابت ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے اس نسخے کا جو ترقیمہ نقل کیا ہے، اس کے متن اور فہرست نگار نصیر الدین ہاشمی کے منقولہ متن ترقیمہ میں دو لفظی اختلاف بھی ملتے ہیں، جو زیادہ اہم نہیں۔ یہ اختلاف درج ذیل ہیں:

''تمت بالخیر بعون الملک الوہاب ......دیوان کلیات میرؔ سلّمہٗ اللہ تعالیٰ''۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے نسخے کے اختتام کا جو شعر نقل کیا ہے، وہ بھی فہرست نگار کے منقولہ شعر سے مختلف ہے۔ شعر یہ ہے:

ع آیت حجاب کی تھی شانوں میں جس کی نازل — سر ننگے پابرہنہ لائے انھوں کو جاہل[۳۶]

کلیات کا یہ نسخہ بعض وجوہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اول: ترقیمے میں ''سلّمہٗ اللہ تعالیٰ'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخطوطے کی کتابت حین حیات میرؔ ہوئی ہے۔ دوسرے: اکبر حیدری کاشمیری نے اس نسخے سے بیسیوں غیر مطبوعہ اشعار نقل کیے ہیں[۳۷] جس سے علم ہوتا ہے کہ اس نسخے میں کافی غیر مدون کلام موجود ہے۔ ان وجوہ سے کلیات میرؔ کی تحقیقی تدوین میں اس نسخے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، لیکن یہ حرف آخر نہیں۔

اس نسخے میں سنہ کتابت مذکور نہیں۔ اگر چہ یہ معلوم ہے کہ یہ نسخہ میرؔ کی زندگی میں کتابت ہوا، لیکن یہ واضح نہیں کہ وفات میرؔ سے کتنا عرصہ پہلے کتابت ہوا۔ اپنی وفات سے ڈیڑھ دو سال قبل میرؔ نے اپنا چھٹا دیوان مرتب کیا اور دیوان ہفتم یا دیوانچے کی تالیف کا آغاز ہوا۔ اگر یہ نسخہ وفات میرؔ کے قریبی زمانے کا مکتوبہ ہے تو اس میں مذکورہ دیوانچے کا کچھ کلام بھی شامل ہونا چاہیے اور ایسی صورت میں یہ نسخہ نہایت درجہ اہمیت حاصل کر جاتا ہے، لیکن اگر یہ نسخہ چھٹے دیوان کی تکمیل سے قبل کے زمانے کا مکتوبہ ہے تو اس کی اہمیت قدرے کم ہو جاتی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ میرؔ کا دیوان ہفتم یا دیوانچہ از حد کم یاب ہے اور کلام میرؔ کے نصف صد سے زائد مخطوطات میں سے محض دو تین میں ہی پایا جاتا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے اس نسخے کے بارے میں جو معلومات مہیا کی ہیں وہ ناکافی ہیں۔ اس نسخے سے متعلق ضروری تفصیلات حاصل ہوتیں تو اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا صحیح طور پر اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

(۷) نسخۂ کلکتہ (اول)

ایشیاٹک سوسائٹی (بنگال) کلکتہ میں محفوظ اردو مخطوطات کی سرسری فہرست آں جہانی شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے شائع کرائی تھی [۳۸] اس فہرست میں ''کلیات میرؔ'' کے ایک قلمی نسخے مکتوبہ ۱۲۱۲ھ کا اندراج ملتا ہے۔ اس اندراج سے محض اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کے ''سوسائٹی کلکشن'' میں حوالہ نمبر ۲۵ کے تحت کلیات میر تقی کا نسخہ موجود ہے جو ۱۲۱۲ھ کا مکتوبہ اور چار جلدوں پر مشتمل ہے [۳۹]۔ امریکا میں مقیم اردو اور انگریزی کے معروف ادیب ''پروفیسر چودھری محمد نعیم (شکاگو)'' نے میرؔ سے منسوب مثنوی ''گنجینۂ راز'' پر اپنے تحقیقی مضمون [۴۰] کے حاشیے میں ایشیاٹک سوسائٹی کے مذکورہ بالا قلمی نسخے کی تفصیلات قلم بند کی ہیں [۴۱]۔ انھوں نے واضح کیا ہے کہ یہ چار جلدیں ایک مخطوطے کی نہیں بلکہ دو دو جلدوں پر مشتمل 'کلیات میرؔ' کے دو قلمی نسخوں کی ہیں جن کو غلطی سے ایک نمبر دے دیا گیا ہے۔ البتہ ان کے اوراق پر جو نمبر بعد میں دیے گئے ہیں وہ الگ الگ اور صحیح ہیں''۔ [۴۲]

ان میں سے پہلی دو جلدوں پر مشتمل پہلے نسخے میں کل ۸۶۵ ورق ہیں۔ پہلی جلد میں ۴۹۸ اور دوسری میں ۴۶۷ ورق ہیں۔ دونوں جلدیں فولیو، یعنی فل اسکیپ سائز میں ہیں۔ ان جلدوں کے اول و آخر صفحات پر فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی مہریں ثبت ہیں۔ اس سے ان نسخوں کی قدامت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چودھری محمد نعیم کے مطابق یہ وہی نسخہ ہے، جسے بنیاد بنا کر فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے ''کلیات میرؔ'' ترتیب دیا۔ اس نسخے کے حاشیوں میں جا بجا اضافے اور متن میں جگہ جگہ تصحیحات موجود ہیں۔ اضافوں اور تصحیحات کا سوا خط یکساں نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل کئی افراد نے کیا ہے۔ اس نسخے کا کاغذ ہنوز بہت عمدہ ہے۔ نسخے کی کتابت صاف اور نستعلیق خط میں کی گئی ہے۔ سرورق کی لوح گل بوٹوں سے مزین ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خاصے اہتمام سے تیار کیا گیا ہے۔ نسخے میں دو جگہ ترقیمہ درج ہوا ہے۔ دیوان چہارم کے اختتام پر ذیل کا ترقیمہ ہے (ورق ۱۵۷ ب):

''جلد اول از کلیات میر تقی زاد اللہ قدرہ و منزلہ از دست احقر العبا محمد امین بیگ ساکن دہلی اتمام یافت''۔

ورق ۸۶۵ (پر دوسرا اور نسبتاً مکمل ترقیمہ درج ذیل ہے:

''تمت تمام شد کلیات میرؔ برای خاطر داشت محمد خاں صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ از دست احقر العبا محمد امین بیگ ساکن دہلی در ۱۲۱۲ھ اتمام یافت:

ہے کریم از کرم دساں بہ بہشت ہر کہ گفت ہر کہ خواند ہر کہ نوشت''۔

صاحب مضمون نے کلیات کے اس نسخے کے اہم مشمولات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جلد اول کے شروع میں قصائد ہیں، پھر دیوان اول کی غزلیات کتابت ہوئی ہیں، پھر دیگر اصناف مثلاً ہفت بند، مخمس وغیرہ کا کلام ہے۔ اس کے بعد دیوان دوم اور سوم کتابت ہوئے ہیں۔ جلد دوم کی ابتدا میں رباعیات درج ہیں۔ پھر مثنویات شکارنامہ ہیں اور پھر کثیر تعداد میں مراثی۔ اس کے بعد دیوان چہارم ہے جو جملہ اصناف سخن کا حامل ہے''۔ اس کے بعد ''دیوان پنجم'' کے عنوان کے تحت میرؔ کا فارسی دیوان نقل ہوا ہے۔ اس فارسی دیوان میں غزلیات کے بعد دو طویل فارسی مثنویاں ہیں۔ نثر کے حصے میں ''فیض میرؔ'' اور مثنوی ''دریاے عشق'' کی فارسی نثر شامل ہیں۔ اسی پر اس کلیات کے متن کا اختتام ہوتا ہے۔ [۴۳]

''کلیات میرؔ'' کے اس زیر بحث نسخے کی مدد سے کلام میرؔ سے متعلق درج ذیل امور کی صراحت ہوتی ہے:

(۱) یہ نسخہ ۱۲۱۲ھ (۹۸-۱۷۹۷ء) کا مکتوبہ ہے اور اس میں میرؔ کے چار دواوین کتابت ہوئے ہیں لیکن دیوان پنجم کے کسی کلام کی

نشان دہی مضمون نگار نے نہیں کی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نسخے کی کتابت کے وقت (۱۲۱۲ھ/۹۸_۱۷۹۷ء) میر کا دیوان پنجم ابھی متشکل نہیں ہوا تھا۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں میر کے دیوان چہارم کی تکمیل کا اندازہ ۱۲۰۹ھ تک اور دیوان پنجم کی تکمیل کا اندازہ ۱۲۱۳ھ تک قائم کیا ہے۔[۴۴] اگر ۱۲۱۳ھ میں دیوان پنجم کی تکمیل قیاس کی جائے تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اس سے محض (زیادہ سے زیادہ) ایک سال قبل دیوان پنجم کا معتد بہ حصہ معرض تخلیق میں آچکا ہوگا۔ایسی صورت میں سب نہ سہی، میر کے اس دیوان پنجم کا کچھ نہ کچھ حصہ زیر بحث مخطوطے میں ضرور شامل ہوتا، خصوصاً اس صورت میں کہ یہ نسخہ خاصے اہتمام سے تیار کیا گیا ہے۔اس سے یہ اندازہ قائم کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ میر کا دیوان پنجم ۱۲۱۲ھ کے کافی عرصے بعد مکمل ہوا۔یہاں اس سلسلے میں طوالت کے خوف سے مزید بحث سے گریز کیا جاتا ہے۔ان شاءاللہ میر کے دواوین کی تواریخ تکمیل پر علیحدہ سے تحقیقی مقالہ لکھوں گا جس میں یہ ساری بحثیں اور شواہد ہوں گے۔

(۲) اس نسخے میں میر سے منسوب کافی مراثی نقل ہوئے ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۱۲ھ سے قبل مراثی میر کا معتد بہ حصہ موجود تھا۔میر سے منسوب مراثی ہنوز تحقیق طلب ہیں۔ان مراثی کا مجموعہ سب سے پہلے ڈاکٹر مسیح الزماں نے مرتب کر کے لکھنو سے شائع کرایا۔بعد میں یہ مراثی ان کے مرتبہ کلیات میر، جلد دوم (الہ آباد) میں بھی شامل ہوئے۔ان کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی اپنے مرتبہ کلیات میر میں یہ مراثی شامل کیے۔زیر بحث قلمی نسخہ پیش نظر نہیں ورنہ یہ واضح ہو جاتا کہ اب تک شائع ہونے والے تمام مراثی اس میں شامل ہیں یا نہیں؟ اس سے ان مراثی کا زمانہ تخلیق بھی واضح ہو جاتا۔

(۳) جیسا کہ مضمون نگار نے وضاحت کی ہے کہ زیر بحث نسخہ ''کلیات میر'' کی اشاعت اول (کلکتہ ۱۸۱۱ء) کی تیاری میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے منشیوں کے پیش نظر رہا ہے۔عجیب بات یہ ہے کہ اس نسخے میں مراثی اور مثنوی ''گنجینۂ راز'' موجود ہیں، جو کلیات میر کی اشاعت اول ۱۸۱۱ء سے غیر حاضر ہیں۔اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ مرتبین کلیات، یعنی فورٹ ولیم کالج کے منشی ان مراثی اور مثنوی ''گنجینۂ راز'' کو میر کی تصنیفات سے نہیں سمجھتے تھے۔ اس سے بالواسطہ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مرتبین کلیات، میر کے اصل اور الحاقی کلام میں تمیز اور ان کے بارے میں معلومات رکھتے تھے۔کلیات میر کی اشاعت اول، ۱۸۱۱ء میں مراثی اور مثنوی ''گنجینۂ راز'' شامل نہ ہونے اور اس کے ماخذی نسخے میں ان مراثی اور مثنوی ''گنجینۂ راز'' کی شمولیت ایک دلچسپ صورت حال اور تحقیق کا نیا موضوع پیدا کرتی ہے۔اسی تناظر میں یہ امر بھی قابل لحاظ ٹھہرتا ہے کہ عبدالباری آسی نے بھی اپنے مرتبہ ''کلیات میر'' میں مراثی شامل نہیں کیے تھے۔حالاں کہ واضح شواہد موجود ہیں کہ انھوں نے دیوان اول کے نسخہ ادیب سے استفادہ کیا تھا، جس میں مراثی میر موجود ہیں۔

(۸) نسخۂ کلکتہ (دوم)

دوسرے مخطوطے کی کل ضخامت ۷۶۳ ورق ہے۔یہ بھی دو جلدوں پر مشتمل ہے۔پہلی جلد کے ۴۸۸ ورق اور دوسری کے ۲۷۵ ورق ہیں۔اس مخطوطے کا کاغذ نسبتاً معمولی اور خط شکستہ ہے۔اس مخطوطے پر بھی فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی مہریں ہیں۔اس نسخے پر ایسی کوئی تحریر موجود نہیں، جیسی پہلے نسخے پر تھیں، لیکن بقول مضمون نگار کلیات میر کے کالج ایڈیشن (کلکتہ، ۱۸۱۱ء) سے مقابلہ کرنے پر پتہ (کذا) چلا کہ اس نسخے کے اندراجات بھی مرتبین نے استعمال کیے ہیں''۔ نسخے کی تاریخ کتابت اور کاتب کا نام نہیں ملتے۔

اس نسخے کی جلد اول میں میر کے دیوان اول و دوم نقل ہوئے ہیں۔جلد دوم میں دیوان سوم و چہارم کے بعد ذکر میر، فیض میر، اور نثر

فارسی مثنوی ''دریائے عشق'' ہیں۔ فارسی کی ان تینوں متون میں غیر معروف الفاظ کے معنی فارسی میں دیے گئے ہیں۔ یہ معنی مسلسل عبارت کے درمیان ہی درج کیے گئے ہیں، بس یہ کیا گیا ہے کہ عام عبارت سے ممیّز کرنے کے لیے ان معانی کی کتابت سرخ روشنائی سے کی گئی ہے۔ مضمون نگار کے مطابق یہ معنی بیش تر وہی ہیں جو ''ذکرِ میر'' کے مطبوعہ نسخے میں نقل کیے گئے ہیں۔[۴۵]

اگر چہ اس نسخے میں تاریخ کتابت درج نہیں، لیکن قرائن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ قلمی نسخہ بھی اول الذکر قلمی نسخے کے قریبی عہد کا مکتوبہ ہوگا۔ دونوں نسخوں میں میر کے چار دیوان کتابت ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اول الذکر نسخے میں ذکر ہو چکا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے اندازے کے مطابق میر کا دیوان چہارم ۱۲۰۹ھ (۹۵-۱۷۹۴ء) تک مکمل ہو چکا تھا۔ ایسی صورت میں لازم ہے کہ یہ قلمی نسخہ ۱۲۰۹ھ یا اس کے بعد کا کتابت شدہ ہو، لیکن ۱۲۱۸ھ (۰۴-۱۸۰۳ء) سے بہر حال قبل کا کتابت شدہ ہے، جو میر کے دیوان پنجم کا اندازاً سالِ تکمیل ہے۔

ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کے یہ دونوں نسخے اس حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں کہ کلیاتِ میر کی اشاعت اول کلکتہ، ۱۸۱۱ء کے ماخذی نسخے ہیں، دوسرے: میر کے دیوان چہارم کی تکمیل اور دیوان پنجم کی تخلیق کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی کلامِ میر کی قدیم ترین روایت پیش کرتے ہیں اور تیسرے: ان میں سے پہلے نسخے کی مدد سے میر سے منسوب یا الحاقی کلام کی تحقیق میں مدد ملتی ہے۔ اس حوالے سے کلیاتِ میر کی ترتیب و تدوین جدید میں ان دونوں نسخوں کا پیشِ نظر رہنا بھی ضروری ہے۔

(۹) نسخۂ گوالیار

کتب خانۂ غمگین، دامن کوہ قلعہ گوالیار، گوالیار میں بھی کلیاتِ میر کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ اس نسخے کی ضخامت ۱۱۲۷ صفحات (۵۶۹ ورق) اور تقطیع ۸×۴ ہے۔ یہ مخطوطہ خوش خط نستعلیق میں کتابت کیا گیا ہے۔ نسخے پر سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں۔ نسخے کے آخر میں غمگین کی ۱۲۲۴ھ کی مہر ثبت ہے۔ اس نسخے میں میر کے پانچ دواوین کے علاوہ فارسی نثری تالیفات میں سے ''ذکرِ میر'' اور ''حکایاتِ خمسہ'' بھی کتابت ہوئی ہیں[۴۶]۔ ''حکایاتِ خمسہ'' غالباً ''فیضِ میر'' ہوگی۔

غمگین نام کی جو مہر اس نسخے کے آخر میں ثبت ہے، وہ میر سید علی غمگین دہلوی عرف حضرت جی ہو سکتے ہیں، جن کی درگاہ قلعہ گوالیار میں ہے اور جہاں موجود کتب خانے میں کلیاتِ میر کا زیرِ بحث نسخہ محفوظ ہے۔

کلیاتِ میر کے اس قلمی نسخے سے متعلق کافی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ اس بنا پر اس سے متعلق کچھ کہنا ممکن نہیں۔ اس نسخے میں میر کے پانچ دواوین شامل ہیں۔ اس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخے کی کتابت میر کے دیوان پنجم کی تکمیل (اندازاً ۱۲۱۸ھ کے قریب) کے بعد ہوئی اور امکانی حد تک دیوان ششم کی تکمیل (اندازاً ۱۲۲۳ھ کے قریب)[۴۷] سے قبل کتابت مکمل ہو چکی تھی۔ اس سے زیرِ بحث نسخے کی بظاہر یہ اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ یہ دیوان پنجم کی روایت اول کو پیش کرتا ہے۔ حتمی طور پر اس نسخے اور اس کے مشمولات سے متعلق اس وقت تک کچھ کہنا مناسب نہیں، جب تک یہ نسخہ پیشِ نظر نہ ہو۔ بادی النظر میں یہ نسخہ بھی نسخۂ کلکتہ (اول، دوم) کی اہمیت کا ہم منصب معلوم ہوتا ہے، اس لیے کلیاتِ میر کی تدوین میں اسے بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

(۱۰) نسخۂ کلکتہ (تھرڈ)

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی فہرست کے مطابق ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے کے تھرڈ سیکشن میں بھی ''کلیاتِ میر تقی'' کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جس کا حوالہ نمبر ۹۹۶ ہے[۴۸]۔ اس سے زیادہ اس نسخے کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔

(۱۱) نسخۂ ناصریہ

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ نے ایک مفید کام یہ کیا کہ دنیا بھر کے کتب خانوں میں موجود اردو مخطوطات کی ایک جامع فہرست بنا کر شائع کی۔ اس فہرست سے یہ علم ہوتا ہے کہ کسی مخطوطے کا مصنف کون ہے اور اس کار کے قلمی نسخہ/نسخے کہاں موجود ہے/ہیں۔ اس جہت میں یہ ابتدائی کام ہے۔ اس حوالے سے اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم ہے۔ امید ہے آئندہ اس فہرست میں مزید بہتری پیدا ہوگی۔ اس فہرست سے علم ہوا کہ کتب خانہ ناصریہ یا ناصریہ لائبریری، لکھنو میں بھی کلیات میرؔ کا ایک نسخہ موجود ہے[۹]۔ اس نسخے کی موجودگی کی اس نشان دہی کے علاوہ اس کے بارے میں کسی قسم کی مزید معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

امکان ہے کہ ان کے علاوہ بھی کلیات میرؔ کے کچھ نسخے اور ہوں گے، جن تک یا جن کے بارے میں معلومات تک میری رسائی نہیں ہو سکی۔ اس مضمون میں کلیات میرؔ کے جتنے مخطوطات کا تفصیلی ذکر ہوا، وہ سب اہمیت کے حامل ہیں۔ یوں کم و بیش کلیات کے ایک درجن نسخے ایسے ضرور ہیں کہ کلیات میرؔ کی تدوین جدید میں جن کا پیش نظر رہنا اور تدوین متن میں انھیں استعمال کرنا ضروری ٹھہرتا ہے۔

حواشی و تعلیقات

مباحثہ سنین ہجری و عیسوی کے لیے ذیل کی تقویم سے استفادہ کیا گیا ہے:
جوہر تقویم مولف: ضیاء الدین لاہوری، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۴ء

۱۔ Catalogue of Urdu Manuscripts in the Library of the International Institute of Islamic Thought and Civilization. P100-102

۲۔ فہرست نگار نے لکھا ہے کہ ورق ۶۰ ب اور ۶۱ الف خالی ہیں اور دیوان پنجم ورق ۶۲ ب تا ۱۱۵ الف پر مشتمل ہے۔ (ایضاً، ص ۱۰۱) یہاں ۶۲ ب کی بجائے ۶۱ ب ہونا چاہیے۔ ۶۲ ب غالباً ٹائپ کی غلطی ہے۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۰، ۱۰۱۔ فہرست نگار نے ۱۹ رمضان ۱۲۵۰ھ کی مطابقت ۱۴ جنوری ۱۸۳۵ء سے کی ہے۔ ۱۴ یقیناً ٹائپ کی غلطی ہے۔ تقویم کی رو سے ۱۹ جنوری ۱۸۳۵ء ہونا چاہیے۔

۴۔ تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ص ۵۵۶

۵۔ ایضاً

۶۔ دیوان میرؔ (نسخۂ محمود آباد): مقدمہ، ص ۱۸۴ و ۱۳۴

۷۔ Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani Manuscripts in the Library of the British Museum, P32 to 34

۸۔ برٹش میوزیم میں کلام میرؔ کے نسخے۔ ص ۹ تا ۴۷

۹۔ ایضاً، ص ۹

۱۰۔ Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani Manuscripts میں نسخۂ اول (دیوان اول) کا تعارف صفحہ ۳۲ اور ۳۳ پر جبکہ جلد دوم (دیوان دوم تا ششم) کا تعارف صفحہ ۳۳ اور ۳۴ پر کرایا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے مضمون (مشمولہ: ۱۹۶۳ء کے بہترین مقالے) میں دیوان اول کا تعارف صفحہ ۲۹ تا ۲۹ جبکہ دواوین دوم تا ششم کا تعارف صفحہ ۲۹ تا ۴۷ پر کرایا ہے۔

۱۱۔ برٹش میوزیم میں کلام میرؔ کے نسخے: ص ۱۰، ۱۱ اور ۳۱، ۳۲

۱۲۔ Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani Manuscripts, P33

۱۳؎ ایضاً،ص ۳۴

۱۴؎ برٹش میوزیم میں کلام میرؔ کے نسخے،ص ۳۰

۱۵؎ Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani Manuscripts, P 34

۱۶؎ برٹش میوزیم میں کلام میرؔ کے نسخے: (۱) سہ ماہی اردو نامہ (کراچی) شمارہ ۱۳: جولائی ۱۹۶۳ء،ص ۶۹ تا ۸۵ (۲) مشمولہ: ۱۹۶۳ء کے بہترین مقالے، حلقۂ ارباب ذوق،ص ۹ تا ۴۷

۱۷؎ ایضاً،ص ۱۰

۱۸؎ Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani Manuscripts, P32,33

۱۹؎ برٹش میوزیم میں کلام میرؔ کے نسخے،ص ۱۱ تا ۲۸

۲۰؎ بلوم ہارٹ نے نشان دہی کی ہے کہ دیوان ششم (اصل میں دیوان پنجم) کے آخر میں ''کہیں'' تخلص کے شاعر کی مثنوی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ بلوم ہارٹ کا بیان درست ہے یا غلط فہمی پر مبنی ہے، اس کی وضاحت ڈاکٹر عبادت بریلوی بہتر طور پر کر سکتے تھے کہ یہ قلمی نسخہ ان کے پیش نظر تھا۔

۲۱؎ Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani Manuscripts, P33, 34

۲۲؎ برٹش میوزیم میں کلام میرؔ کے نسخے: ص ۲۹ تا ۴۷

۲۳؎ دیوان میرؔ (نسخۂ محمود آباد) مقدمہ،ص ۱۸۴ و ۱۳۴

۲۴؎ Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani Manuscripts, P33, 34

۲۵؎ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس نسخۂ دوم کے آغاز کتابت کی تاریخ اوائل ربیع الاول ۱۲۲۵ھ طے کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کاتب نے اس نسخے کی کتابت کا کام کب شروع کیا، لیکن یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس نے ۱۲۲۵ھ میں اس کو لکھنا شروع کیا ہو۔ میرؔ کا انتقال ۱۲۲۵ھ میں ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے ان کے انتقال کے فوراً بعد اس کام کا آغاز ہوا ہو۔ بہر حال کاتب نے ربیع الاول ۱۲۲۵ھ کے آغاز میں اس کام کو شروع کیا اور محرم ۱۲۲۷ھ میں مکمل کیا''۔ برٹش میوزیم میں کلام میرؔ کے نسخے،ص ۳۱

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے اس بیان میں درج ذیل امور محل نظر ہیں۔

(۱) انھوں نے اس نسخۂ دوم کی کتابت کا آغاز اوائل ربیع الاول ۱۲۲۵ھ میں ہونا لکھا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اس نسخے میں کاتب نے پہلے دو دیوان، جن کی مجموعی ضخامت مخطوطے کے کل صفحات کے نصف سے زائد ہے، ۲۶ ربیع الاول ۱۲۲۵ھ تک کتابت کر لیے تھے، جبکہ بقیہ تین دیوان، جن کی ضخامت پہلے دو دواوین کے مقابلے میں نسبتاً کافی کم ہے، پونے دو سال کے عرصے میں کتابت کیے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی طے کردہ مخطوطے کے آغاز کی تاریخ کو مدنظر رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کاتب نے پہلے دو دواوین محض بیس پچیس دن میں کتابت کر لیے۔ یہ مدت کاتب کی فطری رفتار کتابت کے مطابق نہیں۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ کاتب نے نسبتاً کم ضخامت کے تین دیوان پونے دو سال کے عرصے میں کتابت کیے تو نسبتاً زیادہ ضخامت کے دو دیوان اسی رفتار کتابت سے اس نے کم سے کم دو سال میں کتابت کیے ہوں گے۔ ان دو اوین کی کتابت محض بیس پچیس دن تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے غالباً اس پہلو پر غور نہیں کیا۔

(۲) ڈاکٹر عبادت بریلوی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس مخطوطۂ دوم کی کتابت ۱۲۲۵ھ میں وفات میرؔ کے فوراً بعد شروع ہوئی ہوگی۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے میرؔ کی تاریخ وفات پر غور نہیں کیا، جو ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ (۲۰ ستمبر ۱۸۱۰ء) ہے۔ اس تاریخ یعنی وفات میرؔ سے تقریباً پانچ ماہ قبل ۲۶ ربیع الاول ۱۲۲۵ء (یکم مئی ۱۸۱۰ء) تک اس نسخے کا کاتب مخطوطے میں پہلے دو (دوسرا اور تیسرا) دیوان کتابت بھی کر چکا تھا اور ممکن حد تک مخطوطے کے تیسرے (اصل پانچویں) دیوان کی کتابت میں مصروف تھا۔ اس لیے یہ کہنا خلاف واقعہ ہے کہ اس نسخے کے کاتب نے وفات میرؔ کے بعد نسخے کی کتابت کا آغاز کیا۔ ہاں! اس مخطوطے کی کتابت کا اختتام یقیناً وفات میرؔ کے بعد ہوا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے تعارفی مضمون میں ذیل کے تسامحات بھی واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں:

(۳) ان کے مطابق اس نسخے میں دیوان دوم کے آخر میں ''بہ اتمام رسید دیوان دویم میر تقی میرؔ مرحوم'' درج ہے۔ (برٹش میوزیم میں کلام میرؔ

کے نسخے: ص ۴۳) اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیوان دوم کی کتابت میر کی وفات کے بعد مکمل ہوئی۔ ظاہر ہے یہ درست نہیں۔ یہ طے ہے کہ اس نسخے میں دیوان دوم وسوم کی کتابت میر کی زندگی ہی میں ان کی وفات سے بھی پانچ ماہ قبل مکمل ہو چکی تھی۔ ایسے میں دیوان دوم کے آخر میں میر کو مرحوم کیسے لکھا جا سکتا ہے؟ جبکہ یہ اور اس کے بعد کا دیوان بھی تبین حیات میر کتابت ہوئے، چنانچہ دیوان سوم کے آخر میں جو ترقیمہ کاتب نے لکھا ہے، اس میں ''تمت بالخیر دیوان سوم میر محمد تقی میر......'' درج ہے اور میر کو مرحوم نہیں لکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی سے ترقیمے کی عبارت نقل کرنے میں بے احتیاطی ہوئی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دیوان دوم کے آخر میں یہ عبارت بعد میں کسی نے دیوان دوم کے اختتام کی نشان دہی کے لیے اضافہ کر دی ہو۔ ایسی صورت میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کو یہ وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ یہ عبارت بعد کا اضافہ ہے، کاتب کے قلم سے نہیں۔ بلوم ہارٹ نے اس نسخے میں دیوان دوم کے اختتام پر کسی عبارت کی نشان دہی نہیں کی۔

(۴) جیسا کہ نشان دہی کی گئی ہے کہ بلوم ہارٹ کی تصریح کے مطابق اس نسخے (مخطوطہ دوم) کے کاتب نے دواوین میر کی معروف ترتیب کے خلاف مخطوطے میں دیوان چہارم کی جگہ دیوان پنجم، دیوان پنجم کی جگہ دیوان ششم اور آخر میں دیوان ششم کی جگہ دیوان چہارم کتابت کیے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کاتب کے اس اختیار کی وضاحت نہیں کی اور اپنے مضمون میں مخطوطے میں کتابت کیے گئے دیوان پنجم کو دیوان چہارم، دیوان ششم کو دیوان پنجم اور دیوان چہارم کو دیوان ششم ہی لکھا ہے۔ مزید حیرت یہ ہے کہ انھوں نے دواوین کے مشمولات سے بھی یہ اندازہ کرنے کی کوشش نہیں کی جس دیوان کا وہ تعارف کرا رہے ہیں، وہ چوتھا ہے، پانچواں یا چھٹا؟

۲۶۔ کلیات میر کا ایک نادر نسخہ: نقوش (لاہور) شمارہ نمبر ۱۳۱: اگست ۱۹۸۳ء (میر تقی میر نمبر ۳) ص ۷ تا ۲۱)

۲۷۔ فہرست مخطوطات اردو، رضا لائبریری رام پور: ص ۱۹۳

۲۸۔ کلیات میر کا ایک نادر نسخہ: ص ۷۔ عرشی صاحب نے ۲۹ رمضان ۱۲۴۶ھ کے مطابق عیسوی تاریخ ۱۲ مارچ ۱۸۳۱ء لکھی ہے، جب کہ میرے پیش نظر ''جوہر تقویم'' میں یہ تاریخ ۱۳ مارچ ۱۸۳۱ء درج ہے۔ (جوہر تقویم: ص ۲۰۴) تقویم میں ایک دو روز کا تفاوت عام طور سے ہو جاتا ہے اور یہ لابدی ہے۔ اس سے مفر ممکن نہیں۔

۲۹۔ عرشی صاحب نے لکھا ہے: رضا لائبریری رام پور میں میر تقی میر کے کلیات کا ایک بہت اچھا نسخہ محفوظ ہے۔ اس میں نکات الشعرا کے علاوہ ان کی نظم ونثر کا سارا کلام (کذا۔ کلام) دیوان اردو ۱ تا ۶، دیوان فارسی، فیض میر اور ذکر میر شامل ہے (ایضاً، ص ۷) یہاں ''علاوہ'' سے مراد غالباً سوا ہے، یعنی اس مخطوطے میں ''نکات الشعرا'' شامل نہیں۔ اس کے سوا بقیہ تصانیف کا متن شامل ہے۔

۳۰۔ کتب خانۂ ندوۃ العلما کے اردو مخطوطات: ص ۴۵، ۴۶

۳۱۔ دیوان میر (نسخۂ محمود آباد): مقدمہ، ص ۱۲۴ تا ۱۲۶

۳۲۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے اردو مخطوطات: ص ۲۱۴

۳۳۔ دیوان میر (نسخۂ محمود آباد): مقدمہ، ص ۱۴۱ تا ۱۴۳

۳۴۔ تاریخ ادب اردو: جلد دوم، ص ۵۵۶

۳۵۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانۂ آصفیہ) کے اردو مخطوطات۔ جلد اول، ص ۲۶، ۲۷

۳۶۔ دیوان میر (نسخۂ محمود آباد) مقدمہ، ص ۱۱۳

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۱۴ تا ۱۱۹

۳۸۔ کلکتہ و اطراف کلکتہ کے کتب خانوں میں محفوظ اردو مخطوطات: بشمولہ (۱) ارمغان علمی بپاس خدمات علمی و ادبی ڈاکٹر وحید قریشی۔ مرتبین (ڈاکٹر) رفیع الدین ہاشمی، (ڈاکٹر) عارف نوشاہی، (ڈاکٹر) تحسین فراقی۔ لاہور، مجلس ادبیات مشرق۔ باشتراک القمر انٹرپرائزز، لاہور۔ طبع اول ۱۹۹۸ء ص ۲۳۹ تا ۲۷۷ (۲) اردو مخطوطات کی فہرستیں (رسائل میں) جلد اول، ص ۱۰۹ تا ۱۴۴۔

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے مخطوطات کی فہرست کے ضمن میں شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے واضح کیا ہے کہ لائبریری میں موجود اردو مخطوطات کی کوئی باقاعدہ فہرست موجود نہیں۔ ''لائبریری کے شعبہ اردو، فارسی اور عربی وغیرہ کے انچارج صاحب کے ہاں ایک پرانا کھاتا (رجسٹر) ہے جس میں انھوں نے اپنی سہولت کے لیے تمام اردو مخطوطات کے نام درج کر رکھے ہیں...... رجسٹر سے جو معلومات ملتی ہیں وہ نقل کر رہا ہوں''۔ (ص ۱۴۲)

۳۹۔ ایضاً،ص۱۲۵
۴۰۔ میر کی مثنوی ''گنجینۂ راز'' کا مصنف کون ہے؟ قومی زبان (کراچی) جولائی ۱۹۸۵ء ص ۵ تا ۱۴
۴۱۔ ایضاً،حواشی،ص۱۳،۱۴۔
۴۲۔ ایضاً،ص۱۳
۴۳۔ ایضاً
۴۴۔ تاریخ ادب اردو،جلد دوم۔ص ۵۵۵،۵۵۶
۴۵۔ میر کی مثنوی ''گنجینۂ راز'' کا مصنف کون ہے؟:حاشیہ نمبر۱،ص۱۴
۴۶۔ دیوان میر (نسخۂ محمود آباد): مقدمہ،ص۱۴۵
۴۷۔ تاریخ ادب اردو: جلد دوم،ص۵۵۶
۴۸۔ کلکتہ و اطراف کلکتہ کے کتب خانوں میں محفوظ اردو مخطوطات :ص۱۳۰
۴۹۔ برصغیر کے کتاب خانوں میں اردو مخطوطات :ص۱۳۳

کتابیات

۱۔ اکبر حیدری کاشمیری، (ڈاکٹر): مقدمہ دیوان میر نسخۂ محمود آباد مخطوطہ ۱۲۰۳ھ بہ حیات میر۔ مشمولہ: نقوش (لاہور) شمارہ نمبر۱۲۵: اکتوبر ۱۹۸۰ء (میر تقی میر نمبر۱) مقدمہ ص ۳۶ تا ۱۴۵
۲۔ امتیاز علی عرشی، مولانا۔ کلیات میر کا ایک نادر نسخہ (مضمون): نقوش (لاہور) شمارہ نمبر۱۳۱، اگست ۱۹۸۳ء (میر تقی میر نمبر۳) ص ۷ تا ۲۱
۳۔ (بلوم ہارٹ، جے ایف)
J.F. BPumhardt, M.A. Catalogue of the Hindi, Punjabi and Hindustani Maruscripts in the Library of the British Museum لندن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۸۹۹ء
۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو۔ جلد دوم، حصہ اول، لاہور، مجلس ترقی ادب۔ طبع اول جنوری ۱۹۸۲ء
۵۔ حاجی علی بن حاجی احمد:
Haji Ali bin Haji Ahmad: Catalogue of Urdu Manuscripts in the Library of the International Institute of Islamic Thought and Civilization ملائشیا،۱۹۹۴ء
۶۔ سلمان حسینی: کتب خانہ ندوۃ العلماء کے اردو مخطوطات۔ نیا دور (لکھنو) جولائی ۱۹۷۲ء ص ۴۴ تا ۴۸
۷۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ: کلکتہ و اطراف کلکتہ کے کتب خانوں میں محفوظ اردو مخطوطات۔ مشمولہ: اردو مخطوطات کی فہرستیں (رسائل میں) جلد اول۔ ترتیب و حواشی رفاقت علی شاہد۔ لاہور، پاکستان اردو اکیڈمی، مئی ۲۰۰۰ء ص ۱۰۹ تا ۱۴۴
۸۔ شعائر اللہ خاں وجیہی، ڈاکٹر: فہرست مخطوطات اردو رضا لائبریری، رام پور، رضا لائبریری جرنل (رام پور) شمارہ نمبر۲، ۱۹۹۵ء
۹۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر۔ برٹش میوزیم میں کلام میر کے نسخے۔ مشمولہ: ۱۹۶۳ء کے بہترین مقالے حلقہ ارباب ذوق۔ مرتبین: انتظار حسین، عزیز الدین احمد، لاہور۔ مکتبہ جدید، بار اول ۱۹۶۴ء، ص ۹ تا ۴۵
۱۰۔ عطا خورشید، ڈاکٹر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے اردو مخطوطات ...... پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء
۱۱۔ نصیر الدین ہاشمی (مرتب): اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانۂ آصفیہ) کے اردو مخطوطات۔ جلد اول، حیدر آباد دکن، مطبع ابراہیمیہ، بار اول ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء
۱۲۔ نعیم، پروفیسر چوہدری محمد: میر کی مثنوی ''گنجینۂ راز'' کا مصنف کون ہے؟ قومی زبان (کراچی) جولائی ۱۹۸۵ء ص ۵ تا ۱۴
۱۳۔ برصغیر کے کتاب خانوں میں اردو مخطوطات۔ پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء

اردوئے معلیٰ

شفقت رضوی

اردو کی ادبی صحافت کا آغاز گل دستوں سے ہوا۔انیسویں صدی کے ربع آخر کو بجا طور پر گلدستوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔گلدستوں کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی صحافت کے ابتدائی نقوش ابھرنے لگے۔ان میں سے چند ہی مقبول اور مشہور ہوئے۔ دلگداز ادب اور تاریخ کی خدمت کرتا رہا۔تہذیب الاخلاق جدید طرز تحریر کی بنا ڈالنے کے علاوہ ملی تحریک کی رہنمائی کرتا رہا۔اس نے واضح نصب العین اور با مقصد صحافت کی بنا ڈالی اودھ پنچ بدیسی حکمرانوں کے خلاف موثر آواز اٹھانے کی وجہ سے یادگار اور محترم رہا۔وہ مزاح کی چڑھی شکر میں حقائق اور طنز کی تلخیاں بیچا کرتا۔ان کے تسلسل میں بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ادبی صحافت حقیقی معنوں میں پروان چڑھتی دکھائی دیتی ہے۔ابتدائی دور میں مخزن لاہور (اجرا اپریل ۱۹۰۱ء) عصر جدید (اجرا جنوری ۱۹۰۳ء) زمانہ کانپور (اجرا جنوری ۱۹۰۳ء) نے اعتبار ہنر قائم کیا۔اس کاروان میں حسرت موہانی کا رسالہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ جولائی ۱۹۰۳ء میں شریک ہوا۔بعد کے منظر عام پر آنے والوں میں زبان (دہلی) الفاظ (لکھنو) فسانہ دکن ریویو (حیدر آباد دکن) نے انمٹ نقوش چھوڑے۔

اردوئے معلیٰ کو حسرت موہانی کا ذریعہ معاش سمجھیں،ان کے ذوق اور شوق کی ترجمانی اور تکمیل خیال کریں یہ ان کے لیے سب ہی کچھ تھا۔گو،بظاہر نہایت حقیر معمولی رسالہ جس کی تزئین اور خوش نمائی کا کوئی اہتمام نہ ہوتا تھا،معمولی سستے کاغذ پر چھپتا لیکن حسرت موہانی کے مذہبی،علمی،ادبی،معاشی،معاشرتی،اقتصادی اور سیاسی معتقدات کا عکاس تھا جو لوگوں کو دعوت فکر دیتا، پڑھنے والوں کی ذہنی تربیت کرتا اور ہر معاملے میں بحث ومباحثہ کی دعوت دیتا تھا۔فردوس علی گڑھ میں سیاست شجر ممنوعہ تھی۔انھوں نے اس کے پھل کو چکھنے کی ابتدا کی اور دوسروں کو کام و دہن کی آزمائش کے لیے راغب کیا۔بقول سید سلیمان ندوی:

> ''اردوئے معلیٰ میں شعر وسخن کے پھول اور سیاست کے کانٹے ایک ساتھ ناظرین کے سامنے پیش ہوتے رہے اور لوگ حسب مذاق اس دو رنگی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔اس زمانہ کے اردوئے معلیٰ میں ان کے اور دوسرے اصحاب کے خوب خوب ادبی و سیاسی مضامین نکلے''[1]

حسرت موہانی نے ۱۹۰۳ء میں ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ سے بی۔اے کیا۔اس زمانے میں علی گڑھ کے گریجوایٹ کا معزز عہدوں پر مامور ہونا مشکل نہ تھا۔حسرت کی طبیعت میں جو آزاد منشی تھی اس نے انھیں کسی ملازمت کے لیے تیار نہیں کیا۔ انھوں نے آزادی کے ساتھ کسب معاش کے ارادے سے ترک وطن کر کے علی گڑھ میں مستقل سکونت اختیار کی اور صحافت اور اشاعت کتب کو ذریعہ معاش بنایا۔انھوں نے جولائی ۱۹۰۳ء سے رسالہ اردوئے معلیٰ شائع کرنا شروع کیا۔رسالے کے نام کا انتخاب ان کے لیے مشکل نہ تھا۔وہ کالج کے زمانہ کی ''انجمن اردوئے معلیٰ'' کی یاد تازہ رکھنا چاہتے تھے اسی کی مناسبت سے

رسالے کا نام رکھا۔واضح رہے کہ اپریل ۱۹۰۰ء میں سید سجاد حیدر یلدرم نے ''انجمن اردوئے معلیٰ'' علی گڑھ میں قائم کی تھی اس کے روح رواں حسرت موہانی تھے۔[۲]

اردوئے معلیٰ کے مقاصد:

اردوئے معلیٰ کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا۔اس کے سرورق پر تاریخ، جلد اور شمارہ کے اندراج کے علاوہ ایڈیٹر کا نام جلی حروف میں تھا ''مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔اے''۔ٹائٹل کے اندرونی صفحہ پر اغراض ومقاصد درج تھے:

''اس رسالہ کا مقصد صرف ایک ہے یعنی، درستی مذاق۔چنانچہ اس لحاظ سے امور مندرجہ ذیل کی پابندی کی جائے گی:

ا۔ مضامین نظم ونثر ہر قسم کے ہوں گے یعنی، سوانحی، تاریخی، علمی، فلسفیانہ، اخلاقی، تمدنی، ادبی، تنقیدی اور متعلق بافسانہ ہائے مختصر ومکمل۔

ب۔ مضامین نہ حد سے زیادہ خشک ہوں گے نہ حد سے زیادہ ہلکے اور ان کی ترتیب ایسی ہوگی جو ہر قسم کے مذاق کو گوارا ہو۔

ج۔ حصہ نظم میں اس قسم کی نظمیں شائع کی جائیں گی جن کے انداز میں کوئی خصوصیت ہو۔ان نظموں کے متعلق طرز قدیم اور جدید کی قید نہ ہوگی۔

د۔ نظم ونثر میں حتی الامکان صحت زبان کا سختی سے لحاظ رکھا جائے گا۔

ھ۔ مضامین منتخب شائع ہوں گے اور جو انتخاب میں نہ آئیں گے وہ بجسہ واپس کر دیے جائیں گے۔

ان مقاصد کے علاوہ چند ضمنی مقاصد بھی ہیں مثلاً قدر دانانی اہل کمال وامداد زبان اردو۔

مضامین کے لیے معقول معاوضہ دیا جائے گا۔اس کے متعلق نیز دیگر امور کے متعلق خط وکتابت ایڈیٹر کا نام ہونا چاہیے''۔

ہر شمارہ کی کائنات (۱۸×۲۲) ۸ کی تقطیع کے ۴۸ صفحات ہوئے۔رسالہ کا سائز ہمیشہ یہی رہا۔صفحات میں کمی بیشی ہوتی رہی۔اس کی سالانہ قیمت قسم اول چار روپیہ اور قسم دوم دو روپیہ تھی۔اقسام استعمال ہونے والے کاغذ کی مناسبت سے تھے۔

اردوئے معلیٰ کے ادوار:

اشاعت کے اعتبار سے اردوئے معلیٰ کے تین ادوار قائم کیے جاسکتے ہیں:

دور اول: جولائی ۱۹۰۳ء تا اپریل ۱۹۰۸ء

دوسرا دور: اکتوبر ۱۹۰۹ء تا جون ۱۹۱۳ء

تیسرا دور: جنوری ۱۹۲۵ تا مارچ ۱۹۴۲ء

ہم نے اردوئے معلیٰ کے پہلے دور کو دو ضمنی ادوار میں تقسیم کیا۔پہلا ضمنی دور جولائی ۱۹۰۳ء سے دسمبر ۱۹۰۶ء تک قرار پاتا ہے جبکہ دوسرا دور جنوری ۱۹۰۷ء سے اپریل ۱۹۰۸ء تک کا ہے۔ضمنی ادوار کی تقسیم ہم نے حسرت موہانی کے بیانات کی روشنی میں کی ہے۔انھوں نے جنوری ۱۹۰۷ء کے شمارے میں سرورق پر ''اردوئے معلیٰ علی گڑھ سلسلہ جدیدہ ۱۹۰۷ء'' درج کیا ہے لیکن اس کی کوئی خاص وجہ بیان نہیں کی ہے۔حالات کے تناظر میں ہمیں دو وجوہ سمجھ میں آتی ہیں۔

پہلی وجہ یہ کہ حسرت موہانی نے ۱۹۰۴ء میں کانگریس میں شمولیت اختیار کی۔اس زمانے میں کانگریس دو واضح گروہوں

میں تقسیم تھی۔ انتہا پسند (گرم دلی) کی قیادت لوکمانیہ تلک کر رہے تھے۔ ہندوستانی لیڈروں میں انھیں اس اعتبار سے تقدم حاصل تھا کہ انھوں نے کامل آزادی کا نصب العین قائم کیا تھا اور کامل آزادی کے لیے ''سوراج'' کی اصطلاح اختراع کی تھی۔ حسرت موہانی مزاجاً انتہا پسند تھے۔ انھوں نے لوکمانیہ تلک کو قائد مان کر کانگریس میں شریک ہونا مناسب خیال کیا تھا۔ ۱۹۰۶ء کے سالانہ اجلاس میں سخت جدوجہد کے بعد گرم دل کو نرم دل پر سبقت حاصل ہوئی۔ اجلاس کی ساری کارروائی ان کے منشا کے مطابق ہوئی۔ اس میں حصول سوراج اور قومی تعلیم کے حق میں قراردادیں منظور ہوئیں۔ اس صورت حال کے بارے میں ستیہ پال نے لکھا ہے:

"The triumph of Tilak party was complete at the Calcutta congress of 1906"[۳]

اس کامیابی سے سرشار حسرت موہانی نے اس عزم کے ساتھ ۱۹۰۷ء کا آغاز کیا کہ وہ رسالے کے ذریعے سے تحریک آزادی کو زیادہ زور شور سے چلائیں گے۔ اس سال انھوں نے سدیشی تحریک کو قبول کیا اور باقی زندگی نہ خود کبھی غیر ملکی اشیا استعمال کیں نہ اپنے لواحقین کو اس کی اجازت دی۔ اس سلسلے میں انھوں نے لکھا کہ:

> ''اردوئے معلیٰ کا یہ نمبر غیر معمولی تاخیر کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ کلکتہ سے کاغذ آنے میں دیر ہوئی۔ اس وقت تک اردوئے معلیٰ قسم اول ولائتی کاغذ پر چھپتا تھا مگر سدیشی تحریک کے موید ہونے کی حیثیت سے ہم کو ولائتی کاغذ کا استعمال ناپسند تھا۔ الحمدللہ کہ ۱۹۰۶ء میں اس کاغذ کا ذخیرہ جس کو ہم نے بہت دن قبل خرید لیا تھا ختم ہوگیا اور ماہ جنوری کا رسالہ سدیشی کاغذ پر چھاپا گیا اور آئندہ بھی ایسا ہی چھپے گا''۔[۴]

اردوئے معلیٰ کا علمی و ادبی حصہ:

ابتدا ہی سے اردوئے معلیٰ کا علمی و ادبی حصہ بلند پایہ، معلوماتی اور نہایت وقیع رہا۔ اس میں ہر قسم کے مضامین شائع ہوتے۔ ان کی فہرست طویل ہے۔ موضوعات کے تنوع کا اندازہ چند عنوانات سے اور ان کے معیار کا اندازہ لکھنے والوں کے ناموں سے کیا جا سکتا ہے۔ رسالے نے سائنسی موضوعات پر مضامین شائع کر کے یہ حقیقت منوائی تھی کہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں اردو زبان اتنی ترقی کر چکی تھی کہ ہر نوع کے مضامین کی متحمل ہو سکتی تھی۔ سائنسی موضوعات پر شائع ہونے والے چند مضامین:

لطیف حسین خان: بیالوجی (مئی ۱۹۰۳ء) ایک پھول کی کہانی (اکتوبر ۱۹۰۳ء) دوران خون اور ہماری صحت جسمانی (دسمبر ۱۹۰۳) سائنس (دو قسطیں) (مئی و جون ۱۹۰۴ء)

سجاد عظیم آبادی: انجمن حواس خمسہ (اکتوبر ۱۹۰۳ء)

غلام حسین: سائنس کی مذہبی حقیقت (نومبر ۱۹۰۳ء)

محمد سعید دہلوی: بادلوں کے اسرار (جنوری ۱۹۰۴ء)

حیات الحسن موہانی: فن طب (جنوری ۱۹۰۴ء)

ضیائی الحسن موہانی: قدرت کی صناعیاں (فروری ۱۹۰۴ء)

احسن اللہ خان ثاقب: نگارش ایڈیسن و احوال وقت و ہنگام (فارسی) (اپریل ۱۹۰۴ء)

عبدالغفور: لٹریچر اور سائنس (اکتوبر ۱۹۰۴ء)

عبدالغنی خاں رافت: تارپیڈو (مارچ ۱۹۰۵ء)

اسی طرح ادبی مضامین پر سرسری نظر ڈالی جائے:

احمد علی شوق: اردو اور اس کی اصلاح (اکتوبر ۱۹۰۳ء)، شاد عظیم آبادی: تصحیح الفاظ اور متروکات (اکتوبر ۱۹۰۳ء) امیر احمد علوی: اردو شاعری (دو قسطیں) (دسمبر ۱۹۰۳ء و جنوری ۱۹۰۴ء) محمد یعقوب: جدید شاعری (ستمبر ۱۹۰۳ء) احمد علی اشہری: ہماری شاعری (دسمبر ۱۹۰۳ء) حسرت شیروانی: اردو غزل گوئی (اگست ۱۹۰۴ء) شمس العلماء ذکاء اللہ: امیر پر شاعرانہ خیالات (جنوری ۱۹۰۵ء) امداد امام اثر: شاعری (فروری ۱۹۰۵ء) محمد فاروق دیوانہ: شاعری (مارچ ۱۹۰۵ء)، وجاہت تھنجھانوی: امیر و داغ (جون ۱۹۰۵ء) عبدالحق: کلام بیان (دسمبر ۱۹۰۵ء) نواب رائے (پریم چند) اردوئے معلّٰی و اردو مطلا (فروری ۱۹۰۶ء) شبلی نعمانی: مجاز، تشبیہہ، استعارہ، تمثیل (اپریل ۱۹۰۶ء) حکیم برہم: شرر و سرشار (اگست ۱۹۰۷ء) محبوب الرحمٰن کلیم: مولانا حالی کی موجودہ شاعری (جنوری ۱۹۰۸ء)

اردوئے معلّٰی کے ادبی معرکے:

اردوئے معلّٰی میں دو ادبی معرکے ہوئے۔ پہلا رسالے کے مضمون نگار ''تنقید ہمدرد'' اور علامہ اقبال کے درمیان ہوا۔ خوشی محمد ناظر نے اس معرکے کی ابتدا اپنے مضمون ''پنجاب میں اردو'' سے کی جو علی گڑھ منتقلی میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بارے میں سید سجاد حیدر یلدرم نے لکھا ہے کہ:

''انھیں ایام میں چودھری خوشی محمد نے علی گڑھ منتقلی میں قدیم اردو شاعری پر ایک قبیح حملہ کیا۔ اس مضمون کا انداز تحریر اور پیرایۂ استدلال اس قسم کا تھا کہ حسرت سے جس کا دل اور دماغ میر و سودا اور مصحفی و انشا کے لیے کلام سے سرشار تھا ضبط نہ ہو سکا۔

اس رنگ سے اٹھائی کچھ اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے''[۵]

چنانچہ حالی، اقبال، ناظر کا کلام حسرت کی نظر سے گزرتا اور ان میں کوئی فنی یا لسانی غلطی نظر آتی وہ ضرور اس کی نشان دہی کرتے اس سلسلے میں ''ہمدرد تنقید'' کا مضمون اگست ۱۹۰۳ء میں ''پنجاب میں اردو'' کے زیر عنوان چھاپا۔ اس میں اقبال اور ناظر کے کلام کی خامیوں کا ذکر کیا گیا۔ حسرت موہانی اپنے معاصر شعرا میں اقبال کا بے حد احترام کرتے اور مجموعی طور پر ان کی طرز شاعری کے مداح تھے، لیکن حسرت ہی نہیں دیگر نقادان فنی نے ان کی زبان کی غلطیوں کی گرفت کی تھی۔ ان معترضین میں عبدالحلیم شرر بھی شامل تھے۔ ان نقادوں کا منشا اقبال کے کلام کو ہر سقم سے پاک کرنے کا تھا مگر اس وقت بھی اور موجودہ زمانے میں بھی اسے ان نقادوں کے تعصب سے تعبیر کیا ہے۔ غالباً ان کم فہموں کی نظر سے وہ نوٹ نہیں گزرا جو ''ہمدرد تنقید'' کا جواب شائع کرتے ہوئے ایڈیٹر اردوئے معلّٰی نے لکھا تھا:

> ''ہم کو سخن سنجان پنجاب کی دل شکنی کے خیال سے اس مضمون کو شائع کرنے میں تامل تھا لیکن یہ دیکھ کر کہ صاحب مضمون نے زبان کی کمزوریوں سے گزر کر حضرت اقبال کی نفس شاعری پر مطلق اعتراض نہیں کیا ہے بلکہ اس کی جا بجا تعریف کی ہے ہم اس کی اشاعت کو جائز رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ اہل پنجاب کے انصاف پسند طبیعتوں کو یہ بیان حقیقت ناگوار نہ گزرے گا''۔

اس وضاحتی نوٹ کے باوجود بعض حضرات ''ہمدرد تنقید'' کے پردے میں حسرت موہانی کو ہی دیکھتے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ یہ مضمون حسرت ہی کا لکھا ہوا ہے۔ حسرت ایسی کم زور طبیعت کے نہیں تھے کہ کسی خوف کی وجہ سے مضمون کے ساتھ اپنا نام نہ دیتے

جبکہ اس مضمون کے علاوہ بھی بار بار کلام اقبال کی کمزوریوں کو اپنے نام سے ظاہر کیا ہے۔ اقبال کی تو وہ نومشقی کا زمانہ تھا۔ حسرت نے مولانا حالی جیسے بزرگ شاعر پر اپنے نام سے اعتراضات کیے ہیں۔

اردوئے معلیٰ کے اگست ۱۹۰۳ء کے شمارے میں شائع شدہ مضمون کا جواب اقبال نے مخزن میں دیا۔ ''ہمدرد تنقید'' اس سے مطمئن نہیں ہوئے ان کا جواب الجواب اکتوبر ۱۹۰۳ء کے اردوئے معلیٰ میں چھپا اور اس بحث کا سلسلہ اسی پر ختم ہو گیا۔

چکبست نے بھی '' کلام اقبال'' کے عنوان سے ایک تنقیدی مضمون لکھا تھا جو اپریل ۱۹۰۴ء میں چھپا۔ وہ عام توجہ کا مرکز نہ بنا جبکہ وہ بھی فکر انگیز اور مدلل تھا۔

اردوئے معلیٰ میں دوسرے ادبی معرکے کا تعلق مثنوی گلزار نسیم سے تھا۔ دیا شنکر نسیم کی اس مثنوی کو ۱۹۰۵ء میں چکبست نے بعد تصحیح مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اس کے مقدمے میں وہ حد اعتدال سے گزر کر قابل یقین دعووں تک پہنچ گئے اور یہاں تک لکھ دیا کہ گلزار نسیم ہی اردو کی کامیاب ترین مثنوی ہے اور سحر البیان اس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ انھوں نے نسیم کی زبان دانی کی تعریف میں بھی حد سے تجاوز کیا۔ اپنے بیان کی تائید میں غیر مستند واقعات سے کام لیا۔ چکبست کے مقدمہ گلزار نسیم پر سب سے پہلے مولانا شرر نے دلگداز میں گرفت کی۔ مثنوی پر ان کا تبصرہ مارچ ۱۹۰۵ء کے دلگداز میں چھپا۔ انھوں نے نہ صرف مثنوی میں زبان کی غلطیاں بتلائیں بلکہ یہاں تک لکھ دیا کہ نسیم کی زبان لکھنوی نمائندہ ہی نہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ:

> ''منشی اشرف علی شاگرد نسیم دہلوی کا بیان ہے کہ پنڈت دیا شنکر نسیم کی لکھی ہوئی مثنوی کے بہت سے اوراق میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے جو بہت ہی عام مذاق کے تھے اور ایسے تھے کہ سوا ایک مبتدی کے کسی کہنہ مشق شاعر کی جانب منسوب نہیں کیے جا سکتے''۔ (دلگداز: مارچ ۱۹۰۵ء)

اس دعوے کے ساتھ یہ بھی لکھا گیا کہ نسیم کے استاد آتش نے اس کو اس طرح درست کیا وہ ان کی تصنیف قرار پاتی ہے۔ انھوں نے لکھا:

> ''یہ مثنوی اصل میں آتش کی ہے انھوں نے پنڈت دیا شنکر نسیم کو دے دی تھی''۔ (ایضاً)

اس سلسلے کا شرر کا دوسرا مضمون دلگداز اپریل ۱۹۰۵ء میں چھپا جس میں زبان کی غلطیاں ظاہر کی گئیں۔ چکبست نے شرر کے اعتراضات کا جواب اردوئے معلیٰ جولائی ۱۹۰۵ء میں دیا جو رسالہ کے ۴۵ صفحات پر محیط ہے۔ حسرت نے مضمون کے جن نکات سے اعتراض تھا اس کو حاشیہ میں ظاہر کیا۔ مثنوی کے بارے جواب اور جواب الجواب کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ چکبست کا دوسرا مضمون اردوئے معلیٰ نومبر ۱۹۰۵ء میں چھپا۔ اودھ کے دیگر رسائل بھی اس معرکے میں شریک ہوئے۔ اودھ پنچ نے بھی اس میں حصہ لیا اس نے مزاح سے بات کو شروع کیا اور پھکڑ پن پر اتر آیا تو اردوئے معلیٰ نے بحث سے کنارہ کشی کر لی۔ چکبست کے مضمون پر حواشی لکھنے کے علاوہ حسرت نے ایک تفصیلی مضمون اگست ۱۹۰۵ء میں شائع کیا اور شرر اور چکبست کی بے اعتدالی پر تنقید کی انھوں نے شرر کے اعتراضات رد کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ''گلزار نسیم کی تصنیف کو خواجہ آتش کے ساتھ منسوب کرنا خطا ہے بلکہ ہمارے نزدیک اس قسم کی بے بنیاد روایت کو درحقیقت سمجھنا اپنے تئیں مذاق صحیح سے بیگانہ ثابت کرنا ہے''۔ (اردوئے معلیٰ: اگست ۱۹۰۵ء)
>
> ''شعرائے لکھنو میں صرف خواجہ آتش ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ اس میں آورد سے زیادہ آمد ہے۔ ایسی حالت میں ان کو گلزار نسیم کا مصنف ٹھہرانا جس کا ہر ہر شعر آورد اور تصنع کی

گویا ایک مجسم صورت ہے بہر کیف نا مناسب ہے''۔(ایضاً)

''گلزار نسیم کی زبان بے شک لکھنو کی زبان ہے اگر چہ اس میں بعض غلطیاں موجود ہیں لیکن ساتھ ہی ان کی ان غلطیوں کی بنا پر یہ کہنا بھی غایت درجہ کی کوتاہ نظری ہے کہ نسیم کی زبان لکھنو کی زبان نہیں ہے یا یہ کہ ان غلطیوں نے گلزار نسیم کو مٹا دیا ہے''۔(ایضاً)

چکبست کے جواب میں اعتراضات کے حوالے سے حسرت نے لکھا:

''غلطیوں سے کسی بڑے بڑے استاد کا کلام بھی نہیں بچا ہے۔ پھر اگر نسیم کے کلام میں بعض صحیح اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں تو مسٹر چکبست کو ان کے تسلیم کر لینے میں کیا عذر اور بلا حاجت تاویل کی کیا حاجت ہے۔ حضرت شرر کے اعتراضوں میں سے اکثر اعتراض موجودہ زبان کے لحاظ سے صحیح ہیں''۔(ایضاً)

اندر سبھا: حسرت موہانی کا ایک فکر انگیز مضمون امانت کی تصنیف ''اندر سبھا'' کے بارے میں ہے جو اگست ۱۹۰۳ء صفحات ۳ تا ۸ میں شائع ہوا۔ مضمون کی ابتدا میں انھوں نے زبان اور کہانی کی تعریف کرتے ہوئے اس میں موجود موسیقیت کو بھی سراہا ہے۔ انھوں نے اندر سبھا کا مطالعہ اپنے نکتہ نظر سے کرتے ہوئے صراحت کی ہے کہ عام پریوں کا عام قصہ نہیں ہے بلکہ تمثیل ہے۔ Allegory یا تمثیل کے لیے انھوں نے ''مرادی'' کی اصطلاح تراشی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ:

''اس قسم کے مرادی افسانوں کا ممالک مشرق میں بہت رواج ہے۔ اردو میں نظیر اکبر آبادی کا کلیات اوس کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ بھاکا میں ملک محمد جائسی کی کتاب پدماوت اور فارسی میں کتاب بستان حکمت اس کی بین مثالیں موجود ہیں''۔(اردوئے معلیٰ: اگست ۱۹۰۵ء)

اندر سبھا کے کرداروں کے بارے میں انھوں نے وضاحت کی ہے کہ:

''راجہ اندر بھی واقعی دیو، پری کا راجہ نہیں بلکہ اس کے ہاں اندر سے پاس شرافت، پکھراج پری سے حیا، لال پری سے خودداری ورعب حسن، سبز پری سے حسن، کالے دیو سے خواہش، گلفام سے عشق اور لال دیو سے غمازی مراد ہے''۔

اسی طرح انھوں نے قصہ میں شامل واقعات کی تمثیلی نوعیت کو واضح کیا ہے۔

اس دور میں حسرت موہانی کے متعدد ادبی مضامین بھی شائع ہوئے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔ اندر سبھا (اگست ۱۹۰۳ء، ص ۳ تا ۸) مثنوی گلزار نسیم (جولائی ۱۹۰۵ء) حالی کے اشعار پر اعتراض (فروری ۱۹۰۴ء: ص ۴۴، ۴۵) خوشی محمد ناظر کے اشعار پر اعتراض (فروری ۱۹۰۴ء ص ۴۳، ۴۴) اردوئے معلیٰ کے زبان کی اصلاح (رسالہ نقاد نے جو اعتراضات کیے تھے ان کا جواب) جون ۱۹۰۴ء، ۴ تا ۶۔ شخصیات میں میر مہدی مجروح (جولائی ۱۹۰۳ء)، سید آل حسن (جولائی ۱۹۰۳ء) چندر بھان برہمن (اگست ۱۹۰۳ء) فطرت موہانی (اگست ۱۹۰۳ء) راجہ انند رام مخلص (ستمبر ۱۹۰۴ء) محمد حسین الہ آبادی (اکتوبر ۱۹۰۴ء) کے بارے میں لکھا۔

حسرت موہانی کی تحریری کاوشوں میں سب سے اہم تذکرۃ الشعرا ہے۔ اس کے منصوبے کا اعلان انھوں نے جولائی ۱۹۰۳ء کے اردوئے معلیٰ میں کیا تھا اور اس سلسلے کے مضامین وہ مسلسل لکھتے رہے۔ پہلے دور میں انھوں نے تیس شاعروں پر مضامین لکھے اور اردوئے معلیٰ کے مختلف شماروں میں شائع کیے۔ یہ ان کی ادبی خدمات کا اہم ترین حصہ ہیں۔

حصہ نظم:

اردوئے معلیٰ کے ابتدائی حصے میں مضامین نثر ہوتے، آخری چند صفحات حصہ نظم کے لیے مخصوص ہوتے جن میں غزلیات اور نظمیں شامل ہوتیں۔ پہلے شمارے میں حصہ نظم کے ابتدائی صفحے پر انھوں نے شاعری بالخصوص غزل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھیں اعتراض تھا کہ:

> ''ان غزلوں کو دیکھیے جو سب کی سب ایک ہی رنگ میں رنگی ہوتی ہیں۔ ان کے بے کار ہونے کا ایک قطعی ثبوت یہ ہے کہ ان میں سوا دو ایک کے کسی انداز بیان میں کوئی خصوصیت نہیں نظر آتی۔ اگر غزلوں پر سے شعرا کے نام اڑا دیجیے تو کہیں بھی فرق باقی نہیں رہتا۔ جناب جلال، ذاکر حسین، یاس، شمشیر بہادر، انجم، عبدالحمید زیبا، ان سب کی غزلیں ایسی ہوتی ہیں کہ کسی ایک کی غزل کو ہم دوسرے کے نام سے بلا تکلف پڑھ سکتے ہیں''۔[۷]

انھوں نے اسی شذرہ میں حصہ نظم کی پالیسی کے بارے میں لکھا:

> ''بندہ چاہتا ہے کہ اول تو اردوئے معلیٰ میں حصہ نظم بہت کم ہو اور جو کچھ بھی ہو اس میں صرف وہ نظمیں اور غزلیں درج کی جائیں جن میں خوبی انداز بیان، ایجاد اور روانی کی ایسی کیفیتیں پائی جائیں کہ مصنف کے نام کے بغیر بھی بآسانی معلوم ہو سکے کہ کسی معمولی فکر کا نتیجہ نہیں ہے''۔[۸]

اردوئے معلیٰ کو اس عہد کے نامور اساتذۂ سخن کا تعاون حاصل رہا۔ ان کا کلام نظم اور غزل ہر دو صورتوں میں شائع ہوتا رہا۔

اردوئے معلیٰ اور سیاست:

حسرت موہانی اردوئے معلیٰ کے اجرا کے بعد بھی سیاست سے بے تعلق ہی رہے۔ طالب علمی کے زمانے میں اور اس کے فوری بعد وہ ذہن کو سیاست کے لیے تیار کرتے رہے۔ رسالے کے اجرا کے بعد مہینوں اس میں کوئی سیاسی مضمون شائع نہیں ہوا۔ اس نوعیت کی پہلی تحریر خواتین کی تعلیم کے علم بردار شیخ عبداللہ جنھوں نے علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی، کی تھی۔ ان کا مضمون ''مسلمان اور پالیٹکس'' فروری ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا جو ایک سوال کی صورت میں تھا کہ مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے کی خاطر کیوں نہ کانگرس سے وابستہ ہو جانا چاہیے کیونکہ اس وقت یہی ایک فعال سیاسی جماعت تھی۔ حسرت موہانی کا پہلا سیاسی مضمون ''مسلمان، کانگریس اور ایجی ٹیشن'' کے عنوان سے ستمبر ۱۹۰۴ء سے رسالہ کے جاری ہونے کے ۱۴ ماہ بعد شائع ہوا۔ اس میں ان کی فکر کی گہرائی ہے اور کسی بات کو استدلال کے بغیر نہیں پیش کیا ہے۔ جو لوگ حسرت موہانی کو محض ایک جذباتی سیاست دان باور کرتے ہیں وہ اس مضمون کو پڑھ کر ان کی فکر کی سلامت روی کے قائل ہو جائیں گے۔ مضمون رسالے کے چودہ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس وقت تک برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمان سرسید احمد خاں کے نظریات کے سحر کے زیر اثر تھے۔ سرسید کا خیال یہ تھا کہ مسلمان ۱۸۵۷ء کے بعد ہر لحاظ سے تباہ حال ہیں بالخصوص ان کی معاشی حالت دیگر اقوام ہند کے مقابلہ میں بدتر ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو صرف معاشی خوش حالی کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے اور اس کے لیے جدید اعلیٰ تعلیم ضروری ہے۔ وہ تعلیم کی طرف توجہ دیں، سیاست سے دور رہیں اور خاص طور پر کانگریس سے اجتناب برتیں کہ وہ خالص ہندوؤں کی جماعت ہے اور اس میں زیادہ تر

تعلیم یافتہ افراد شامل ہیں۔مسلمان تعلیم کی کمی سے ان کے برابر مقام حاصل نہیں کرسکیں گے۔حسرت موہانی نے ان دلائل کی تردید کی۔اس سلسلے میں چند ضروری اقتباس درج کیے جاتے ہیں:

''ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ سرسید کے زمانے میں وہ قوم کے مسلمہ رہنما تھے اور اس وقت مسلمانوں کے حق میں انھوں نے جو کچھ کیا بہتر کیا۔اگر انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رہنے کی نصیحت اس بنا پر کی کہ غدر کے بعد سرکار انگلشیہ مسلمانوں سے بدگمان تھی اور ان کو بغاوت کا ملزم سمجھتی تھی تو خوب کیا۔اگر انھوں نے مسلمانوں کی توجہ تمام معاملات ملکی سے علیحدہ کر کے صرف تعلیم کی جانب مائل کر دیا تو اور بھی خوب کیا۔اگر انھوں نے اس زمانے کے مسلمانوں کے لحاظ ان کی قابلیت کے یہ نصیحت کی کہ تم سرکار انگریزی کے لطف وعنایت پر قانع رہو اور اپنے طلب حقوق میں خود اپنی زبان نہ کھولو تو بھی ایک حد تک کچھ برا نہ کیا۔لیکن ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا زمانے کی اب تک وہی حالت ہے جو سرسید کے وقت تھی۔کیا سرکار انگریزی کو اب بھی کسی متنفس پر بغاوت کا شبہ ہے؟''[9]

حسرت موہانی نے ہر مخالف استدلال کا رد پیش کیا۔انگریزوں سے بھلائی کی امید کرتے ہوئے اپنے حقوق کی طرف سے غافل رہنے کے بارے میں انھوں نے لکھا:

''ممکن ہے سرسید کے زمانے میں کسی مصلحت سے گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ رعایت کرتی ہو لیکن اب کہ بارہا مسلمانوں نے رعایت کی درخواست کر کے دیکھ لیا کہ انگریز مروت ولحاظ کی وجہ سے کسی کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا عادی نہیں ہے وہ ان کی ذلیل درخواست کو ملامت کے ساتھ رد کر دیتا ہے اس پر بھی مسلمانوں کا اس غفلت امید پر پڑا رہنا ہزار افسوس کے لائق ہے''

''.....اس سے بڑھ کر ننگ وعار کا موجب اور کوئی امر ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی بہبودی وفلاح کے لیے خود کوشش نہ کریں بلکہ دوسرے کی عنایت پر بھروسہ رکھیں اور جائز حقوق کے طلب کرنے سے صرف ایک خیالی نفع کی امید میں باز رہیں''۔[10]

مسلمانوں کی تعلیم میں کمی کے حوالے سے انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ:

''مسلمان تعلیم میں دیگر اقوام ہند سے پیچھے ہیں اسی طرح ۲۵ سال کے بعد بھی رہیں گے یہ ضرور ہے کہ ۲۵ برس میں ہماری تعلیمی حالت میں بہت کچھ ترقی ہو جائے گی۔لیکن یہ بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ دیگر اقوام ہند بھی بحالت موجودہ قائم نہیں رہیں گی وہ بھی اسی نسبت کے ساتھ بلکہ اس سے زیادہ ترقی کریں گی۔کیونکہ ان کی رفتار ترقی ہم سے بہر حال زیادہ ہے۔ایسی حالت میں سوا اس کے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ ہم بھی مردانہ وار ابھی سے ہمت کر کے اس مقابلے میں درآئیں اور استقلال وپامردی کو کام میں لا کر کامیابی حاصل کریں ورنہ اس خیالی کمزوری اور خیالی امید ترقی سے اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ روز بروز ہماری حالت ردی ہوتی جائے گی''۔[11]

ایک خیال یہ بھی تھا کہ کانگریس پر ہندوؤں کا غلبہ ہے انھیں عددی برتری حاصل ہے اور ہمیشہ رہے گی۔مسلمانوں کی

آواز بوجہ ان کے اقلیت میں ہونے کے غیر موثر رہے گی۔حسرت موہانی نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا:

''بعض لوگ یہ بھی شبہ کرتے ہیں کہ اگر مسلمان کانگریس میں شریک بھی ہوئے تو یہ اس کے ایک جز وضعیف ہوں گے اور اس لیے نقصان میں رہیں گے لیکن ہم کہتے ہیں کہ کسی گروہ کی طاقت کا دارومدار اس کی تعداد پر نہیں ہوتا۔دیکھو کانگریس میں پارسیوں کا زور کس قدر ہے اور پھر یہ بھی دیکھو کہ ان کی آبادی ہندوستان میں کس قدر ہے۔اصل یہ ہے کہ قوت اصل میں قابلیت اور کوشش اور جہد کی ہے نہ کہ تعداد کی''۔[۱۲]

ان استدلال کے ساتھ حسرت موہانی نے مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے اور کانگریس سے وابستہ ہونے کی تلقین کی۔ اس مضمون کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اس سے متاثر ہو کر بڑی تعداد میں کانگریس سے وابستگی اختیار کی غلط ہوا۔سطحی ذہن رکھنے والے اسے حسرت کی ناکام اور غیر موثر تحریر قرار دیں گے لیکن ہمارے خیال میں باوجود اس کے کہ مسلمان کانگریس کی طرف تیزی سے راغب نہیں ہوئے اس تحریر نے مسلمانوں میں ایک اہم موضوع پر سوچ بچار کرنے اور اس کے متعلقہ امور پر تحریری اظہار خیال کرنے کی امنگ ضرور پیدا کی۔کیا یہ کم کامیابی ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی جمود سے نکالا، ذہنوں پر چھائی روایات کی دھند کو مٹایا، سیاست اور امور سیاست پر غور وفکر اور اظہار کی ہمت، حوصلہ اور جذبہ پیدا کیا۔اردو کے تمام رسائل اور اخبارات نے حسرت موہانی کی تائید یا مخالفت میں لکھا۔ہم یہاں ان مضامین کی جھلک پیش کرتے ہیں جو اس سلسلے میں اردوئے معلیٰ میں شائع ہوئے۔

مسلمان اور پالیٹکس از شیخ عبداللہ (فروری ۱۹۰۴ء)
مسلمان اور کانگریس از مسلمان (اپریل ۱۹۰۴ء)
مسلمان اور کانگریس از حسرت موہانی (نومبر ۱۹۰۴ء)
مسلمان اور کانگریس از قاضی کبیر الدین (نومبر ۱۹۰۴ء)
نیشنل کانگریس و مسلمان از برکت بھوپالی (مئی ۱۹۰۵ء)
پولیٹکل خودکشی از گنگا پرشاد ورما (اکتوبر ۱۹۰۵ء)
کانگریس اور مسلمان از حق پرست (مئی ۱۹۰۶ء)
مسلمانان ہند کا پولیٹیکل مستقبل از حسرت موہانی (جون ۱۹۰۷ء)
مسلمانوں کے جداگانہ حقوق از حاجی موسیٰ خاں (ستمبر ۱۹۰۷ء)

مسلمان اور کانگریس از حق پسند (مارچ ۱۹۰۴ء)
مسلمان نیشنل کانگریس اور ایجی ٹیشن از حسرت موہانی (ستمبر ۱۹۰۴ء)
مسلمان اور پالیٹکس از حیدر علی قریشی (دسمبر ۱۹۰۴ء)
نیشنل کانگریس از ذاکر حسین (فروری ۱۹۰۵ء)
پارٹی پالیٹکس از مسلمان (اگست وستمبر ۱۹۰۵ء)
ہندوستان کی مالی حالت از کشن پرشاد کول (نومبر ۱۹۰۵ء)
نیشنل کانگریس اور مسلمانان ہند از ملا عبدالقیوم (نومبر ۱۹۰۶ء)
ہندو مسلمانان در ہندوستان از برکت اللہ بھوپالی (جون ۱۹۰۷ء)
ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات از ضامن کنتوری (نومبر ۱۹۰۷ء)

ایک ہی موضوع پر اتنی نگارشات شائع کرنا دراصل موضوع سے عام دلچسپی کی غمازی ہے اور یہ کارنامہ حسرت موہانی اور اردوئے معلیٰ نے انجام دیا۔ان میں بعض مضامین حسرت کی تائید میں ہیں اور بعض مخالفانہ! یہ ایڈیٹر اردوئے معلیٰ کی انصاف پسندی ہے کہ انھوں نے دونوں کے ساتھ انصاف برتا۔

حسرت موہانی کے مضمون (ستمبر ۱۹۰۴ء) نے خصوصی طور پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کو متوجہ کیا۔اس مضمون کے ترجمے انگریزی اخبارات نے بھی شائع کیے۔کسی اخبار میں انگریزی ترجمہ پڑھ کر اس دور کے سب سے بڑے انقلابی مولانا برکت اللہ بھوپالی نے جو ان دنوں امریکہ میں مقیم تھے حسرت موہانی کے نام تعریفی خط لکھا اور ایک مضمون بغرض اشاعت روانہ کیا تھا۔اسے اردوئے معلیٰ کے مئی ۱۹۰۵ء کے شمارہ میں جگہ دیتے ہوئے حسرت موہانی نے تعارفی کلمات کے طور پر لکھا:

''ستمبر ۱۹۰۴ء کے پرچے میں کانگریس کے متعلق جو مضمون نکلا تھا اس کا انگریزی ترجمہ کسی اخبار میں دیکھ کر ہمارے ایک غائبانہ کرم فرما نے نیویارک سے ایک فارسی تحریر اس کی تائید میں بھیجی ہے جس کو ہم بجنسہ درج رسالہ کرتے ہیں''۔[۱۳]

حسرت موہانی اور مولانا برکت اللہ بھوپالی کی شناسائی کا سبب حسرت کا مضمون بنا۔ان دونوں استعمار دشمنوں کے درمیان خلوص اور مودت کا ایسا رشتہ قائم ہوا جو زندگی بھر نبھتا رہا[۱۴] مولانا بھوپالی کا دوسرا مضمون ''ہندو و مسلمانان در ہندوستان'' جون ۱۹۰۷ء میں چھپا۔ان کے دونوں مضامین فارسی میں من وعن شائع کیے گئے۔[۱۵]

ہندو مسلم اتحاد:

حسرت موہانی اور اردوئے معلیٰ کے سیاست کے حوالے سے دو نصب العین تھے۔ایک سیاست میں حصہ لے کر آزادی کی راہ ہموار کرنا، دوسرے اقوام ہند بالخصوص مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد قائم کرنا۔آزادی کی جدوجہد انھوں نے اس کے حصول تک جاری رکھی اور اتحاد کی کوششیں ۱۹۲۲ء تک کرتے رہے اور نا امید ہو کر اس سے دستبردار ہو گئے۔ابتدا میں ان کا خیال تھا کہ:

''جب از روئے تجربہ دو شخصوں میں اتحاد خیالات و اغراض بدرجہ اتم موجود نہیں ہوتا تو قوموں میں کیونکر ممکن ہے اور جب یہ حال ہے تو کیا اصول پالیٹکس کا یہ اقتضا نہیں ہے کہ جن معاملات میں دونوں گروہوں کے اغراض و مقاصد متحد ہوں کم از کم ان کے متعلق دونوں متفق ہو کر ایک دوسرے کی مدد کریں اور کیا یہ غایت درجہ کا اخلاقی اور ملکی جرم نہیں ہے کہ چند اختلافی مسائل کو بہانہ نفاق قرار دے کر ہندوستان کو ایک قوم بنانے کی اہم اور ضروری تجویز میں رخنہ اندازی کر کے ہندوستان کے دشمنوں کو قوت پہنچائیں''۔[۱۶]

حسرت موہانی کے ان دونوں مضامین ''مسلمان نیشنل کانگریس اور ایجی ٹیشن'' اور ''ہندو مسلم اتحاد'' کے پڑھنے کے بعد کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ نیشنلسٹ تھے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم باور کرتے تھے۔۱۹۴۷ء کے بعد بھارت سے وفاداری کی سند حاصل کرنے کی خاطر چند حضرات نے یہ شیوہ بنا لیا ہے کہ بشمول حسرت موہانی ہر مسلمان رہنما کو نیشنلسٹ ثابت کریں اور قائداعظم کے مقابلے میں لا کھڑا کریں۔

کانگریس کا غیر نامزد سفیر:

حسرت موہانی پہلی بار کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ بمبئی میں ۱۹۰۴ء میں شریک ہوئے۔اس کے بعد دو سال وہ سالانہ اجلاسوں کی کارروائی اردو میں لکھ کر اردوئے معلیٰ کے ضمیمے کے طور پر شائع کرتے۔اس طرح اردوئے معلیٰ کو کانگریس کا غیر سرکاری اور غیر نامزد سفیر بنا دیا۔اس کا معاوضہ کانگریس نے کسی نوعیت سے ادا نہیں کیا۔جنوری ۱۹۰۵ء میں ۲۰ ویں اجلاس منعقدہ بمبئی کی رپورٹ، ۲۱ ویں اجلاس کی رپورٹ جنوری ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئیں۔دسمبر ۱۹۰۷ء میں اعتدال پسندوں نے تلک پارٹی کو شکست دی۔یہاں تک کہ ان کو یا ان کے حامیوں کو تقریر کرنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔اسٹیج پر تلک کے ساتھ جسمانی تشدد کیا گیا۔اس رویے کی وجہ سے حسرت موہانی کانگریس سے بیزار ہو کر بے تعلق ہو گئے اور دسمبر ۱۹۰۷ء ہی میں ''کانگریس کا خاتمہ'' کے

عنوان سے مضمون شائع کیا۔

مزاحمت دفاعی:

حسرت موہانی نے سیاست میں ایک نئے طریق علم کو روشناس کرایا اور اس کو مزاحمت دفاعی یعنی Passive Resistance کا نام دیا۔ یہی طریقہ کار برسوں بعد گاندھی جی نے اپنایا اور اسے عدم تعاون اور ستیہ گرد قرار دیا۔ گاندھی جی کا فلسفہ دراصل حسرت موہانی سے مستعار ہے۔ حسرت موہانی نے ستمبر ۱۹۰۷ء میں ایک مضمون شائع کیا اور اس کی اہمیت جتائی:

''حاکم سے محکوم اپنے حقوق کو تین ہی صورتوں میں لے سکتے ہیں اول درخواست مرحمت کے ساتھ گدایانہ دست طلب دراز کر کے، جس کا بیکار جانا قطعی ثابت ہو چکا ہے۔ دوسرے خونریزی اور فساد کے ذریعے سے حاکم کو مغلوب و مجبور کر کے جس کی بظاہر حالات کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ پس اب ہمارے لیے سوائے اس کے اور کوئی کارروائی مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ فی الحال نہ تو ہم گداگری کی ذلت گوارا کریں نہ جنگ وجدال کی آزمائش میں پڑیں بلکہ ان دونوں سے علیحدہ ہو کر دفاعی مزاحمت کے اس درمیانے طریقے پر چلنا شروع کر دیں جو مفید ہونے کے بجائے کبھی مضر ہو ہی نہیں سکتا''۔ [۱۷]

سدیشی تحریک:

حسرت موہانی اور اردوئے معلیٰ سدیشی تحریک کے زبردست حامی تھے۔ اس سلسلے میں چند باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ تحریک گاندھی جی کی چلائی ہوئی ہے جو غلط ہے۔ سدیشی تحریک سے مراد غیر ممالک کے تمام اشیا سے اجتناب تھا تاکہ ملکی صنعت کی ترقی ہو اور ہر شے کم داموں میں دستیاب ہو سکے۔ گاندھی جی نے ''چرخہ چلاؤ اور کھادی پہنو'' مہم شروع کر کے ترقی معکوس کا ثبوت دیا۔ ان کی تحریک کپڑے تک محدود رہی دیگر اشیا کے لیے ممالک غیر کے دست نگر رہنے سے اجتناب نہیں کیا۔ چنانچہ حسرت موہانی کی صاحبزادی نعیمہ بیگم نے بھی لکھا ہے کہ:

''عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ سدیشی تحریک کانگریس نے چلائی ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ مولانا اس کے بانی تھے''۔ [۱۸]

۲۔ سدیشی تحریک کے ذریعے سے ملکی معیشت کو سدھارنے کے علاوہ غیر ملکی مال بالخصوص برطانیہ کے مال کا استعمال ترک کرنا بھی ضروری تھا۔ بغیر بدیسی مال کے بائیکاٹ کی تحریک بے معنی ہو جاتی۔ اس طرح یہ معاشی تحریک کے ساتھ سیاسی تحریک بھی تھی مگر کانگریس کے اعتدال پسندوں کی نظر میں مناسب نہ تھی بالخصوص موتی لال نہرو نے اس کے خلاف مختلف دلائل پیش کیے۔ ان کے جواب میں حسرت موہانی کو ''نرم فریق کی بعض غلط فہمیاں'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھنا پڑا جو اگست اور ستمبر ۱۹۰۷ء کے شماروں میں شائع ہوا۔

مسلم لیگ کا قیام:

۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی تاسیس ہوئی۔ حسرت موہانی نے اس کے قیام کے حوالے سے ملے جلے ردعمل کا اظہار کیا۔ وہ اس امر پر خوش تھے کہ مسلمانوں نے سیاست سے بے تعلق رہنے کے رجحان کو تبدیل کیا اور اپنے لیے ایک نیا پلیٹ

فارم تیار کرلیا۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ''آ ثار زمانہ نے آخر مسلمانوں کو بھی پالیٹکس میں حصہ لینے پر مجبور کردیا اور ڈھاکہ میں تعلیمی کانفرنس کے بعد بصدارت وقار الملک مسلم لیگ کا پہلا اجلاس منعقد ہوا''[۱۹] لیکن آ ثار یہ بتا رہے تھے کہ اس پر اعتدال پسندوں اور سرکار پرستوں کا غلبہ رہے گا اس لیے لکھا:

''اخلاقی مسائل نیز معاملات خصوصی پہ اسلام میں مسلم لیگ کی جداگانہ پالیسی ہوگی لیکن متفق علیہ مسائل میں مقاصد کانگریس کی تائید کی جائے گی تو ہم اس لیگ کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہیں ورنہ بصورت دیگر نواب ڈھاکہ کی تجویز کے لیے ہم کو یہ کہنے میں باک نہ ہوگا کہ ایں ہمہ فتر بچہ است''۔[۲۰]

اردوئے معلّٰی کے دور اول کا خاتمہ:

حسرت موہانی سے علی گڑھ کی انتظامیہ ناخوش تھی بالخصوص اس لیے کہ وہ کالج کے طلبہ کو باغی بنا رہے تھے اور اردوئے معلّٰی ان میں دن بدن مقبول ہو رہا تھا وہ رسالہ بند کرنے کے بہانے تلاش کر رہے تھے۔ ایسے میں انھوں نے ایک بے ضرر سے مضمون ''مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی'' کے زیر عنوان ''مسلمان طالب علم'' کا مضمون شائع کر دیا جس میں اعداد و شمار سے ثابت کیا گیا تھا کہ مصر میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد اصلاحات کے نام پر جو کھیل کھیلا گیا اس کے نتیجہ میں مدارس اور مدرسین کی تعداد گھٹ کر رہ گئی ہے[۲۱]۔ اپریل ۱۹۰۸ء میں شائع شدہ مضمون ''مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی'' کو قابل اعتراض قرار دے کر زیر دفعہ ۱۲۴ الف قانون تعزیرات ہند حسرت موہانی پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر کے ۲۳/جون ۱۹۰۸ء کو انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ مجسٹریٹ علی گڑھ کی عدالت میں مقدمہ چلا، ۴/اگست ۱۹۰۸ء کو مجسٹریٹ نے انھیں ۲ سال قید بامشقت اور ۵۰۰ روپے جرمانہ کی سزا دی۔ حسرت موہانی کے والد نے الہ آباد ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ اس میں سزا کم ہو کر ایک سال قرار پائی لیکن جرمانہ باقی رہا۔ حسرت موہانی کی گرفتاری کے ساتھ ہی اردوئے معلّٰی بند ہو گیا۔ دور اول کا آخری شمارہ اپریل ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اردوئے معلّٰی کے دور اول میں ایک خصوصی شمارہ مصر کے انقلابی رہنما ''مصطفیٰ کامل'' کی یاد میں فروری/مارچ ۱۹۰۸ء میں چھپا تھا۔

اردوئے معلّٰی کا دوسرا دور:

حسرت موہانی قید فرنگ اولی سے ۱۹ جون ۱۹۰۹ء کو رہا ہوئے۔ چند دنوں بعد انھیں اردوئے معلّٰی کے اجرا کا خیال ہوا تو معلوم ہوا علی گڑھ کا کوئی پریس اسے چھاپنے پر تیار نہیں۔ انھوں نے کاٹھ کا معمولی سا پریس قائم کرلیا اور اس کا نام ''اردو پریس'' رکھا۔ اس وقت کی ان کی حالت کا نقشہ مولانا ابوالکلام نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''حسرت موہانی جب قید سے رہا ہو کر آیا تو کوئی چیز اس دنیا میں ایسی نہ تھی جو اس کے لیے ذریعہ تقویت نان بن سکتی۔ ڈیڑھ دو روپیہ ماہوار کرایہ کا ایک جھونپڑا ہے جس کے اندر ایک چھوٹی سی صحنچی اور ایک کوٹھری ہے اور باہر بھی اتنی ہی مکانیت ہے۔ اندر وہ فقیر حریت مع اپنی کوہ عزم ثبات بیوی کے خود رہتا ہے اور باہر ایک کاٹھ کا دستی پریس اور دو چار پتھر ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ خود اس نے اپنے ہاتھوں سے اردوئے معلّٰی کی کاپیاں لکھی ہیں خود ہی پتھر پر چڑھائی ہیں اور خود پریس کو چلا کر چھاپا ہے۔ یہ کل کائنات اردو پریس اور اس کے مالک کی ہے۔ کوئی دوسرا ذریعہ آمدن نہیں اور نہ اس کی طبع غیور کسی کی شرمندہ احسان ہونا پسند کرتی ہے۔ اردوئے معلّٰی کے دو چار سو خریدار ہیں۔ اس کی قیمت سے شاید چند روپیہ مہینے میں بچے

رہتے ہیں اس سے دو وقت کی روٹی کھا کر نشہ آزادی کی بے خودی اور دولت لازوال حق و صداقت کی غنائے غیر فانی میں مست رہتا ہے''۔[۲۲]

اردوئے معلیٰ کی دوبارہ اشاعت اکتوبر ۱۹۰۹ء سے شروع ہوئی۔اس وقت ان کے دوستوں اور خیر خواہوں نے انھیں سمجھایا کہ وہ حکومت کے معاملات میں نرم روی اختیار کریں۔اپنی تحریروں کے ذریعے سے مزید دشواریوں اور مشکلوں کو دعوت نہ دیں۔ان احباب کا رسالے میں شکریہ ادا کرتے ہوئے انھوں نے اپنے نصب العین کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''ہم پر تمام نیک نیت مشوروں اور مصلحت کوش صلاحوں کا شکریہ فرض ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یقین یا عقیدہ عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی ایک ایسی چیز ہے جس کو کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں بدترین گناہ ہے جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں ارادہ بھی پیدا نہیں ہو سکتا''۔[۲۳]

اس کے ساتھ انھوں نے واضح طور پر اپنی سیاسی پالیسی کا اعلان کیا:

''پالیٹکس میں ہم مقتدائے وطن پرستاں مسٹر تلک اور سرگروہ احرار بابو آرہندو گھوش کی پیروی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں۔اس حیثیت سے فیروز شاہی کانگریس سے ہم کو اتنی ہی بیزاری ہے جتنی امیری مسلم لیگ یا نوزائیدہ لال چند کانفرنس سے اور ہمارے خیال میں یہ حق بجانب ہے اس لیے کہ دنیا کی رفتار اور اہل دنیا کے طباع کا میلان صریحاً حریت کی جانب ہے چنانچہ خوابیدہ براعظم ایشیا میں بھی ہندوستان کے سوا اور کوئی بڑا ملک آزادی کی نعمت سے محروم نہیں ہے۔پس عقل سلیم کس طرح باور نہیں کر سکتی کہ تمام عالم میں صرف ہندوستان ہی ایسا ملک باقی رہے جس کی قسمت میں محکوم دوام کی ذلت لکھ دی گئی ہو۔ارباب دانش کو یہ بات ماننی پڑے گی کہ فرنگی حکومت کا غیر طبعی نظام ہمیشہ کے لیے ہندوستان میں باقی نہیں رہ سکتا اور اپنی موجودہ صورت میں تو اس کا چند سال قائم رہنا بھی دشوار نظر آتا ہے''۔[۲۴]

وہ حکومت اور انگریز حاکموں پر سخت تنقید کرتے رہے جب منٹو مارلے اصلاحات کا نفاذ ہوا تو انھوں نے ''نیا جال لائے شکاری'' کے عنوان سے اسے حکمرانوں کا دھوکا قرار دیا کیونکہ نام نہاد اصلاحات سے ہندوستانیوں کو فیض پہنچنے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ (اکتوبر ۱۹۰۹ء) گورکھ پور میں گورنر یو۔پی مسٹر جیمس مسٹن نے تقریر کرتے ہوئے ہندوستانیوں سے جس رویے کی توقع کا اظہار کیا تھا اس کا سخت نوٹس لیا (فروری ۱۹۱۳ء) اسی طرح ملکی معاملات میں ان کے متعدد مضامین چھپے جیسے علی گڑھ کالج میں بائیکاٹ کی تحریک (مارچ ۱۹۱۳ء) آرہندو گھوش کے خلاف خواجہ حسن نظامی نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کی رد میں مضمون (جنوری ۱۹۱۳) اور جب مسلم لیگ نے دسمبر ۱۹۱۲ء میں سلف گورنمنٹ کے حصول کو اپنے اغراض و مقاصد میں شامل کیا تو اس کے اس اقدام کی ستائش (جنوری ۱۹۱۳ء)

بیسویں صدی کی دوسری دہائی مسلمانان عالم کے کرب والم کی تاریخ ہے۔سارا یورپ مسلمانوں کی عظیم سلطنت ترکیہ کا دشمن بنا ہوا تھا اس کے علاوہ جہاں جہاں مسلم اقتدار طاقت پکڑ رہا تھا وہاں ریشہ دوانیوں کے ذریعے سے اس کی شکست و ریخت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی تھی۔اس کا خاکہ حسرت موہانی نے اس طرح پیش کیا:

''اہل یورپ کی ہوس ملک گیری اور تاخت وتاراج کی بدولت دنیائے اسلام آج کل ایک عجیب مصیبت میں مبتلا ہے۔ انگریز مصر سے آج نکلتے ہیں نہ کل بفرانس اور انگلستان کے بھروسے پر ہی علی الرغم جرمنی مراکو کی قدیم اسلامی سلطنت کو اپنی قلمرو میں شامل کر چکا ہے۔ روس شمالی ایران پر غاصبانہ قبضہ حاصل کرنے کی کوشش میں ہے اور اٹلی کو ترکوں کے افریقی طرابلس کو ہضم کر جانے کی فکر دامن گیر ہے۔ سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ قضیۂ مراکو کی مانند ایران وطرابلس کے معاملے میں بھی روس اور اٹلی کو انگلستان سے کسی نہ کسی طرح مدد مل رہی ہے۔ روس کی کل کارروائی ایڈورڈ گرے کے مشورے یا علم کے بعد عمل میں آتی ہے اور اٹلی کو انگلستان کی غیر جانبداری نے زیادہ فائدہ پہنچایا ہے''۔[۲۵]

حسرت موہانی کی گہری نظر ملکی معاملات ہی پر نہ تھی بلکہ وہ عالمی بالخصوص مسلمانوں کے معاملات سے بھی خوب واقف تھے ان کا تجزیہ کرتے اور ظالم ومظلوم کے درمیان حد فاصل قائم کرتے اس سلسلہ میں جو مضامین اردوئے معلیٰ میں شائع ہوئے ان کی ایک جھلک:

پین اسلام ازم اور مصر: جولائی ۱۹۱۱ء خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر لکھا گیا مضمون ''مسلمانان ہند پر جنگ اٹلی وترکی کا اثر (نومبر ۱۹۱۱ء) مسلمانان مصر اور طرابلس (اپریل ۱۹۱۲ء) جنگ بلقان (۱) دسمبر ۱۹۱۲ء۔ جنگ بلقان (۲) جنوری ۱۹۱۳ء)

اردوئے معلیٰ، دور دوم اور ادبیات

اس دور میں بھی اہم علمی وادبی مضامین شائع ہوئے۔ مثلاً:

انیس کا ابتدائی اور انتہائی کلام از شوکت بلگرامی	جون ۱۹۱۰
انیس کا ابتدائی اور انتہائی کلام از شوکت بلگرامی	نومبر ۱۹۱۰
مکتوبات امیر مینائی (۱) از حسرت موہانی	اپریل ۱۹۱۱ء
مکتوبات امیر مینائی (۲) از حسرت موہانی	مئی ۱۹۱۱ء
متسلی از حسرت موہانی	جنوری ۱۹۱۲ء
مروجہ پردے کا شرعی ثبوت (ماخوذ)	اپریل ۱۹۱۲ء
سوانح مولوی آل حسن از حسرت موہانی	مئی ۱۹۱۲ء
شمس العلما نذیر احمد از حسرت موہانی	جون ۱۹۱۲ء
موت اور بقا از آزاد بجانی	جنوری ۱۹۱۳
دلیر مارہروی از احسن مارہروی	جنوری۔ مارچ ۱۹۱۳ء
لفظ قم کی تحقیق از عیش امروہوی	اپریل ۱۹۱۳ء

ان مضامین میں دو کی صراحت ضروری ہے۔ ''مکتوبات امیر مینائی'' کے زیر عنوان مضمون دو آتشہ ہے۔ ایک اس کتاب پر تبصرہ ہے جو امیر مینائی کے شاگرد احسن اللہ خاں ثاقب ایڈیٹر رسالہ ''قند پارسی'' نے مرتب کی تھی۔ اس میں خطوط کے تنوع کا ذکر کرتے ہوئے بعض خطوط کے اقتباسات بھی دیے گئے ہیں۔ دوسرے امیر اور داغ کے انداز شاعری پر تنقیدی نظر ہے۔

اس مضمون کا مناسب عنوان ''موازنہ امیر و داغ'' ہی ہوتا کیونکہ یہی غالب عنصر ہے۔ دوسرا مضمون ''متسلی'' ہے یہ ایک نیا لفظ ہے جس کو وہ اردو میں رواج دینا چاہتے تھے اس کے بارے میں لکھا اور یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اس کے معنی ہیں تسلی پانے والا، اور مزید وضاحت کی ہے۔

تذکرۃ الشعرا:۔ تذکرۃ الشعرا کے جس منصوبے کا حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ جولائی ۱۹۰۳ء میں کیا تھا اس کا اعادہ اکتوبر ۱۹۰۹ء میں کیا اور تقریباً ہر شمارے میں کسی نہ کسی شاعر کے احوال اور نمونہ کلام ضرور شائع کیے۔ اس دور میں ان کے (۵۵) تراجم شائع ہوئے۔[۲۶]

مشاہدات زندان:۔ حسرت موہانی نے اپنے ایام اسیری کے کوائف نہایت تفصیل سے اور حقائق پر مبنی تحریر کیے۔ اس میں ذاتی تاثرات بھی شامل ہیں۔ ''مشاہدات زنداں'' کی قسطیں جنوری ۱۹۱۰ء سے جنوری ۱۹۱۱ء تک شائع ہوتی رہی۔ بعد میں یہ کتابی صورت میں بھی چھپیں۔ چونکہ یہ زندان سے متعلق ہے اس لیے اسے بھی ''زندانی ادب'' میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ زندانی ہی سے متعلق حسرت موہانی کے اور دو مضامین (۱) فرنگی جیل خانوں میں کالے اور گورے کی تمیز (اپریل ۱۹۱۰ء) (۲) ہندوستان کے پولیٹیکل قیدی (مئی ۱۹۱۰ء) چھپے تھے لیکن ان کو مشاہدات زندان میں شامل نہیں کیا گیا۔

گلدستہ حسرت:۔ ایام اسیری میں جو غزلیں کہی تھیں ان کو کسی طرح محفوظ رکھا اور انھیں ردیف وار بالاقساط اکتوبر ۱۹۰۹ء سے شائع کرنا شروع کیا یہ سلسلہ ستمبر ۱۹۱۰ء میں ختم ہوا۔ ان جملہ ۴۴ غزلیات کو ''حسب فرمائش جناب احسن اللہ خاں ثاقب مدیر 'قند پارسی' سید فضل الحسن نے اپنے اردو پریس میں چھاپا اور شائع کیا''[۲۷] یہ بلاشبہ زندانی ادب ہے۔ اس میں ایک طویل دیباچہ بھی ہے جس سے جیل کے حالات معلوم ہونے کے علاوہ کلام کو کس طرح محفوظ رکھا گیا اس کی وضاحت بھی ہے۔

اردو کے قدیم گلدستے:۔ ان کے بارے میں حسرت موہانی رقمطراز ہیں:

> ''اپنے تذکرے کے لیے دریافت حال اور تلاش کلام شعرا کے سلسلے میں اردو زبان کے تقریباً کل مطبوعہ و غیر مطبوعہ دواوین اور تذکروں کے علاوہ ہم نے قدیم گلدستوں کی بھی اکثر جلدیں بہم پہنچائی ہیں۔ اپنے زمانہ حیات میں یہ گلدستے اچھے سمجھے جاتے ہوں یا برے، کامیاب ہوں یا ناکام، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرور ایام نے ان میں ہر ایک کو بجائے خود تاریخی اور ادبی دلچسپیوں کا ایک ایسا مجموعہ بنا دیا ہے جس کا مطالعہ کسی حالت میں تضیع اوقات کا موجب نہیں ٹھہرتا پس ہمارے خیال میں گزشتہ صدی کے بعض مشہور گلدستوں کی مختصر کیفیت کا تفریح ناظرین کے لیے اردوئے معلیٰ کے پرچے میں سلسلہ وار شائع ہو جانا خالی از لطف نہ ہوگا''۔[۲۸]

حسرت موہانی کے پاس گلدستوں کا جو ذخیرہ تھا انھوں نے اس کی فہرست مع ان کے سال اجرا کے اس طرح دی ہے:
گلدستہ شعرا لکھنو (۱۸۷۴ء) گلکدہ ریاض خیر آباد (۱۸۷۹ء) نتیجہ سخن (کلکتہ: ۱۸۸۴ء) پیام یار (لکھنو: ۱۸۸۴ء) تحفہ عشاق (لکھنو: ۱۸۸۴ء) کرشمہ دلبر (خیر آباد: ۱۸۸۵ء) ریاض سخن (مراد آباد: ۱۸۸۵ء) فتنہ و عطر فتنہ (خیر آباد: ۱۸۸۵ء) نقہ بہار (لکھنو: ۱۸۸۶ء) گلدستہ کیف (اناؤ: ۱۸۸۹ء) دامن بہار (آگرہ) گلچین (لکھنو: ۱۸۹۳ء) انتخاب (لکھنو: ۱۸۹۳ء) تصویر عالم (لکھنو: ۱۸۹۳ء) ریاض سخن (لکھنو: ۱۸۹۷ء) خدنگ نظر (لکھنو: ۱۸۹۷ء) معیار (لکھنو: ۱۸۹۸ء) ہماری نظر سے

اردوئے معلیٰ میں حسب ذیل گلدستوں پر تعارفی مضامین گزرے ہیں ۔گلدستہ شعرا (ستمبر ۱۹۱۱ء) گلکدہ ریاض: نومبر ۱۹۱۱ء، پیام یار: مئی ۱۹۱۲ء، نشہ وعطر فتنہ: جنوری ۱۹۱۳ء، گلدستہ نتیجہ سخن: نومبر ۱۹۱۳ء۔

اردو پریس کا خاتمہ اردوئے معلیٰ کی بندش

اردوئے معلیٰ دوسرے دور میں ۴۴ ماہ شائع ہوا اور حکومت کی آنکھوں میں کانٹا بنا کھٹکتا رہا ۔بالآخر حکومت کی مشنری حرکت میں آئی اور بغیر وجہ بتلائے اردو پریس سے ضمانت طلب کی ۔اس کی تفصیل حسرت موہانی نے اس طرح بیان کی ہے:

''۱۳ مئی ۱۹۱۳ء کو نو بجے کے قریب علی گڑھ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بذات خود وارد ہو کر راقم الحروف کے سامنے حکومت کی جانب سے ایک نوٹس پیش کیا جس کا مفہوم تھا کہ اردو پریس میں چونکہ ازروئے پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء چند الفاظ خلاف چھپے ہیں اس لیے ایک ہفتے کے اندر تین ہزار روپیہ کی ضمانت مجسٹریٹ ضلع کے پاس جمع کرنا چاہیے ۔واضح ہو کہ اردو پریس کی کل کائنات لکڑی کا پریس اور دو چھروں پر مشتمل ہے جس کی مجموعی قیمت پچاس روپیہ سے زائد نہیں ۔ایسے بے بضاعت پریس سے تین ہزار روپیہ طلب کرنا مضحکہ خیز ہونے کے علاوہ کینہ پروری کی حد تک پہنچ گیا ہے جس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اردو پریس کے کسی صورت جاری رہنے کا امکان باقی نہ رہے ۔خیر مئی ۱۹ کو پریس بند ہو جائے گا مگر بند ہو کر اپنے بعد مسٹر جیمس مسٹن کا یہ افسانہ اپنی یادگار چھوڑ جائے گا کہ آپ نے ایک بے مایہ پریس سے اتنی کثیر رقم طلب کی جس سے زیادہ اس وقت تک شاید ہندوستان میں کسی بڑے سے بڑے اسٹیم پریس سے بھی نہیں کی گئی۔''[۲۹]

یہ تو تھی حقیقت حال اور اب حسرت موہانی کا ردعمل بھی دیکھیے:

''ایک بات البتہ قابل اطمینان اور لائق ستائش ہے وہ یہ کہ اس قسم کے نوٹس سے راقم الحروف کو کسی قسم کا مالی، جسمانی یا روحانی صدمہ نہ اس وقت پہنچا ہے اور نہ آئندہ پہنچے گا کہ ان کی ناراضی کیسی ہی مہیب اور اہم کیوں نہ ہو ہم سے آزاد فقیروں کا اس سے مرعوب ومغلوب ہونا کسی صورت میں ممکن نہیں ۔

.....ہم نے اپنے دل میں عہد کیا ہے کہ ان تمام تحریکوں کی اعانت ہر حال میں اور ہر وقت اپنے اوپر لازم سمجھیں گے ۔اگر تحریر کے ذریعے ممکن نہ ہوگا تو تقریر کے ذریعے اور اس سے نہ ہو سکے گا تو عملی کارروائی سے جو تحریر وتقریر دونوں سے زیادہ مفید ہے اور زیادہ ضروری ہے ۔اس سے ہم کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔''[۳۰]

۱۳ مئی ۱۹۱۳ء کو نوٹس ملا ۱۹ مئی کو اردو پریس بند ہو گیا ۔ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں حسرت موہانی نے جون ۱۹۱۳ء کا شمارہ شائع کیا یہ اس دور کا آخری پرچہ تھا اس کے بعد تقریباً ۱۲ برس تک محض اس کی یاد باقی رہی ۔

اردوئے معلیٰ کا تیسرا دور

اردوئے معلیٰ کا تیسرا دور جنوری ۱۹۲۵ء سے شروع ہوا جبکہ حسرت موہانی نے اس کے لیے جدید پالیسی اختیار کی اور اسے سیاست سے کاملاً الگ رکھنے کا خیال ظاہر کیا ۔اس بار تبدیلی سکونت کی وجہ سے اس کا اجرا کانپور سے ہوا ۔اس دور کے بارے

میں امداد صابری اطلاع دیتے ہیں کہ:

''اردوئے معلیٰ کا بیشتر حصہ ادب، تاریخ، فلسفہ اور بزرگان دین کے لیے وقف ہوگیا تھا۔ابتدا کے ادوار میں سیاسی مضامین کی جو شدت تھی ان میں کافی کمی نظر آتی ہے''۔ [۱۳]

رسالے کی نوعیت کے بارے میں حسرت موہانی نے صراحت کی کہ: ''اردوئے معلیٰ کے اس جدید دور میں اکثر مضامین کا سلسلہ اس انداز سے جاری رہے گا کہ آخر میں ان کا ایک مجموعہ علیحدہ علیحدہ مرتب ہوکر کئی مستقل کتابوں کی شکل اختیار کرے گا۔مثلاً:

۱۔ارباب سخن: یہ اردو شعرا کا ایک مکمل تذکرہ ہے اس کے آٹھ طبقے قرار دیے گئے ہیں۔ان طبقات میں ہفتم و ہشتم کے اکثر شعرا کے نام زیر عنوان ''معاصرین حسرت'' ایک قطعہ میں درج کیے گئے ہیں۔آئندہ ہر ماہ ان معاصرین موجودہ و مرحومین ہی سے کسی ایک کا تذکرہ بالالتزام شائع ہوا کرے گا۔

۲۔شجرہ طیبہ قادریہ رزاقیہ میں جن بزرگان دین کے نام موجود ہیں ان میں سے بھی کسی نہ کسی بزرگ کے حالات درج ہوں گے۔

۳۔کتاب ''نکات سخن'' کے ۸ صفحات ماہوار چھپیں گے۔

۴۔انتخاب سخن: اردو دواوین کا انتخاب ہے ان میں سے شاہ قاسم کا مکمل انتخاب پہلے پرچے میں بطور ضمیمہ موجود ہے۔آئندہ ہر ماہ انتخاب دواوین اساتذہ کے ۱۶ صفحے برابر شائع ہوا کریں گے۔''

گویا، تیسرے دور میں اردوئے معلیٰ کتابوں کی قسطوں کے لیے وقف رہا۔اس دور میں رسالہ کبھی وقت پر شائع نہیں ہوا۔یہاں تک کہ چھ چھ ماہ کے مشترکہ شمارے نکلے حالانکہ بارہا اس کی باقاعدہ اشاعت کا وعدہ کیا گیا۔اگست ۱۹۲۷ء میں لکھا کہ:

''آئندہ سے ۴/۱۲ (سوا دو) جزو کا رسالہ وقت پر نکلا کرے گا جس میں تذکرۃ الشعرا کے آٹھ صفحات کتاب سخن کے دوسرے حصے یعنی معائب سخن کے آٹھ صفحات اور کتاب انتخاب سخن یعنی انتخاب دواوین اساتذہ کے ۱۶ صفحے بالالتزام ہوا کریں گے۔ٹائٹل کا دوسرا صفحہ تنقید رسائل و کتب کے لیے اور تیسرا غزلیات جدید کے لیے سبق سابق محفوظ رہا کرے گا''۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں یہ وعدہ دہرایا گیا جو پورا نہیں ہوا۔رسالے میں ادبی اور سیاسی مضامین شائع ہی نہ ہوئے جن کتابوں کی اقساط شائع ہوئیں وہ حسرت موہانی کی اپنی تالیفات تھیں۔

نکات سخن:۔ یہ ابواب متروکات سخن، معائب سخن و محاسن سخن پر مشتمل ہے۔متروکات سخن کی ابتدائی ۵ قسطیں رسالہ مخزن لاہور اپریل ۱۹۰۲ء، مئی ۱۹۰۲ء، جولائی ۱۹۰۲ء، نومبر ۱۹۰۲ء اور مارچ ۱۹۰۵ء میں چھپ چکی تھیں۔ان کو دوبارہ اردوئے معلیٰ میں جنوری ۱۹۲۵ء سے شائع کرنا شروع کیا جو دسمبر ۱۹۲۶ء میں مکمل ہوا اور ''متروکات سخن'' کتابی صورت میں ۱۹۲۹ء میں چھپی۔کتاب نکات سخن کا دوسرا باب معائب سخن اردوئے معلیٰ میں جنوری ۱۹۲۷ء سے دسمبر ۱۹۲۹ء کے دوران قسطوں میں چھپا اور ۱۹۲۹ء ہی میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔محاسن سخن کی اشاعت ستمبر ۱۹۲۹ء سے جولائی ۱۹۳۰ء تک ہوئی بعد تکمیل اسے ۱۹۲۹ء ہی میں کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔نکات سخن کے مجوزہ ابواب نوادر سخن اور اصلاح سخن لکھے ہی نہیں گئے۔ابواب متروکات سخن،، معائب سخن اور محاسن سخن کو نکات سخن کے نام سے کانپور سے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا گیا۔

ارباب سخن: ۔ اس کی اقساط جنوری ۱۹۲۵ء سے دسمبر ۱۹۲۷ء تک چھپیں ۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے ۔ پہلے حصہ کی نوعیت تذکرۃ الشعرا کے منصوبے کی ہے جس میں شعرا کے حالات بہ انداز تذکرہ ۵ حصوں میں لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے ۔ ارباب سخن کے دوسرے حصے میں اساتذۂ فن کے شجرے میں ان کے شاگردوں کے سلسلے کو ظاہر کیا ہے ۔ تیسرے حصے میں شجرہ میں موجود شعرا کو عام ترتیب میں بیان کیا ہے ۔ اس میں ۱۴۵۰ شعرا کے نام ہیں جن کے حالات حسرت لکھنا چاہتے تھے ۔[۳۲]

اس دور میں دواوین کے انتخاب لازماً ہر شمارہ میں شامل رہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ اس کے لیے وقف ہو گیا تھا ۔ انتخاب دواوین کا سلسلہ جون ۱۹۱۱ء سے شروع ہوا تھا جو مارچ ۱۹۴۲ء تک جاری رہا ۔ اس سلسلے میں حسرت موہانی نے ڈیڑھ سو سے زائد شاعروں کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دواوین سے کلام منتخب کیا ہے ۔ انتخاب سخن (گیارہ جلدیں) اس کی آخری شکل ہے ۔

سیاسی مضامین نہ چھاپنے کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ وہ اخبار ''مستقل'' نکالنا چاہتے تھے اور اس کو سیاست کے لیے وقف رکھنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ اواخر ۱۹۲۸ء میں یہ اخبار منصۂ شہود پر آیا ۔ حسرت موہانی کے چند سیاسی خطبات اس دور کے رسالے میں شائع ہوئے جیسے:

خطبہ صدارت تحفظ آثار متبرکہ حجاز منعقدہ لکھنو: بتاریخ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۵ء (اگست تا ستمبر ۱۹۲۵ء)

خطبہ استقبالیہ آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس منعقدہ کانپور، بتاریخ ۲۶ دسمبر ۱۹۲۵ء (اپریل تا جون ۱۹۲۶ء)

خطبہ صدارت جمعیۃ العلماء صوبہ متحدہ منعقدہ لکھنو بتاریخ ۸/۹ اگست ۱۹۳۰ء (جنوری تا جون ۱۹۳۱ء)

اس دور کے دو مضامین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ ان میں ایک نشاط النساء کی رحلت پر لکھا گیا تاثراتی مضمون ہے یوں تو حسرت موہانی کا معمول تھا کہ ہر واقف کار کی رحلت پر رسالہ میں تعزیت ضرور کرتے لیکن بیگم حسرت کی وفات پر انھوں نے صرف غم نہیں منایا بلکہ ان کے اعلیٰ صفات کو ضبط تحریر میں لا کر ان کے کردار کو لازوال بنا دیا ہے ۔

> ''خدا گواہ کہ راقم کے اس قول میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ ایثار و انکسار، حیا و غیرت، محبت و مروت، فہم و فراست، جرأت و صداقت، عزم و ہمت، وفا و سخا، حسن عقیدت، صدق نیت و خلوص عبادت، حسن خلق، صحت مذاق، پاکی و پاکیزگی، صبر و استقلال اور سب سے بڑھ کر عشق رسول اور محبت حضرت حسن کے لحاظ سے شاید مسلمان عورتوں بلکہ مردوں میں بھی آج ہندوستان میں کم ایسے افراد ہوں گے جن کو ہم بیگم حسرت سے بہتر تو کیا ان کے برابر بھی قرار دے سکیں'' ۔ (اردوئے معلیٰ: مئی جون ۱۹۳۷ء)

ان کی قوت ارادی اور قوت ایمانی بھی کم لوگوں میں دیکھنے آئے گی ۔ اس بارے میں لکھا کہ:

> ''سلسلہ علالت کئی سال سے جاری تھا ۔ سال بھر بیمار رہتی تھیں لیکن موسم حج کے قریب اس قدر صحت حاصل کر لیتی تھیں کہ حج کے لیے میرے ساتھ جانے میں بظاہر کوئی دشواری نظر نہ آتی ۔ چار سال یہی حال رہا ۔ آخری بار ۱۳۵۴ھ (۱۹۳۶ء) میں براہ عراق سفر حج کے وقت البتہ وہ اس قدر کمزور اور بیمار تھیں کہ ان کو ساتھ لے جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی مگر ان کی دل شکنی اور مایوسی کا خیال بھی سوہان روح تھا ۔ مجبوراً مجھ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ بصرہ تک جہاز اور وہاں سے بغداد تک ریل میں جانا چونکہ نسبتاً آسان ہے اس لیے ان کو وہیں چھوڑ دوں گا اور صحرائے عرب کے ۱۲۰۰ میل موٹر میں طے کر کے مدینہ سے مکہ ہو کر پھر اس راہ سے واپس آؤں گا اور بغداد سے انھیں ساتھ لے لوں گا ۔ اس تجویز کو انھوں نے سنا اور کچھ نہ کہا ۔ ساتھ ہو لیں مگر

بغداد پہنچ کر اپنے جد امجد حضرت موسیٰ کاظم کے روبرو اپنے اللہ سے دعا کی کہ زیارت روضہ رسول اور حج سے محروم نہ رہوں۔اس دعا نے تریاق مجرب کا کام کیا اور انھوں نے باوجود علالت ونقاہت تمام ارکان حج ادا کیے اور دوبارہ مدینے اور دوبارہ نجف وکربلا میں حاضری دے کر صحیح وسلامت کان پور پہنچ گئیں''۔ ۳۳؎

جس کی شریک زندگی تمام تر ذاتی صفات کے علاوہ عزم وہمت اور حریت پرستی کے ساتھ شوہر پرست بھی ہو وہ کیوں نہ اپنی قسمت پر ناز کرے۔بیگم حسرت کیا دنیا سے گئیں حسرت کی دنیا اجڑ گئی ۱۹۳۷ء کے بعد بھی ان کی شاعری کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس میں پہلا سا کیف رہا نہ لطف سخن رہا۔

ہندوستان کے لیے مجوزہ دستور

حسرت موہانی نے اکتوبر ۱۹۲۸ء سے روزنامہ مستقل جاری کیا تھا جو ایک طرح اردوئے معلیٰ کا سیاسی ایڈیشن تھا،ان کی عملی مصروفیات اور مالی حالت دونوں کو سنبھالنے کی متحمل نہ تھی۔اخبار مستقل کبھی ہفتہ میں ۳ بار کبھی دوبار اور پھر ماہوار ہوگیا بالآخر اردوئے معلیٰ کے ساتھ اسے ضم کر کے اس کے جداگانہ تشخص کو ختم کر دیا۔اس میں سیکڑوں سیاسی مضامین شائع ہوئے۔ان کی موت سے سیاسی تاریخ اور مسلمانوں کی فکر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سیاسی عمل اور کانگریس کے مطالبات سے اندازہ ہوگیا تھا کہ بصورت آزادی ایک وفاقی حکومت قائم ہوگی جس کے پاس جملہ اختیارات ہوں گے میں سے جن کو مناسب سمجھا جائے گا صوبوں (ریاستوں) کے حوالے کیا جائے گا جیسی کہ صورت حال آج کل بھارت اور پاکستان میں ہے۔ایسے وفاق میں اکثریت کا غلبہ ہوگا اور مسلمان بے آواز ہو کر رہ جائیں گے۔اس وقت تک پاکستان کا تصور اجاگر نہ ہوا تھا۔ایسے میں حسرت موہانی نے ایک سے زائد مرتبہ حکومت کی قسموں کی وضاحت میں اور ہندوستان کے لیے نئے دستور کے منصوبے کے بارے میں لکھا۔اردوئے معلیٰ کا آخری پرچہ فروری مارچ ۱۹۴۳ء کا ہے۔اس کے ساتھ اخبار مستقل بھی منسلک تھا اس میں انھوں نے مذکورہ امور پر آخری بار روشنی ڈالی۔یہ ایک اہم دستاویز ہے جسے نقل کیا جاتا ہے۔

حکومت کی قسمیں

حکومت

شخصیہ جمہوریہ — جمہوریہ

مطلقہ — محدود — وحدانی — ترکیبیہ

مرکزیہ — لامرکزیہ

''حکومت کی دو قسمیں ہیں،ایک شخصی اور دوسری جمہوری۔پھر شخصی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ایک شخصیہ مطلقہ جس کو انگریزی میں Monarchy کہتے ہیں اور جس میں بادشاہ مطلق العنان ہوتا ہے۔دوسری قسم شخصیہ محدودیہ ہے جس کو انگریزی میں Limited Monarchy کہتے ہیں جیسے موجودہ حکومت انگلستان میں ہے جس میں بادشاہ وزرا کی رائے کا پابند ہے۔

حکومت شخصیہ کی طرح حکومت جمہوریہ کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وحدانیہ یعنی Unitary دوسری ترکیبیہ یعنی Federal پھر حکومت جمہوریہ ترکیبیہ کی دو قسمیں ہوگئی ہیں ایک مرکزیہ دوسری لامرکزیہ۔ مرکز میں کامل اختیارات جن کو پلینری Plenary کہتے ہیں حکومت مرکزی کو حاصل ہوتے ہیں البتہ مرکزی حکومت جن اختیارات کو مناسب سمجھتی ہے اپنی ماتحت ریاستوں (صوبوں) کو تفویض کر دیتی ہے۔ انگریزی میں اس کا نام Centripetal ہے اس کی مثال حکومت کناڈا ہے۔ لامرکزیہ میں اختیارات کامل جن کو انگریزی میں Prelinary کہتے ہیں آزاد ریاستوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ریاستیں جن اختیارات کو چاہتی ہیں اپنی طرف سے مرکزی حکومت کو سپرد کر دیتی ہیں اس کا نام انگریزی میں Central Foeul ہے۔ ہمارے نزدیک مسلمانوں کو جو شے مطلوب ہے وہ یہی آخر کی قسم ہے حکومت ترکیبیہ لامرکزیہ! اس کے برخلاف ہندو اور حکومت برطانیہ دونوں یا تو حکومت وحدانیہ کے طلب گار ہیں یا حکومت ترکیبیہ مرکزیہ کے!''

حکومت ترکیبیہ لامرکزیہ کی تشکیل نو

حسرت موہانی نے اس مضمون میں آزاد ریاستوں کا تصور پیش کیا اور ان کے باہمی اتحاد سے ایک وفاقیہ کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ اس طرح ہندوستان میں ۵ وفاق قائم کر کے ان کو ایک مرکز سے وابستہ کیا جا سکتا۔ اس میں وفاق کی ہر ریاست اندرونی طور پر خود مختار ہوتی۔ حکومت مرکزیہ محدود یہ کے پاس کم سے کم اختیارات ہوتے جو اسے آزاد ریاستیں تفویض کرتیں۔ ہندوستان ان وفاق میں تقسیم کیا جا سکتا۔

وفاقیہ ہند مشرق:	آسام اور بنگال کی آزاد جمہوریتیں
وفاقیہ ہند جنوبی:	آندھرا مدراس۔ سی پی اور اڑیسہ کی آزاد جمہوریتیں
وفاقیہ ہند مرکزی:	بہار۔ یو۔ پی، مہاراشٹرا کی آزاد جمہوریتیں
وفاقیہ ہند جنوب مغربی:	بمبئی اور گجرات کی آزاد جمہوریتیں
وفاقیہ ہند مغربی:	بلوچستان، سرحد، سندھ اور پنجاب کی جمہوریتیں

اس خاکے کے حوالے سے چند باتوں کا ذہن میں رہنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ خاکہ نیا نہیں ہے اس طرح کا خاکہ مولانا عبیداللہ سندھی ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ پیش کر چکے تھے۔ انھوں نے بھی ریاستوں کی تشکیل مذہب اور زبان کی بنیاد پر کی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس خاکے کی پیش کش کے چند سال بعد برطانیہ کے کیبنٹ مشن نے بھی اس سے ملتا جلتا پلان پیش کر کے سیاسی جماعتوں سے منوا لیا تھا جس سے کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے تبدیل کر کے بعد موشگافی کرتے ہوئے کہا تھا کہ مستقبل کی پارلیمنٹ اس میں ردوبدل کی مجاز ہوگی۔ ان کے شکوک وشبہات پیدا کر کے بعد مسلم لیگ کی جانب سے قائداعظم نے اس پلان کو مسترد کر دیا تھا۔ یہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کی آخری کوشش تھی جو بارآور نہ ہو سکی۔

یہ اہم نکتہ بھی لائق توجہ ہے بھارت کے اہل قلم جنھوں نے حسرت موہانی کے بارے میں مضامین یا کتابیں لکھی ہیں اس بات کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں کہ حسرت موہانی کو قائداعظم کے مدمقابل کھڑا کریں۔ متذکرہ منصوبے کے پیش نظر اختر حسن ایڈیٹر روزنامہ پیام حیدرآباد دکن نے لکھا ہے:

> ''حسرت اور جناح میں بھی یہی اختلاف تھا۔ جناح مذہب کی بنیاد پر ایک پاکستان کی تشکیل چاہتے تھے لیکن حسرت ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے۔ مذہبی بنیاد پر سیاسی پارٹیوں کی تشکیل بھی حسرت کے لیے

قابل قبول نہیں تھی''۔ ۳۴؎

یہ ایسا ہی ہے کہ کیبنٹ پلان منظور کر لینے کی بنا پر کہا جائے کہ قائداعظم بھی تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے مخالف تھے۔

حوالے

۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی: مضمون ''حسرت کی سیاسی زندگی''، مشمولہ رسالہ نگار لکھنؤ، حسرت نمبر جنوری فروری ۱۹۵۲ء، ص ۱۱۲

۲۔ انجمن اردوئے معلّٰی کے بارے میں دیکھیے خافی خاں کا مضمون ''حسرت موہانی، ایک قدر دان کی نظر میں''، مشمولہ رسالہ زمانہ کانپور، دسمبر ۱۹۰۸ء، ص ۲۹۴

۳۔ ستیہ پال: سکسٹی ایئرز آف کانگریس (انگریزی) مطبوعہ لاہور ۱۹۴۶ء، ص ۱۶۵

۴۔ اردوئے معلّٰی: جنوری ۱۹۰۷ء

۵۔ خافی خاں، حوالہ مذکورہ، ص ۲۹۴

۶۔ حسرت موہانی کی تذکرہ نگاری کے بارے میں دیکھیے ہمارا مضمون مشمولہ رسالہ مخزن لاہور شمارہ (۱۰) ۲۰۰۵ء

۷۔ اردوئے معلّٰی: جولائی ۱۹۰۳ء ۸۔ ایضاً

۹۔ اردوئے معلّٰی: ستمبر ۱۹۰۴ء ۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً ۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ اردوئے معلّٰی: مئی ۱۹۰۵ء

۱۴۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب ''مولانا برکت اللہ بھوپالی''، شائع کردہ خدا بخش لائبریری پٹنہ، ۲۰۰۳ء

۱۵۔ جون ۱۹۰۷ء میں مولانا برکت اللہ بھوپالی کا جو مضمون فارسی زبان میں چھپا تھا اس کا مکمل ترجمہ ہماری مذکورہ بالا کتاب میں شامل ہے۔

۱۶۔ اردوئے معلّٰی: جولائی ۱۹۰۶ء ۱۷۔ اردوئے معلّٰی: اگست ۱۹۰۷ء

۱۸۔ حسرت کی کہانی، نعیمہ کی زبانی، حیدرآباد سندھ: س۔ن، ص ۳۷

۱۹۔ اردوئے معلّٰی: جنوری ۱۹۰۷ء ۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ اس مضمون کے عنوان اور مضمون نگار کے نام کے بارے میں داد تحقیق دینے کے بجائے اہل قلم نے جن موشگافیوں سے کام لیا ہے اس کی تفصیل اور تردید کے لیے ہمارا مضمون ''حسرت موہانی کے بارے میں غلط بیانیاں''، مشمولہ رسالہ مخزن لاہور، شمارہ (۳) ۲۰۰۳ء

۲۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد: مضمون ''اردو پریس سے ضمانت طلبی''، مشمولہ ہفت روزہ الہلال کلکتہ، ۲۱ جون ۱۹۱۳ء، ص ۴

۲۳۔ اردوئے معلّٰی: نومبر ۱۹۰۹ء ۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ''دنیائے اسلام اور اہل یورپ''، اردوئے معلّٰی: جنوری ۱۹۱۲ء

۲۶۔ ان ۵۵ شعرا کی فہرست کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ مخزن لاہور شمارہ (۱۰) ۲۰۰۵ء

۲۷۔ یہ ''گلدستہ حسرت'' کے سرورق کی عبارت ہے۔

۲۸۔ اردوئے معلّٰی: ستمبر ۱۹۱۱ء ۲۹۔ اردوئے معلّٰی: جون ۱۹۱۳ء

۳۰۔ ایضاً ۳۱۔ امداد علی صابری: تاریخ اردو صحافت جلد چہارم: مطبوعہ دہلی، ص ۳۶۵

۳۲۔ ارباب سخن میں جس تذکرۃ الشعرا کا منصوبہ شامل ہے اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے ہمارا مضمون ''حسرت موہانی کی دیباچہ نگاری''، مشمولہ رسالہ مخزن لاہور، ۲۰۰۲ء

۳۳۔ اردوئے معلّٰی: مئی جون ۱۹۳۷ء ۳۴۔ اختر حسن: کتاب ''نقد و نظر''، مطبوعہ حیدرآباد دکن، ۱۹۸۴ء، ص ۶۴

مشاہدات زنداں
(مولانا حسرت موہانی کی آپ بیتی)

ڈاکٹر انور محمود خالد

''مشاہدات زنداں'' مولانا حسرت موہانی کی آپ بیتی ہے جو 'قید فرنگ' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اردو کی خود نوشت مختصر سوانح عمریوں میں غالباً یہ سب سے زیادہ مقبول آپ بیتی ہے، کیونکہ اس میں اردو کے ایک مشہور شاعر، سیاست دان اور صحافی نے اپنی ایک سالہ اسیری کی روداد بیان کی ہے۔ اپنے رسالہ ماہنامہ ''اردوئے معلیٰ'' کے شمارہ دسمبر ۱۹۰۹ء میں اس آپ بیتی کی پہلی قسط شائع کرتے ہوئے مولانا حسرت موہانی نے اپنے نوٹ میں وضاحت کی کہ ''۲۳ جون ۱۹۰۸ء سے ۱۹ جون ۱۹۰۹ء تک، بزمانہ قید فرنگ، جو کچھ راقم حروف نے دیکھا یا سنا، اس کے شائع کرنے کا، بہ بوجوہ، چند در چند، ارادہ نہ تھا لیکن بعض احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر اب یہ قصد کر لیا گیا ہے کہ مندرجہ بالا عنوان کے کم از کم دلچسپ واقعات اور حالات ہر ماہ درج رسالہ ہوا کریں''۔ حسرت موہانی کی اسیری کی یہ داستان ''اردوئے معلیٰ'' کے شمارہ جنوری ۱۹۱۰ء تک مسلسل شائع ہوتی رہی اور یہ تیرہ قسطوں میں مکمل ہوئی۔

عتیق صدیقی نے اپنی کتاب ''حسرت موہانی: قید فرنگ میں'' جو انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کے زیر اہتمام ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی ..... میں بتایا ہے کہ رسالہ اردوئے معلیٰ میں ''مشاہدات زنداں'' کی اشاعت کے بعد اس کا ایک ایڈیشن غالباً ۱۹۱۸ء میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوا تھا لیکن وہ نسخہ انھیں دستیاب نہ ہو سکا، البتہ حسرت موہانی کے انتقال کے بعد نیاز فتح پوری نے اسے ماہنامہ ''نگار'' لکھنو کے شمارہ جون ۱۹۵۲ میں پھر شائع کیا اور وہیں سے اخذ کر کے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کراچی سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہونے والے اپنے ماہنامہ ''نگار'' کے حسرت نمبر میں چھاپا۔ عتیق صدیقی نے بھی اپنی کتاب ''حسرت موہانی: قید فرنگ میں''۔۔۔ میں ''مشاہدات زنداں'' کو ''اردوئے معلیٰ'' کی تیرہ اشاعتوں سے نقل کر کے ۵۲ صفحات میں سمیٹ لیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ''مشاہدات زنداں''۔۔۔ حسرت کی پہلی ''جیل یاترا'' کے تجربات کی ہیبت ناک داستان ہے جو زبان و بیان کے اعتبار سے ادبی اہمیت کی اور مواد کے اعتبار سے تاریخی نوعیت کی ہے۔ لیکن یہ افسوس ناک ہے کہ عالمی زندانی ادب میں یا کم از کم ہندوستانی زندانی ادب میں اسے وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جس کی وہ مستحق ہے۔ حسرت نے اپنی قید و بند کی زندگی کا ایک سال جس حال میں بسر کیا تھا اور اس کے دوران ان سے جو وحشیانہ سلوک کیا گیا تھا، اس کو حسرت نے اگرچہ کچھ حد تک تفصیل کے ساتھ ''مشاہدات زنداں'' میں قلم بند کیا ہے لیکن ان کے انداز بیان کا یہ پہلو خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ اس میں کسی جگہ بھی بغض و عناد کا شائبہ نظر نہیں آتا''۔

مولانا حسرت موہانی نے آغاز داستان میں خود بتایا ہے کہ انگریزی حکومت نے انھیں ۲۳ جون ۱۹۰۸ء کو اپنے رسالہ

''اردوئے معلیٰ'' میں ایک مضمون شائع کرنے پر بغاوت کے جرم میں گرفتار کیا اور مقدمہ چلا کر دو سال قید با مشقت اور پچاس روپیہ جرمانہ کی سزا سنائی۔ اپیل کرنے پر ان کی سزا ایک سال رہ گئی اور جرمانہ کی رقم ان کے بھائی نے ادا کر دی۔ گرفتاری کے وقت ان کی شیر خوار بیٹی نعیمہ بے حد علیل تھی اور گھر پر والدہ نعیمہ اور ایک خادمہ کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا، لیکن اس موقع پر ان کی اہلیہ نشاط النساء نے بے حد حوصلہ مندی، استقامت اور جرأت کا مظاہرہ کیا اور گرفتاری کے اگلے روز ہی سپرنٹنڈنٹ جیل کے ذریعے سے انھیں ایک خط لکھا جس میں حسرت موہانی کا یہ کہہ کر حوصلہ بڑھایا کہ:

''تم پر جو افتاد پڑی ہے، اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار، تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو''۔

مولانا حسرت موہانی نے ''مشاہدات زنداں'' میں جیل کی زندگی کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ اس سے قیدیوں پر ہونے والے مظالم اور ان کی بے بسی کی المناک تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''حوالات میں داخل ہونے پر تو گرفتاران زنداں کو سب سے زیادہ افسوس ناک نظارہ حوالاتیوں کی حالت زار کا نظر آتا ہے کہ ادنیٰ ملازمین جیل، ناجائز حصول زر کی غرض سے ان کی تذلیل کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ بہت سے لوگ ان میں ناکردہ گناہ، پولیس کا شکار اور پہلے ہی سے مظلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ سنگ دلی کا یہ قابل نفرین برتاؤ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگوں پر بلاثبوت کافی محض اس لیے مقدمے قائم تھے کہ انھیں سزا نہ بھی ہو تو کم از کم حوالات میں رہ کر ان کی آبرو تو خاک میں مل جائے گی۔

خود حسرت موہانی کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ ''تقریباً چالیس روز کی کش مکش اور بیکار مراسلت کے بعد آخر کار مقدمہ کا وہی فیصلہ ہوا جو اس قسم کے مقدمات میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے، یعنی ۴/ اگست ۱۹۰۸ء سے قید سخت کا آغاز اس طور پر ہوا کہ کچہری سے جیل واپس پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، جانگیا اور ایک کرتا، ٹوپی، پہننے کے لیے ایک ٹکڑا ٹاٹ اور ایک کمبل بچھانے اوڑھنے کے لیے اور ایک قدح آہنی بڑا اور ایک چھوٹا، جملہ ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا۔ ان چند چیزوں کے سوا قیدیوں کو اور کوئی شے پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی''۔

قید کے پہلے روز سے ہی حسرت موہانی کو چکی کی مشقت کا سامنا کرنا پڑا جس کی طرف انھوں نے اپنے مشہور شعر میں یوں اشارہ کیا ہے:

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

انھیں روزانہ ایک من گندم پیسنے کی اذیت ناک سزا دی گئی جو یوں تو ایک دو ماہ کے بعد ختم ہو جانی چاہیے تھی لیکن ایک سیاسی قیدی کو زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچانے کے لیے جیل کے حکام نے، بالائی اشارے پر پورے سال ان سے چکی کی مشقت کرائی۔ حسرت موہانی نے اُف تک نہ کی اور ہر روز صبح سے شام تک، حتیٰ کہ رمضان المبارک کے مہینے میں بھی وہ ایک من گندم جیل کی بھاری بھرکم چکی سے، اپنے ہاتھوں پیستے رہے، حالانکہ پڑھے لکھے قیدیوں سے نسبتاً ہلکی مشقت بھی لی جاتی تھی۔ مثلاً ان سے لکھنے پڑھنے کی کوئی خدمت لینا اس زمانے کا عام معمول تھا۔

مولانا حسرت موہانی نے جیل کے اندر، قیدیوں کو فراہم کیے جانے والے گھٹیا لباس، ان کی مضر صحت خوراک، ان کی تکلیف دہ جائے رہائش اور ان کے روزمرہ کے قابل رحم معمولات کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے جیل کی زندگی، جیتے جی، جہنم کا ایک

نمونہ نظر آتی ہے۔البتہ اس آپ بیتی کا سب سے جاندار حصہ وہ ہے جس میں مولانا حسرت موہانی نے اپنے جیل کے قیدی ساتھیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ان میں سیاسی زعما، اخلاقی مجرم، جیل کے نچلے اور بالائی عملے کے اراکان اور جیلوں کا معائنہ کرنے والے سرکاری حکام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان میں بے حد دلچسپ کردار بھی ہیں۔جلاد صفت جیلر اور ڈپٹی جیلر بھی اور ہمدرد قیدی سیاست دان اور معائنہ کرنے والے بعض اعلیٰ حکام بھی۔علاوہ ازیں مولانا نے عام قیدیوں اور گورے یا یورشین قیدیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے دوہرے امتیازی سلوک کی روداد بھی بیان کی ہے اور عام ملکی قیدیوں کے ساتھ ناروا برتاؤ اور گوروں کو ہر قسم کی سہولیات بہم پہنچانے کے فرق کو واضح کیا ہے۔اردو کے زندانی ادب میں حسرت موہانی کی یہ خودنوشت سوانح عمری مختصر ہونے کے باوجود، جیلوں کے بارے میں گہرے اور سچے مشاہدات پیش کرنے کی وجہ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔

تماشاے دیدن، تمناے چیدن
بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم
(غالب)

پتہ بھی اگر ہلتا ہے تو اس کی رضا سے
اور بندہ گنہگار ہے معلوم نہیں کیوں
(ہری چند اختر)

مشفق خواجہ، خطوط، یادداشتیں اور تاثرات

پرتو روہیلہ

ماضی کو حال بنانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا مردہ کو زندہ کرنا۔ البتہ گذشتہ کی بازیافت تھوڑی بہت ضرور ہو سکتی ہے بشرطے کہ حافظہ استوار و مددگار ہو، جو مجھے میسر نہیں۔ میری ساری بساط خواجہ صاحب کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے مجھے وقتاً فوقتاً اپنے پُرہجوم معمولات سے وقت نکال کر لکھے اور تا حال میرے پاس ہیں۔ لیکن ان سارے خطوط کا درمیانی وقفہ باوجود اس کے کہ یہ چھ سال کے طویل عرصے پر پھیلے ہوئے ہیں، اتنا بے قاعدہ اور بعض اوقات طویل ہے کہ گذشتہ کی کوئی قابل دید اور ماضی افروز تصویر نہیں ابھر پاتی۔ لے دے کر دوسرے باقیات میں میرا سہارا صرف وہ تاثرات اور یادداشتیں ہیں جو بعض جگہ ہلکے اور بعض جگہ گہرے نقوش کی صورت میں ذہن پر موجود ہیں۔

مجھے یاد نہیں آتا کہ میں خواجہ صاحب سے پہلی بار کب ملا تھا لیکن ماضی کی اندھیری کوٹھری میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارتا ہوا قدم بڑھاتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ میں نے خواجہ صاحب کو بڑے نفیس کپڑوں میں ملبوس ہاتھ میں کیمرہ فلیش گن کے ساتھ اٹھائے ہوئے جمیل جالبی صاحب کے بڑے بیٹے خاور جمیل کی شادی کے موقعہ پر کراچی میں دیکھا تھا۔ اس شادی میں شرکت کے لیے میں اسلام آباد سے پہنچا تھا۔ چونکہ اس شادی میں سرکاری محکموں کے بالعموم اور محکمہ انکم ٹیکس کے بالخصوص سارے عمائدین محکمہ مدعو و موجود تھے تو فضا بڑی پُر رونق اور گہما گہمی کی تھی۔ اسی شادی میں ایک زبردست لطیفہ بھی واقع ہوا تھا۔ محکمہ انکم ٹیکس کی معروف شخصیت اظہر حسن صدیقی نے مجھے کراچی میں دیکھ کر یک گونہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا اوہ آپ یہاں کیسے۔ پھر مجھے اور جمیل جالبی صاحب کو یکجا دیکھ کر ہم دونوں کے تعلقات کا اندازہ کرتے ہوئے اور یہ سوچ کر کہ ہفتے کا دن ہے بلند آواز میں کہا اچھا۔ اچھا آپ کا تو ویک اینڈ ہوگا تا گویا آپ اسلام آباد سے شادی میں شرکت کے لیے بغیر چھٹی کے آئے اور واپس جاسکتے ہیں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا' ۔اظہر صاحب ہم غریبوں کے سارے اینڈ زہی ویک ہوتے ہیں بھلا ہمارا کونسا اینڈ Strong ہے۔ دس بیس اہل زبان کے مجمع میں اس جملے پر زبردست قہقہہ پڑا جو اپنے تاثرات کے ساتھ دیر تک موضوع سخن رہا۔ اس تقریب میں مشفق خواجہ صاحب اکثر اوقات جمیل جالبی صاحب کے ساتھ رہے اور بہ حیثیت عزیز و دوست کے ان کی اُن کے دوستوں اور عزیزوں کی تصویریں کھینچتے رہے۔ اسی تقریب کی اور خواجہ صاحب سے ملاقات کی ایک دوسری یادداشت یہ ہے کہ جب میں خواجہ صاحب سے گلے ملا تو میں نے محسوس کیا کہ ان کے دائیں ہاتھ کے بازو پر تعویذ بندھا ہے اور دونوں بازو مضبوط اور ورزشی ہیں۔ خواجہ صاحب کے بازو کا یہ تعویذ میرے لیے تھوڑی انہونی سی چیز ضرور تھا حیران کن نہیں۔ انہونی اور غیر معمولی اس وجہ سے کہ ہمارے اکثر تخلیق کار عقلیت پسند ہوتے ہیں اور اس قسم کی چیزوں کو توہمات کی قبیل میں تصور کرتے ہیں۔ البتہ یہی بازو کا تعویذ حیران کن ظہیر کاشمیری کے بازو پر تھا جب ایک شام میں نے لاہور میں ان کو ان کی گلی کے نکڑ پر بنیان پہنے اور تہمد باندھے کھڑے ہوئے دیکھا تھا۔

اس تقریب کے بعد جو یادداشت میرے ذہن میں ہے وہ اس وقت کی ہے جب میں پرائم منسٹرس ایجوکیشن کمیشن میں ممبر تھا اور اس حساب سے یہ ۱۹۹۵ء سے پہلے کی بات نہیں ہو سکتی۔ مجھے ایک دن کراچی سے خواجہ صاحب کا فون ملا جس میں خواجہ صاحب نے بڑے اصرار سے مجھ سے کہا کہ اب آپ کے پاس وقت کافی ہے' آپ ریٹائر ہو چکے ہیں' ادارہ یادگار غالبؔ اور غالبؔ کے لیے کچھ کام کیجئے۔ استفسار پر انہوں نے کہا کہ آپ غالبؔ کے فارسی کلام کی تشریح کر دیجئے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ میں نے ہنسنا شروع کر دیا اور اور ان سے کہا خواجہ صاحب ہم جیسے کم سوادوں سے آپ کو ایسا مذاق نہیں کرنا چاہیے۔ خواجہ صاحب اپنی بات پر اڑے رہے اور میں اپنی پر نتیجہ یہ ہوا کہ خواجہ صاحب نے ہر قسم کی امداد کے وعدے کے ساتھ کچھ سوچنے کی مہلت دی اور کہا میں کچھ دن بعد پھر فون کروں گا۔ میں اپنے طور پر پریشان کہ یہ خیال خواجہ صاحب کے ذہن میں آیا کس طرح اور میرے بارے میں یہ حسن ظن کس طرح ہوا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ سوچتا اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتا۔ کچھ دن بعد خواجہ صاحب کا فون پھر آیا اور انہوں نے اپنی پیشکش پر پھر اصرار کیا۔ لیکن میرے رویے کو دیکھ کر فوراً انہوں نے ایک متبادل تجویز پیش کر دی اور وہ تجویز یہ تھی کہ غالبؔ کے فارسی کے وہ مکتوبات جو نامہ ہائے فارسی غالبؔ کے نام سے علی اکبر قزلباش نے مرتب کئے اور دہلی اکیڈیمی سے شائع کئے ہیں ان کا اردو ترجمہ کر دیجئے۔ اُس وقت کی حقیقت یہ تھی کہ غالبؔ کی فارسی غزلیات کے علاوہ غالبؔ کی فارسی نثر سے میں کلیتاً نابلد تھا۔ سو میں نے ان سے کہا کہ اس کا وعدہ میں نہیں کر سکتا لیکن پہلے یہ کتاب جس کا نام ہی میں اِس وقت پہلی بار سن رہا ہوں مہیا کر دیجئے۔ شدہ شدہ خواجہ صاحب کی رہنمائی میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان تک پہنچا اور آقای دکتر محمد حسین تسبیحی سے فون پر بات ہوئی۔ میں نے کتاب کا نام بتایا اور انہوں نے بتایا ''موجود است''۔ یقیناً اس کتاب کو منگوانے اور اس کا جائزہ لینے میں کچھ وقت لگا ہو گا تا آنکہ اگلی بار جب خواجہ صاحب کا فون آیا تو میں اس نثر کو پڑھ کر ایسا سرشاری کی کیفیت میں تھا کہ میں نے اس کا اردو ترجمہ کرنے کی بڑی دل جمعی سے ہامی بھر لی۔ اور پھر یہ سفر شوق شروع ہوا تو آج تک بفضل خدا جاری ہے۔ اس طرح پہلی بار میرا خواجہ صاحب سے کوئی تعلق قائم ہوا اور رفتہ رفتہ ان کی شخصیت اور علمی فضیلت جس سے میں چنداں واقف نہ تھا مجھ پر منکشف ہونا شروع ہوئی۔

خواجہ صاحب کا پہلا خط میرے پاس ۱۷ دسمبر ۱۹۹۶ کا لکھا ہوا ہے۔ اپنے دوسرے خط میں جو ۸-اکتوبر ۱۹۹۷ کا لکھا ہوا ہے انہوں نے اپنی بیماری سے صحت یاب ہونے کی اور اسی کتاب یعنی نامہ ہائے فارسیٔ غالبؔ کے ترجمے کو کمپوزر کے حوالے کرنے کی نوید سعید دی ہے۔ اب ان کے آخری خط کو جو ۱۰-اکتوبر ۲۰۰۳ کا تحریر کردہ ہے نظر میں رکھا جائے تو یہ تقریباً سات سال کا عرصہ بنتا ہے اور کل خطوط کی تعداد انتیس (۲۹) ہوتی ہے۔ ان کے آخری خط یعنی ۱۰-اکتوبر ۲۰۰۳ سے ۲۱ فروری ۲۰۰۵ تک جو ان کی تاریخ وفات ہے تقریباً سوا سال کا وہ عرصہ ہے کہ جب انہوں نے عمداً خط لکھنا بند کر دیا تھا۔ میرے ایک دوست نے جو کراچی ہی کے رہنے والے ہیں اور ادبی حلقوں سے قریب بھی' مجھے بڑے وثوق سے بتایا تھا کہ خواجہ صاحب کو اب یہ یقین ہو چلا ہے کہ میں زیادہ دن زندہ رہنے والا نہیں۔ سو وہ یہ چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ وقت بچا کر اپنے ہاتھ کا کام نمٹا لیں۔ لہٰذا اس عرصے میں سیکڑوں مسائل جو ذاتی نوعیت سے لیکر کتابوں کی اشاعت اور ترسیل تک پیش آتے محتاج توجہ رہے۔ اس عرصے میں فون کا وسیلہ بھی تقریباً ناکارہ ہو گیا تھا۔ اور خواجہ صاحب کی طویل اور گہری خاموشی اوپر کی بات کی تصدیق کرتی تھی۔

مذکورہ بالا انتیس (۲۹) خطوط پر نظر ڈالی جائے تو ان کی ساری تحریروں کے مندرجہ ذیل عنوانات بنتے ہیں۔ ان کی انکساری و عجز' دوستوں کی دلداری و رضا جوئی' حریصان فیضان علم کی رہنمائی' تربیت اور حوصلہ افزائی اور اشاعت و فروغ علم و ادب میں ان کی جانفشانی۔ دراصل اشاعت فروغ علم و ادب ہی ان کا واحد نصب العین تھا اور دوسرے جتنے اہداف بھی تھے وہ اس واحد نصب العین کے

ذیلی یا اضافی اہداف سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنے اس واحد نصب العین کے حصول کے لیے نہ صرف یہ کہ وہ خود حتی الامکان مصروف کار رہتے بلکہ دور دراز شہروں کے کونوں کھدروں سے با استعداد لوگوں کو تلاش کرتے ان کی باقاعدہ تربیت کرتے اور مسلسل حوصلہ افزائی اور دلداری سے ان کو لائق کار بنا کر کوئی نہ کوئی کام ان کے سپرد کر دیتے۔ اور پھر جب یہ کام مکمل ہو جاتے تو باقاعدہ متعلقہ حلقوں میں اس کام کی تشہیر کر کے اور کارکن کو متعارف کرا کے خوش ہوتے۔ دراصل ان کے اپنے حصے میں اتمام کار کی یہ خوشی ہی تھی ورنہ باقی تو تگ و دو کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن فروغ علم و ادب کا یہ عالی نصب العین ہی تھا کہ جس کی حرارت کے طفیل وہ ساری زندگی سرگرم عمل رہے اور دور دراز علاقوں کے تاریک گوشوں میں اجالا کرتے رہے۔

اپنے اردگرد نظر دوڑاتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رشد و ہدایت کا یہ فیض عام قریہ قریہ شہر شہر ملک ملک جاری و ساری تھا اور مجھ جیسے طالبان درس و محتاجانِ ہدایت جگہ جگہ اوراد و وظائف میں محو و منہمک فروغ علم کے لیے کوشاں تھے۔ حالات و واقعات کے پس منظر اور ترتیب کو نظر میں رکھیں تو آپ کو یقین ہو جائیگا کہ میرا اور خواجہ صاحب کا شروع سے کوئی ربط خاص نہیں تھا تا آنکہ انہوں نے مجھ سے ادارۂ یادگار غالبؔ کے لیے کام کرنے کی فرمائش نہیں کی اور مجھے اور کچھ نہیں تو نامہ ہائے فارسیِ غالبؔ کے ترجمے پر راضی نہ کر لیا۔ اس رابطے کے بعد انہوں نے صحیح مرشد کی طرح میری ساخت پرداخت شروع کی۔ ''توجہ'' کہ رشد و ہدایت کے لیے ایک خاص طریق کار ہے مجھ پر مرکوز رکھی اور وہ جو مریدان با صفا گزرے ہوئے وقت کو یاد کر کے اپنے اپنے پیر طریقت کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہو کر کہتے ہیں کہ حضرت نے اپنے سامنے بٹھا کر مجھے وضو کرنا سکھایا تو مجھے بھی یہ بیان کرنے میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ نے مجھے تو کوزہ بھرنا بھی سکھایا۔ چنانچہ میں یہ سوچتا ہوں کہ خواجہ صاحب کی ذاتی تصانیف 'تالیفات اور مرتبات یعنی ابیات' ''پرانے شاعر نیا کلام'' ''خوش معرکۂ زیبا'' ''(تذکرۂ شعرا)' اقبال (از احمد دین)'' غالبؔ اور صفیر بلگرامی'' ''جائزہ مخطوطات اردو'' ''کلیات یگانہ چنگیزی'' ''خامہ بگوش کے قلم'' سے ''سخن در سخن'' ''سخنہائے ناگفتنی'' وغیرہ وغیرہ سے قطع نظر ان کی تجویز و تشویق پر پچھلے تیس (۳۰) پینتیس (۳۵) سال میں جو کام بھی اور جہاں جہاں بھی ان کی ہدایات و تہذیب و تنقیح سے ہوا اس کو دراصل ان ہی کا کام سمجھنا چاہیے۔ انہوں نے اپنا خون جگر صرف اپنی ذاتی تخلیقات پر ہی صرف نہیں کیا بلکہ پاکستان کے ادبی اداروں کو بالخصوص اور ہندوستان کے اداروں کو بالعموم دیا۔ اور مجھ جیسے شاگردان ادب کو انفرادی طور پر اور ادارۂ یادگار غالبؔ کراچی' انجمن ترقی اردو کراچی' اقبال اکیڈمی لاہور' مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد جیسے اداروں کو اجتماعی طور پر اس بے لاگ سرپرستی اور بے لوث امداد کا اقبال کرنا چاہیے تا کہ ادبی دنیا میں اپنے محسن و مربی کے لیے احسانمندی کی صائب و صحت مند روایت قائم ہو۔

ان کے خطوں کے جستہ جستہ مندرجہ ذیل اقتباسات میرے دعوے کی کلیتاً تصدیق کرینگے۔

یہ اواخر ۱۹۹۷ کی بات ہے۔ ان دنوں ڈاکٹر طارق صدیقی قائداعظم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور ان کے طفیل میری رسائی پیر حسام الدین راشدی کی لائبریری تک تھی جو یونیورسٹی نے خرید لی تھی۔ وہاں مجھے غالبؔ کی مشہور مثنوی ''ابر گہربار'' کا منظوم ترجمہ نظر آیا۔ یہ کتاب رائٹرز بیورو' کراچی سے ۱۹۶۹ میں پہلی بار چھپی تھی۔ یہ ترجمہ اور اس کے ساتھ اس کا دیباچہ بعنوان سخنہائے گفتنی پڑھ کر میں اس کے مصنف رفیق خاور سے بڑا متاثر ہوا لیکن حیران اس بات پر تھا کہ میں ان سے لاعلم کیونکر رہا۔ دل میں کھوج تھی کہ یہ کون صاحب ہیں۔ ملا کی دوڑ مسجد تک' میں نے خواجہ صاحب کو لکھا۔ خواجہ صاحب نے اپنے خط مورخہ ۲۵-اکتوبر ۱۹۹۷ مجھے تحریر فرمایا۔ ''رفیق خاور مرحوم بہت لائق فائق انسان تھے۔ برسوں ''ماہ نو'' کے ایڈیٹر رہے۔ اردو' فارسی' پنجابی' انگریزی چاروں زبانوں میں یکساں مہارت سے لکھتے تھے۔ شکوہ اور جواب شکوہ کا فارسی' میں ترجمہ کیا تھا۔ جاوید نامہ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اقبال کی فارسی پر

ایک عمدہ کتاب لکھی تھی جس پر چار سال پہلے اقبال ایوارڈ ملا تھا۔ اردو میں پہلا تھیسارس بھی انہیں کی تالیف ہے جو مقتدرہ نے شائع کیا تھا۔ ان کی ایک طبع زاد فارسی مثنوی بھی شائع ہو چکی ہے جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ (علامہ) اقبال نے ان کو املا کرائی تھی ..... یوسفی صاحب قطر تشریف لے گئے ہیں ..... آپ کو یہ جان کر افسوس ہوگا کہ عرشی زادہ کا ۱۶-اکتوبر ۱۹۹۷ کو رامپور میں انتقال ہوگیا ہے۔ خدا مغفرت کرے۔''

اپنے دوسرے خط مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۹۷ میں لکھتے ہیں۔

''آپ نے پیش لفظ (نامہ ہائے فارسی غالبؔ) میں لکھا ہے۔''..... قدم قدم پر خالی نقطہ زدہ جگہوں کا آجانا خود مزہ کرکرا کر دینے میں کیا کم تھا کہ کاتب صاحب بھی اس میں اپنے جہل کا ایزاد کر دیں اور بریکٹ میں لفظ کذا لکھ کر آگے بڑھ جائیں .....'' صورت حال یہ ہے کہ کذا کاتب نے نہیں لکھا۔ یہ مرتب کا اضافہ ہے۔ مرتب کی جو لفظ سمجھ میں نہیں آیا جس طرح غلط لکھا ہوا مخطوطے میں ملا اس کے آگے اس نے کذا لکھ دیا۔ تدوین متن کا یہ عام قاعدہ ہے کہ مشکوک یا غلط الفاظ و عبارات کے آگے مرتب لفظ کذا لکھ دیتے ہیں۔ اس صورت میں آپ کے مذکورہ اقتباس کو تبدیل کرنا ہوگا۔ اسی طرح آپ نے مرتب کی جگہ مولف کا لفظ استعمال کیا جو مناسب نہیں۔''

اپنے خط مورخہ ۷ مارچ ۱۹۹۸ میں لکھتے ہیں۔

''آپ نے والہؔ (حیدرآبادی) کی شرح کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے میں نے استفادہ کیا۔ آپ نے نہایت توجہ سے یہ شرح پڑھی ہے۔ اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے خصوصاً وہ پہلو جو والہؔ کو دوسرے شارحین سے ممتاز کرتے ہیں اور جن میں غلط یا صحیح کوئی نئی بات کہی گئی ہے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ غالبؔ ہی آپ کا موضوع تحقیق و تنقید بن گیا ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو آپ کے توسط سے فکرِ غالبؔ کے وہ گوشے بھی سامنے آجائیں گے جن تک مجھ جیسے عامیوں کی (اس انکساری پر بھی غور فرمایئے) رسائی نہیں ہے۔ یہ مضمون آپ کہاں چھپوا رہے ہیں۔ ''غالبؔ'' کا غالبؔ نمبر زیر ترتیب ہے اگر اجازت ہو تو اس میں شامل کرلوں''۔

میں نے اپنے کسی خط میں غالبؔ کے چند اشعار کے بارے میں اپنے شکوک و شبہات و خیالات کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ اسی خط میں آگے چل کر فرماتے ہیں۔

''آپ نے اپنے گرامی نامے میں غالبؔ کے بعض شعروں پر اظہار خیال فرمایا ہے (یہ لہجہ ملاحظہ فرمایئے جس نے مجھ جیسے ایک عام شخص کو آسمان پر بٹھا دیا ہے)۔ اس سلسلے میں میری گزارشات یہ ہیں۔

تمنائے زباں محوِ سپاس بے زبانی ہے مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

۱- آپ فرماتے ہیں۔ اس شعر میں تو مجھے صریحاً غلطی نظر آتی ہے اور وہ غلطی ہے لفظ شکوہ کی اضافت۔ اس اضافت کے بغیر یہ مصرع وزن میں نہیں آتا اور اضافت لگاتے ہیں تو آخری لفظ 'کا' بے معنی ہو جاتا ہے لیکن وہ بھی شاعر کی مجبوری ہے کہ ردیف کا حصہ ہے۔ عرض ہے کہ اس شعر میں اضافت بھی درست ہے اور لفظ کا بھی۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کے بغیر شعر بے معنی ہو جاتا ہے۔ دراصل ''کا'' کا تعلق ''شکوۂ بے دست و پائی'' سے نہیں ''تقاضا'' سے ہے۔ مصرع ثانی ''کی نثر یوں ہوگی۔'' جس سے شکوۂ بے دست و پائی کا تقاضا مٹا''۔

۲- کس منہ سے شکر کیجئے اُس لطفِ خاص کا پرسش ہے اور پائے سخن درمیان نہیں

آپ فرماتے ہیں ۔اس شعر میں "پائے سخن" ندرت اظہار تصور کی جائے ۔روئے سخن تو مستعمل ہے لیکن پائے سخن درمیاں پہلی بار غالبؔ ہی کے کلام میں دیکھا ہے ۔

عرض ہے کہ پائے سخن فارسی کی ایک پامال ترکیب ہے ۔اس حد تک پامال کہ لغات میں بھی اسے شامل کردیا گیا ہے...... اس وقت فارسی کی مستند لغت از steingass میرے سامنے ہے ۔اس میں پائے سخن کے معنی eloquence درج ہیں ۔اردو میں پاؤں درمیان ہونا معروف محاورہ ہے ۔غالبؔ نے انہیں دونوں اردو اور فارسی اظہارات سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن اس نوعیت کے تصرفات غالبؔ سے پہلے بھی ملتے ہیں مثلاً میرؔ کے دیوان دوم میں یہ شعر ہے ۔

عشق میں اے طبیب یاں تک سوچ پائے جاں درمیاں ہے یاں تک سوچ

۳- زبانِ اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

غالبؔ نے زبانیٔ شمع کی جو ترکیب استعمال کی ہے وہ بالکل درست ہے ۔زبانی فارسی میں اس طرح مستعمل ہے جس طرح اردو میں "بزبان شمع "اور زبانیٔ شمع دونوں مترادفات ہیں ۔پہلی ترکیب میں بہ اور دوسری میں یائے نسبتی ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں "۔(دراصل مجھے "زبانیٔ شمع" کی ترکیب سے اُس وقت بھی جب یہ شعر خواجہ صاحب کو لکھ کر بھیجا تھا اور آج بھی ہندوستانی فارسی کی بو آتی ہے ۔اس ضمن میں مجھے مزید تحقیق کا موقع نہیں ملا اور میرا شک بدستور باقی ہے)۔

۴- ع طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ

ع لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ

لاگ لغات اضداد میں یعنی ایسا لفظ جس کے دو معنی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی ضد- غالبؔ نے دونوں جگہ اس کو صحیح استعمال کیا ہے ۔پہلے مصرعے میں یہ رغبت یا لگاؤ کے معنی میں ہے اور دوسرے میں عداوت کے معنی میں ۔

۵-غالبؔ کی ایک غزل جس میں اکثر قافیے کھوآئے ٔجوآئے ٔ کوآئے ہیں اس میں دو قافیے غالیہ مو بادۂ دوشینہ کی بوآئے کے بارے میں بھی میں نے خواجہ صاحب سے اپنے شکوک کا اظہار کیا تھا ۔اس کے بارے میں فرماتے ہیں ۔

"کھوآئے اور ڈبوآئے کی زمین" میں مو اور بو کا قافیہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ فارسی میں ان لفظوں کا تلفظ دونوں طرح کیا جاتا ہے ۔MU بھی اور MO بھی- BU بھی اور BO بھی ۔یہی حال خو کا ہے ۔اسے KHU بھی بولتے ہیں ۔اور KHO بھی ۔(حوالے کے لیے محولہ بالا لغت اِزٹین گاس دیکھیے)غالبؔ نے حسب ضرورت تلفظ اختیار کرلیا۔غالبؔ کے زمانے میں فارسی کا چلن عام تھا اس لیے غالبؔ کو معلوم تھا کہ مو اور بو کو کھو اور ڈبو کے تلفظ کے مطابق نظم کیا جائے گا تو کسی کو تعجب نہ ہوگا ۔

وہ کی اصل اور ابتدا وو ہے ۔دکنی میں اب بھی وو ہی ملتا ہے ۔وہ کہیں نظر نہیں آتا ۔بعد میں بھی ایک عرصے تک یہی صورت حال رہی ۔غالبؔ نے بھی وہ نہیں لکھا وو لکھا تھا ۔۱۸۶۲ء مطبع نظامی کانپور سے دیوان غالبؔ کا جو ایڈیشن خود غالبؔ کی تصحیح کے بعد شائع ہوا تھا اس میں واضح طور پر وو لکھا ہے ۔اس لیے یہ قافیہ درست ہے ۔میں نے جو گزارشات کی ہیں مجھے ان کی صحت پر اصرار نہیں ۔اگر آپ ان کی صحت فرمادیں گے تو مجھے خوشی ہوگی"(اب آپ اس انکسار اور دوسرے کے مخالف نقطۂ نظر کو سننے یا قبول کرنے کی آمادگی پر بھی غور فرمایئے ۔)

اسی طرح اپنے خط مورخہ ۳۰ -مارچ ۱۹۹۸ء میں فرماتے ہیں ۔

''آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۲۰-مارچ ۱۹۹۸ء موصول ہوا۔اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔''آبِ گم''(مشتاق یوسفی کی آخری کتاب) سے متعلق مضمون کے صاف کرنے میں آپ نے بڑی زحمت اٹھائی۔یہ میں سوغات (ایک ادبی رسالہ جو بنگلور، ہندوستان سے نکلتا ہے) کے لیے بھیج رہا ہوں۔مثنوی ''خاموش خاتون'' کا مطالعہ آپ نے بڑی دقت نظر سے کیا ہے۔اب فارسی کتابوں کا آپ جیسے مطالعہ کرنے والے کہاں۔اس مقالے کو میں رسالہ غالبؔ کے عام شمارے میں شائع کرونگا۔''(اور یہ مضمون غالبؔ ہی میں شائع بھی ہوا۔)

(مثنوی خموش خاتون فارسی مخطوطہ پر مبنی ایک مثنوی تھی جو ڈاکٹر مہدی غروی کے دیباچے اور تصحیح کے ساتھ اُن دنوں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان' اسلام آباد سے شائع ہوئی تھی۔یہ دورِ جہانگیر کی ایک ہندی کہانی سے ماخوذ فارسی نظم میں کہی گئی ایک داستان ہے جسے رعدیؔ نام کے ایک ایرانی شاعر نے تحریر کیا تھا۔ڈاکٹر ذوعلم نے جو اس وقت رئیس مرکز تحقیقات تھے اس کا ایک نسخہ مجھے عطا کیا تھا۔یہ مقالہ ان ہی کے ایما پر لکھا گیا اور پھر بعد میں مجلّہ غالبؔ زیرادارت مشفق خواجہ کراچی سے شائع بھی ہوا۔)

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے مآثر غالبؔ اور متفرقات غالبؔ کے ترجمے مکمل کر لئے ہیں۔غالبؔ سے متعلق کاموں کے سلسلے میں آپ کو اطمینان ہونا چاہیے کہ یہ میری ذمہ داری ہے۔غالبؔ سے متعلق آپ کا ہر کام ادارہ یادگار غالبؔ سے شائع ہوگا..... غالبؔ کے متفرق (پراگندہ) خطوط کا کام فی الحال شروع نہ کیجئے۔ان خطوط کے جمع کرنے میں مجھے وقت لگے گا۔.....فی الحال ایک بڑا کام اپنے ہاتھ میں لے لیجئے۔غالبؔ کے سارے فارسی کلام کی شرح آغاز غزلیات سے کیجئے۔مشکل شعروں کی بجائے تمام شعروں کی شرح کر دیجئے کہ اب تو غالبؔ کا ہر فارسی شعر عام لوگوں کے لیے مشکل شعر ہے۔یہ کام خواہ کتنی ہی جلدوں میں کیوں نہ ہو بڑے اہتمام سے شائع کرونگا''۔

اپنے اگلے خط میں جو ۱۸-مئی ۱۹۹۸ کا لکھا ہوا ہے تحریر کرتے ہیں۔

''متفرقات غالبؔ کا ترجمہ مل گیا۔بے حد شکر گزار ہوں۔آپ کی محنت اور نکتہ سنجی کا بھرپور اندازہ ہو گیا.....مگر اس کام میں ایک رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔میرے پاس ''متفرقات'' کا پہلا ایڈیشن ہے جو رام پور سے ۱۹۴۷ میں چھپا تھا۔دوسرا ایڈیشن مطبوعہ لکھنؤ نہیں ہے۔آپ کے پاس جو فوٹو اسٹیٹ ہے اگر آپ اس کی نقل (یعنی عکس در عکس) بنوا کر عنایت فرمادیں تو کرم ہوگا''۔

اپنے اگلے خط میں جو ۱۰ جون ۱۹۹۸ کا تحریر کردہ ہے لکھتے ہیں ''آپ بھول گئے کہ میں نے آپ کو لکھا تھا اور پھر اسلام آباد میں آپ سے گفتگو بھی ہوئی تھی کہ غالبؔ کے فارسی خطوط آپ ترجمہ کر دیجئے۔جو خطوط رسالوں میں منتشر ہیں وہ میں فراہم کر دونگا۔ ان سب کو کلیات خطوط غالبؔ (اردو ترجمہ) کے عنوان کے تحت شائع کیا جائیگا۔لہٰذا پہلے آپ یہی کام مکمل کیجئے۔

آپ کے تینوں ترجمے نامہ ہائے فارسی غالبؔ' متفرقات غالبؔ' مآثر غالبؔ انشاءاللہ یکے بعد دیگرے ہر حال میں اسی سال (یعنی ۱۹۹۸ میں) شائع ہوں گے۔آپ اطمینان رکھیے کہ آپ کے کام کی اشاعت سے مجھے اتنی ہی خوشی ہوگی جتنی آپ کو بلکہ مجھے زیادہ خوشی ہوگی کہ آپ نے یہ کام میری گذارش پر انجام دیے ہیں۔اس پر مجھے یہ دلچسپ بات یاد آئی کہ سید معین الرحمٰن صاحب نے مآثر غالبؔ کے خطوں کی تمہید میں لکھا ہے کہ یہ کام آپ نے ان کی فرمایش پر کیا ہے حالانکہ صورت حال یہ نہیں ہے۔مگر ان کا یہ لکھنا اچھا لگا۔غالبؔ سے وہ بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ہر اچھے کام سے اپنا تعلق پیدا کر کے خوش ہوتے ہیں۔ایسے شخص کی خوشی ہم سب کی خوشی ہے''۔

اپنے خط مورخہ ۲۹ جون ۱۹۹۸ء میں فرماتے ہیں ''مآثر غالبؔ'' میں شامل خطوط کے ترجمے دیکھ رہا تھا کہ ایک جملے پر نظر

پڑی'' اس پر کسی اصرار یا ایزاد کی نیت نہیں'' ۔ ایزاد کے لفظ پر خیال آیا کہ دیکھوں اصل کیا ہے۔ غالب نے بھی یہی لفظ استعمال کیا ہے یا کوئی اور - خط (۴) دیکھا تو یہ جملہ نظر آیا ۔'' ابرام و مبالغہ ندارم''۔ گویا آپ نے لفظ ایزاد کو مبالغے کی جگہ استعمال کیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں ابرام اور مبالغہ بطور مترادف استعمال کئے گئے ہیں۔ کیونکہ مبالغہ کے معروف معنی کے علاوہ ایک معنی اصرار کے بھی ہیں۔ Steingass کی ڈکشنری میں مبالغے کے یہ معنی Pressing اور Insisting کے الفاظ سے واضح کیے گئے ہیں ......ان مطالب کے اظہار کے لیے لفظ ایزاد استعمال نہیں ہو سکتا ۔ اردو میں جس طرح ہم کہتے ہیں اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے ۔تو شک و شبہ بطور مترادف استعمال کرتے ہیں ۔یہی حال ابرام و مبالغہ کا ہے''۔

موصوف کا دوسرا خط ۲۹ مارچ ۱۹۹۹ کا تحریر کردہ ہے ۔اس خط میں معمول کے سوالات وجوابات از قسم وجوہات وتوضیحات بابت تاخیر طباعت نامہ ہائے فارسی غالب اور رسید شرح کلام غالب یعنی مشکلات غالب کے بعد فرماتے ہیں ۔

'' گولڈ میڈل کی مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔اب آپ ڈاکٹریٹ بھی کر ہی ڈالیں ۔اس کے لیے بہتر کام یہ ہوگا کہ کسی اہم مخطوطے کو مرتب کیجیے ۔کسی شاعر کا دیوان یا شعرا کا کوئی تذکرہ اس مقصد کے لیے مناسب ہوگا''۔

(تفصیل اس گولڈ میڈل کی یہ ہے کہ پشاور میں اپنی تعیناتی کے دوران ۱۹۷۹-۱۹۸۳ ڈاکٹر اختر مسعود (خلف مسعود حسن رضوی ادیب)ہیڈ آف دی پرشین ڈیپارٹمنٹ یونیورسٹی آف پشاور سے میرا میل جول اکثر رہتا تھا اور ہمارے درمیان دوستوں کا سا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ فارسی کی طرف میری طبیعت کے میلان کو دیکھتے ہوئے وہ مجھ سے اکثر کہا کرتے کہ آپ فارسی میں ایم -اے کیوں نہیں کر لیتے ۔میں عدیم الفرصتی کا بہانہ بنا کر ہمیشہ ٹال دیا کرتا ۔لیکن جب میں ۱۹۹۳ میں ریٹائر ہوا تو انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور امتحان کے نصاب کی کتابوں کی فراہمی سے لیکر امتحان کے بارے میں اطلاعات دینے تک ہر قسم کی کمک کا یقین دلایا اور مجھے ایک بار اسلام آباد سے اور ایک بار کراچی سے بلا کر امتحان بھی دلوا دیا ۔یہ سانحہ مارچ یا اپریل ۱۹۹۵ کا ہے ۔نتیجے سے بھی انہیں نے آگاہ کیا اور متعلقہ اخبار کا تراشہ بھی ڈاک سے بھیج دیا جس کے مطابق یونیورسٹی کے فارسی کے نابیناؤں میں ایک واحد العین میں ہی تھا اور اس لیے گولڈ میڈل کا مستحق بھی -لیکن کئی سال تک یونیورسٹی کے متعلقہ محکمے اور رجسٹرار آفس سے خط وکتابت کے باوجود نہ ڈگری ملتی تھی اور نہ تمغہ ۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے امتحان ہی نہیں دیا تھا اور میں جھوٹ بول رہا ہوں ۔کسی کو کسی چیز کی خبر نہیں تھی ۔اختر مسعود صاحب ریٹائر ہو کر وفات پا چکے تھے ۔میں اکثر اسلام آباد یا کراچی رہتا تھا اس کام کی پیروی کون کرتا ۔تا آنکہ مجھے ایک دن یکدم الہام سا ہوا اور میں نے اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین سے مل کر اپنی معروضات پیش کیں ۔انہوں نے فوراً وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی کو فون کیا اور دو دن بعد میں جو صرف ڈگری پر بھی رضامند ہو چکا تھا وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی کے دفتر سے نہ صرف ایم -اے کی ڈگری بلکہ ایک سونے کا تو نہیں البتہ ایک سنہرا تمغہ لیکر واپس ہوا)۔

اگلے خط مورخہ ۹ -اپریل ۱۹۹۹ میں ایک بار پھر انہوں نے مکتوبات فارسی غالب کے پروگرام کا اعادہ کرتے ہوئے تحریر کیا

''باغ دودر کے سلسلے میں آپ کی حیرت بجا ہے دراصل آپ سے پہلے کسی نے اصل خطوط کا وزیر الحسن عابدی کے تحقیق نامے سے مقابلہ نہیں کیا۔ اس قسم کے نکتوں پر اس وقت نظر جاتی ہے جب کسی کام کے سلسلے میں مطالعہ کیا جائے ۔لیکن غالب جیسے بڑے ادیبوں کے ایک سے زائد ترجمے ہونے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا ۔اس لیے آپ ترجمے کا کام جاری رکھیے کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا۔ آپ کو غالب کے تمام فارسی خطوط کا ترجمہ ایک جلد میں کرنا ہے ۔لہذا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پنج آہنگ کے دو دو ترجمے ہو چکے ہیں ۔غالب کے تمام فارسی خطوط کا یکجا ترجمہ ہر حالت میں ایک نیا کام ہوگا''۔

نامہ ہائے فارسی غالبؔ پر کام جاری ہے.....حواشی پر جو آپ نے یادداشتیں لکھ رکھی تھیں کمپوز کرنے والا ان کو بھی داخل متن کر گیا۔اب ان کا اخراج بھی ایک خاصا پیچیدہ مسئلہ بن گیا۔بہر حال کام پوری توجہ سے ہو رہا ہے''۔

۱۵ ستمبر ۱۹۹۹ کے خط میں نامہ ہائے فارسی غالبؔ کا ترجمہ چھپ جانے کی نوید دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''خدا خدا کر کے آپ کی کتاب چھپ گئی۔صرف ٹائیٹل کی طباعت میں ایک مہینہ صرف ہوا۔پھر بھی ٹائیٹل حسب منشا نہ چھپا۔بہر حال کتاب کا متن صاف ستھرا ہے۔آپ دیکھیں گے تو خوش ہونگے۔کتاب جلد سازی کے آخری مراحل میں ہے۔اگلے چار پانچ روز میں اس کے دس نسخے آپ کی خدمت میں ارسال کر دیے جائینگے۔''

اگلا خط ۸ مئی ۲۰۰۰ کا تحریر کردہ ہے اور بوجوہ ان کے سارے خطوط میں جو میری زندگی کا بڑا قیمتی اثاثہ ہیں انتہائی اہم بھی۔ انتہائی اہم دو اسباب سے پہلی وجہ تو یہ کہ انہوں نے اس خط میں ایک تلخ اور ناگوار واقعہ کا حوالہ دیا ہے اور اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ دوسرا سبب یہ کہ جو موصوف اس تلخی کا سبب تھے اُن کو اُن کے موقف کی تردید میں جو خط لکھا ہے اس کی نقل بھی دوسرے تعلیقات و لوازمات کے ساتھ کہ جن پر حضرت مذکور کی رائے کی بنیاد تھی مجھے ارسال کر دی ہے۔فی الوقت میں بوجوہ صاحب مذکور کی رائے کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا اور نہ ہی گرامی قدر خواجہ صاحب مرحوم کی تردید کا بیان کرنا چاہتا ہوں لیکن اس قدر ضرور عرض کرونگا کہ یہ خط جہاں خواجہ صاحب کے علم و فضل' حفظ اصول' حق پرستی اور ادب نوازی کی بڑی مدت و مدد سے عکاسی کرتا ہے وہیں ایک اعلیٰ ادبی مرقعہ بھی ہے۔

خواجہ صاحب لکھتے ہیں'' بہت دنوں سے آپ سے رابطہ نہیں ہے' لیکن آپ کا ذکر خیر کسی نہ کسی حوالے سے ہوتا رہتا ہے۔ایک دوست نے اسلام آباد سے نامہ ہائے فارسی غالبؔ کی تقریب رونمائی کی روداد سنائی اور پھر.....صاحب نے اپنے مضمون کی نقل بھیجی۔میں نے یہ مضمون پڑھا تو افسوس ہوا کہ انہوں نے انصاف نہیں کیا۔میں نے انہیں خط لکھا ہے،اس کی نقل آپ کی تفریح طبع کے لیے ارسال کر رہا ہوں۔''

صاحب موصوف کو لکھے گئے خط سے صرف ایک مختصر اقتباس کہ میرے حق میں ایک دائم و قائم سند کی حیثیت رکھتا ہے نقل کرتا ہوں۔فرماتے ہیں'' مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے پرتو روہیلہ کے ترجمے کی پوری طرح داد نہیں دی۔ایسی صورت میں آپ پر لازم ہے کہ اپنی نگرانی میں نامہ ہائے فارسی غالبؔ کا ایک ایسا ترجمہ تیار کرائیے جو کم از کم پرتو روہیلہ کے ترجمے سے بہتر ہو۔مجھے یقین ہے ایسا ترجمہ تو اسلام آباد کے سارے فارسی دان مل کر بھی نہیں کر سکتے۔''۔

''ڈاکٹر مختار الدین صاحب اپنے پاکستانی احباب کے نام خطوط میرے پاس بھیج دیتے ہیں اور میں انہیں پوسٹ کر دیتا ہوں آج ہی آپ کے نام ان کا خط آیا ہے جو میں بھیج رہا ہوں۔ آپ کی کتاب (نامہ ہائے فارسی غالبؔ) پر اخبار جنگ میں اور دو دوسرے اخباروں میں تبصرے شائع ہوئے ہیں۔شاید یہ آپ کی نظر سے گزرے ہوں۔پاک و ہند کے کئی اہل علم اور اداروں کو آپ کی کتاب تحفتہ بھیجی گئی ہے''۔

خط مکتوبہ ۸ دسمبر ۲۰۰۰ میں لکھتے ہیں''ابھی کچھ دیر پہلے غالبؔ کے فارسی خطوط (شامل باغ دودر) کا ایک نسخہ ملا۔بے حد ممنون ہوں۔یہ کام آپ ہی کر سکتے تھے سو آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے کر دیا.....انتساب دیکھ کر میں شرمندہ ہوا (یہ کتاب میں نے بزم علم و فن انٹرنیشنل' اسلام آباد کے ذریعہ چھاپی تھی اور اس کا انتساب خواجہ صاحب کے نام کیا تھا)۔یہ تو ریشم میں ٹاٹ کا پیوند ہے۔ میں ہرگز اپنے آپ کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ ایسی اہم کتاب میرے نام سے منسوب کی جائے۔بہر حال یہ آپ کی عنایت ہے اور میری

عزت افزائی ہے۔ایسے موقعوں پر کہتے ہیں کہ دینے والے کی کشادگیٔ قلب لینے والے کے استحقاق سے زیادہ ہے۔

آپ ہندوستان کے اہل علم کو کتابیں بھیجتے ہیں اس فہرست میں ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس) اور کالی داس گپتا' رضا (بمبئی) کے نام بھی شامل کر لیجئے۔ہندوستان میں غالبؔ پر سب سے زیادہ کام ان ہی دونوں کا ہے۔

یہ خط لکھنے کے بعد میں نے آپ کی کتاب کا دیباچہ پڑھا۔آخر میں آپ نے لکھا ہے کہ باغ دودر کا اصل مخطوطہ ہمدرد کی ملکیت ہے۔اطلاعاً عرض ہے کہ یہ مخطوطہ وہاں نہیں ہے۔ایک مرتبہ میں مخطوطہ دیکھنے کے لیے ہمدرد لائبریری گیا۔حکیم محمد سعید مرحوم کی موجودگی میں اسے تلاش کیا گیا۔مگر نہیں ملا۔اُس وقت یہ انکشاف ہوا کہ ہمدرد لائبریری نے عابدی صاحب کی کتابوں کا جو ذخیرہ خریدا تھا اس میں کوئی مخطوطہ نہیں تھا۔جب کہ عابدی صاحب کے پاس کئی مخطوطات تھے اور ان میں سے بعض میں نے ان کے گھر پر دیکھے بھی تھے۔خدا جانے یہ مخطوطات کہاں گئے''۔

خواجہ گرامی اپنے اگلے خط میں جو ۱-نومبر ۲۰۰۱ کا تحریر کردہ ہے لکھتے ہیں۔

''خطوط کے ترجمے پر نظر ثانی کے لیے بہترین نام جو میرے ذہن میں آیا ہے وہ ڈاکٹر محمود شیرانی کا ہے۔موصوف شیخوپورہ میں فارسی کے پروفیسر تھے اور ابھی چند سال قبل ریٹائر ہو کر علمی کاموں میں مصروف ہیں۔ان کی علمی قابلیت کا اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ انہوں نے حافظ محمود شیرانی کے مقالات مرتب کئے ہیں اور ان کے کاموں پر تفصیل سے لکھا ہے وہ حافظ صاحب کے پوتے اور اختر شیرانی کے بیٹے ہیں۔ان کا قیام شیخوپورہ ہی میں ہے اور پتا یہ ہے:

۳۰-حافظ محمود شیرانی روڈ' سٹیڈیم پارک-شیخوپورہ-۳۹۳۵۰

ان سے بہتر فارسی جاننے والا میری نظر میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔میں نے بھی ایک اہم کام ان کے سپرد کیا ہے۔فرہنگ رشیدی کے مصنف نے معربات رشیدی کے نام سے دخیل الفاظ پر الگ مقالہ لکھا تھا۔وہ اسے مرتب کر رہے ہیں اور اس کا ترجمہ بھی کرینگے۔آپ ان سے براہ راست رابطہ کیجئے اور اگر آپ ضروری سمجھیں تو میں انہیں خط بھی لکھ دونگا۔''

دراصل خواجہ صاحب کے حکم کی تعمیل میں' میں نے تو اپنی جانب سے بڑی مستعدی دکھائی اور باوجود اس کے کہ آہنگ پنجم پر مشتمل غالبؔ کے فارسی خطوط کے دو ترجمے ہو چکے تھے (ایک از محمد عمر مہاجر ادارۂ یادگار غالب کراچی ۱۹۶۹ دوسرا از تنویر علوی اردو اکادمی-دہلی ۱۹۹۲) غالبؔ کے مکتوبات کی اس اہم ترین تصنیف کا بھی ترجمہ مکمل کر دیا لیکن اس ترجمے میں بہت سے ایسے مقامات تھے جو نظر ثانی کے متقاضی تھے اور بہت سے موارد ات ایسے تھے کہ میری سمجھ سے کھٹکا لاتر تھے۔اس ضمن میں' میں بار بار خواجہ صاحب سے رجوع کرتا اور وہ مجھے کبھی اسلام آباد اور کبھی لاہور کے علما اور فضلا کے نام پتے بتا دیا کرتے اور فروغ ادب کے اس عالی مشن کی تکمیل کے لیے متعلقہ حضرات کو خط بھی لکھ دیا کرتے اور میں ایک نیک نیت مجبور طالب علم کی طرح جس کا امتحان نزدیک ہو اور امتحان میں وہی کچھ آنے والا ہو جو میں سمجھ نہیں پایا' اپنا بستہ لیے ان حضرات کے دروازے پر پہنچ جاتا۔چنانچہ اس طلب میں' میں کس کس سے نہیں ملا' کہاں کہاں نہیں گیا' کیسے کیسے کوچوں اور گلیوں کو دریافت نہیں کیا اور کن کن اہل علم و بصیرت سے متعارف نہیں ہوا لیکن نتیجہ پھر بھی خاطر خواہ نہ تھا۔ڈاکٹریٹ کی ڈگری' تیس سالہ تدریسی تجربہ' ایران میں دس سالہ قیام اور دسیوں ایسے مرعوب کن کوائف غالبؔ کی اس تحریر کردہ عبارت کے ان مفاہیم و مطالب تک نہ پہنچا سکے جس سے مجھے اطمینان ہوتا۔چنانچہ میں نے اپنے ایک خط میں انہیں لکھا کہ جناب عالی یہ مشکل آپ نے میرے سر ڈالی ہے اب اس کا حل بھی آپ ہی پیش کرینگے۔ہر طرف سے مایوس ہو کر میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ میں آہنگ پنجم کا متن اور اس کا ترجمہ لیکر آپ کے در دولت آ بیٹھوں اور ہفتے دو ہفتے چار ہفتے آپ کے پاس بیٹھ کر بالمشافہ ان

مشکلات کو ورق وار آپ کے سامنے پیش کروں اور اس ڈیوڑھی سے اس وقت تک نہ اٹھوں جب تک یہ ساری گتھیاں کھل نہ جائیں اور مجھے اطمینان قلب حاصل نہ ہو جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب کا اسم گرامی اس روشن فہرست کا آخری نام تھا جو انہوں نے مجھے لکھ کر بھیجا۔ البتہ بالمشافہ اکتساب فیض سے انہوں نے مجھے باز رکھا اور اس عزم کو چنداں تقویت نہ دی۔ اور اپنے موقف کے حق میں خط مورخہ ۲۶ جولائی ۲۰۰۲ میں تحریر کیا۔ ذرا ان جملوں کی شدت انکساری پر بھی غور فرمایئے۔

"میں ترجمے کے سلسلے میں مشورت کے لیے حاضر ہوں۔ مگر میرے بارے میں آپ کو خوش گمانی ہے کہ میں اس کام میں کوئی مدد کر سکتا ہوں۔ میرا علم محدود بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ اہل علم کی کتابوں میں ہے۔ میں کتابوں سے استفادہ کر کے تو مشورہ دے سکتا ہوں مگر وہ جو علم حاضر ہوتا ہے وہ میرے پاس کہاں جو سامنے بیٹھ کر کچھ عرض کر سکوں۔ لہذا خط و کتابت ہی موزوں ہوگی۔ بالمشافہ مجھے شرمندگی ہوگی اور آپ کو مایوسی"۔

"طباعت کے سلسلے میں' میں ہر ممکن خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ یہ کتاب ادارۂ یادگار غالب سے فوراً شائع ہو سکتی ہے۔ آپ کو مالی امداد کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ ادارہ اپنے وسائل سے کتاب شائع کریگا۔ اور آپ کو اس کا معاوضہ نقد نہ سہی کتابوں کی صورت میں لازماً دیا جائیگا۔ (نہ جانے اس مرحلے پر خواجہ صاحب نے معاوضے کی بات کیوں کی کہ میں نے تو ان کتابوں کو بھی کہ جن کو وہ حق مصنف یا مترجم کے طور پر مجھے بھیجتے رہے اپنا انعام جانا اور وہ ترجمہ یا تراجم جو میں ان کے ایما بلکہ فرمائش پر کرتا رہا اپنا اعزاز گردانا)۔ ہاں آپ یہ مدد کر سکتے ہیں کہ اشاعت کے بعد اس کی فروخت میں مدد کر دیں۔ کمپوزنگ کراچی میں ہوگی ...... کتاب انشاء اللہ غلطیوں سے پاک ہوگی۔

متفرقات غالب کی اشاعت میں ابھی کچھ دیر ہے۔ ڈاکٹر مسعود فارسی متن کو از سر نو مرتب کرنے کا خیال رکھتے ہیں۔ جب تک یہ مرحلہ طے نہ ہوگا کام آگے نہیں بڑھے گا۔ مشکلات غالب مجھے نہیں ملی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کتاب چھپ چکی ہے یا نہیں۔"

مجھے عرصے سے اپنے کام کے سلسلے میں تصوف کی اصطلاحات کے سمجھنے میں دقت پیش آ رہی تھی اور اس لیے تصوف کی اصطلاحات پر مبنی کسی مستند لغت کی تلاش تھی۔ میں نے کسی وقت اپنی ضرورت ان تک بھی پہنچا دی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اگلے خط میں جو ۷ مارچ ۲۰۰۲ کا تحریر کردہ ہے منجملہ دوسری راہنما ہدایات کے جو معمول کے کاموں کی تکمیل کے ضمن میں تھیں مندرجہ ذیل آگاہی فراہم کی۔

"تصوف کی اصطلاحات کے لیے آپ تصوف ہی کی لغت دیکھیں۔ اب کے آپ لاہور جائیں تو داتا گنج بخش کے پاس اسلامی کتابوں کا بازار ہے وہاں آپ کو تصوف کی لغات مل جائینگی۔ فوری طور پر تو یہ چند نام ذہن میں آتے ہیں۔

۱- سر دلبراں شاہ محمد ذوقی ۲- اصطلاحات صوفیہ شاہ عبدالصمد ۳- مصطلحات علوم و فنون عربیہ ۴- محی الدین غازی اجمیری - یہ معروف لغات ہیں اور زمانہ حال میں چھپی ہیں۔ لازماً نیشنل لائبریری میں ہونگی"۔

ان کا اگلا خط ۱۲- ستمبر ۲۰۰۲ کا ہے اور اس میں انہوں نے مشکلات غالب کی رسید کی خبر دیتے ہوئے فرمایا ہے۔

"آپ کی کتاب ملی - اس عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ تفہیم غالب کے سلسلے میں آپ کا یہ کام بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے بہت سے شعروں کے ضمن میں بالکل نئے نکات پیش کئے ہیں میں نے اس کے مطالعے سے بہت کچھ حاصل کیا۔ اس کے لیے شکر گزار ہوں۔

پنج آہنگ کے سلسلے میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ ادارہ یادگار غالبؔ سے شائع کی جا سکتی ہے۔اب گرین سگنل کا کیا سوال۔ آپ جب چاہیں مسودہ بھیج دیں۔کمپوزنگ فوراً شروع کرا دونگا۔مگر یہ خیال رہے کتاب کا مکمل مسودہ طباعت کے لیے ملنا چاہیے..... پروف ریڈنگ آپ خود کر لیں تو بہت اچھا ہو.....شعر وحکمت میں آپ کا گوشہ دیکھا۔جی خوش ہوا۔ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب نظر ہیں۔اس لیے آپ کے قدر دان اور قدر شناس ہیں۔''

''پنج آہنگ کے ترجمے کا مسودہ واپس بھیج رہا ہوں۔جیسا کہ میں نے فون پر عرض کیا تھا۔یہ مسودہ اکثر مقامات پر اتنا غیر واضح ہے کہ کمپوزر نے کمپوز کرنے سے معذرت کر لی ہے..... جب تک مسودہ صاف ستھرا نہ ہو کمپوزنگ کا کام شروع نہیں کرایا جا سکتا۔ لہٰذا آپ مسودے کو صاف ستھرا لکھ کر عنایت کیجئے۔اس کی صورت کچھ اس طرح ہو۔سب سے پہلے واضح طور پر مکتوب الیہ کا نام الگ سطر میں۔اس کے بعد خط کا نمبر شمار۔تمام اشعار کے مصرعے اوپر نیچے ہونے چاہیں۔آمنے سامنے ہونے کی وجہ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ یہ نثر ہے یا نظم۔املا میں بھی یکسانیت نہیں ہے۔اکثر جگہ الفاظ کو ملا کر لکھ دیا گیا ہے.....املا کے سلسلے میں ایک یادداشت منسلک ہے۔ اسے ملاحظہ فرمالیجئے تا کہ یہ معلوم ہو کہ ادارہ اس سلسلے میں کن امور کو ملحوظ رکھتا ہے''۔

خواجہ صاحب کے خطوط کے اقتباسات کو ختم کر کے میں ایک بار پھر آپ کو ان کے خط مورخہ ۱۸ مئی ۹۸ کی طرف لے چلتا ہوں آپ کو شاید یاد ہو خواجہ صاحب نے اس خط میں متفرقات غالبؔ کے ترجمہ کے مل جانے کی اطلاع دی ہے اور ساتھ ہی اس رکاوٹ کا بھی ذکر کیا ہے' جو متفرقات غالبؔ کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۹ ان کے پاس نہ ہونے کے سبب پیش آ رہی ہے۔چنانچہ انہوں نے مجھ سے اس کتاب کے فوٹو اسٹیٹ کا عکس طلب کیا ہے جو کچھ عرصہ پہلے خود انہوں نے مجھے فراہم کی تھی۔حسب فرمائش میں نے اس کا عکس ان کو ارسال کر دیا اور فطری طریقے پر کتاب کی طباعت کے ضمن میں پیشرفت کا منتظر رہا۔لیکن ہوا یہ کہ چار سال اور دو ماہ کے مزید طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد انہوں نے اپنے خط مورخہ ۲۶ جولائی ۲۰۰۲ میں مجھے اطلاع دی کہ ''متفرقات غالبؔ کی اشاعت میں ابھی کچھ دیر ہے۔ڈاکٹر مسعود فارسی متن کو از سر نو مرتب کرنے کا خیال رکھتے ہیں۔جب تک یہ مرحلہ طے نہ ہوگا کام آگے نہ بڑھے گا۔لہٰذا میں ایک بار پھر صبر کر کے بیٹھ گیا۔اس عرصے میں غالبؔ کے آہنگ پنجم پر کام ہوتا رہا اور بالآخر خدا خدا کر کے ۲۰۰۴ء میں وہ طبع بھی ہو گئی تو مجھے یکدم اواخر سال ۲۰۰۴ یہ خیال آیا کہ متفرقات غالبؔ کے ترجمے کو ساڑھے چھ سال ہونے کو آئے اس کے بارے میں تو ان سے معلوم کروں کہ انکی طباعت آپ کے پروگرام میں ہے یا اس کو آپ نے پروگرام سے یکسر خارج کر دیا ہے۔ان کی صحت کی خرابی' سالوں کی طویل خاموشی اور بڑھتے ہوئے خوفناک گہرے سایوں کی شدت نے رابطوں کو اس طرح معدوم و نابود کر دیا تھا گویا ہمارے درمیان کوئی رسم وراہ ہی نہ تھی۔فون بھی ان کا ملازم اٹھاتا تھا اور وہ ان کی بیماری کی اطلاع دے کر بند کر دیتا تھا۔اس صورت حال میں کبھی کبھی صرف مزاج پرسی کی خاطر میں ان سے موبائل پر بات کر کے فوراً ہی بند کر دیتا تھا۔جی نہیں مانتا تھا کہ ان کی صحت و مزاج پرسی کے علاوہ کوئی دوسری بات کی جائے۔لیکن ایک دن موبائل پر مزاج پرسی کے درمیان میں نے ان کی آواز میں وہی گھرج اور توانائی محسوس کی جو کبھی ماضی میں ہوا کرتی تھی تو میں نے متفرقات غالبؔ کا ذکر چھیڑ دیا۔جواب سن کر میں حیران ہو گیا۔ وہ شخص جس کو اپنی لائبریری کی بیس تیس ہزار کتابوں میں سے ایک ایک کا عنوان اس کے مصنف کا پورا نام اور ہر کتاب کے ہر ایڈیشن کا سال تک یاد تھا' یہ بھول چکا تھا کہ متفرقات غالبؔ کے ترجمے کا مسودہ ساڑھے چھ سال سے ادارے میں پڑا ہے۔اور شاید انہیں یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اس ترجمے کی طباعت اس سبب سے ملتوی کر دی گئی تھی کہ پروفیسر مسعود رضوی صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر نیر مسعود چاہتے تھے کہ طباعت سے پہلے وہ ان خطوط کا موازنہ اصل فارسی خطوط کے متن سے ایک بار دوبارہ کر لیں۔چونکہ ان کی بے پناہ

مصروفیت میری نظر میں تھی اور میں سمجھتا تھا کہ ارسال کردہ مسودے کی بازیافت اور کمپوزنگ سے لیکر طباعت تک گرانبار و دل خراش مراحل طے کرنا اب ان کے لیے ناممکن ہے سو میں نے فوراً تجویز پیش کردی کہ اگر میں اسلام آباد ہی سے اپنی کاپی سے مسودہ کمپوز کرا کے پروف ریڈنگ کے بعد ایسی حالت میں تیار کرا کے آپ کو ارسال کردوں کہ آپ کو صرف ادارے اور طباعت سے متعلق ابتدائی صفحات شامل کرنے ہوں تو آپ کو قبول ہوگا۔ اس پر خواجہ صاحب نے اپنی سابقہ دائم وقائم فراخیٔ قلب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا جتنی جلدی ہو سکے بھیج دیجئے ایک مہینے میں چھاپ دونگا۔ لہٰذا میں اسی وقت سے اس کام پر جٹ گیا 'خدا بھلا کرے حاجی عبدالرشید صاحب (اسلام آباد میں میرا سارا کمپوزنگ کا کام انہیں کی تحویل بابرکت میں ہے) کا کہ انہوں نے ہفتے کے اندر اندر مجھے پہلا پروف دیدیا۔ میں اکثر (سال ۱۹۹۴) تراویح سے آ کر صبح سحری تک یہ پروف پڑھا کرتا تا آنکہ رمضان کے اختتام تک سارا کام ختم ہوگیا۔ دوسرا پروف بھی پڑھا چکا تھا لیکن کتاب کی تکمیل میں ایک نقص تھا اور وہ رہ رہ کر کھٹکتا تھا۔ اور وہ نقص یہ تھا کہ اس کے پانچ مکتوب الیہم میں سے چار کے مختصر سوانحی حالات لکھے جا چکے تھے لیکن "جامِ جہاں نما" کے جو کہ کلکتے کا ایک فارسی اخبار تھا' کوائف میری دسترس میں نہیں تھے۔ اپنے طور پر بڑی تگ و دو کی لیکن مسئلہ حل نہ ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب جو میرے لیے ہمیشہ مشکل کشا ہوا کرتے تھے بیمار تھے اور ان سے بیماری کی حالت میں یہ پوچھنا کہ جناب جام جہاں نما کے کوائف کہاں سے ملینگے انتہائی نامناسب معلوم ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ اس بے چینی میں گزرا کہ ایک دن جب میں نے خواجہ صاحب کی مزاج پرسی کے لیے ان سے بات کی تو انہوں نے خود پوچھ لیا صاحب آپ کی متفرقات کہاں تک پہنچی۔ میں نے فوراً اپنے دل کی بات کہہ دی۔ اور خواجہ صاحب نے اللہ ان کی روح کو اپنی رحمتوں سے سیراب رکھے اور جنت کے اعلیٰ ترین مقامات میں ان کو قیام عطا فرمائے' فوراً بغیر کسی توقف کے فرمایا ارے صاحب وہ تو ڈاکٹر طاہر مسعود کی کتاب' اُردو صحافت انیسویں صدی میں سے فوراً مل جائے گا۔ اب مجھ کوتاہ دست کا دوسرا سوال تھا۔ جناب یہ کتاب کہاں سے ملے گی جواب تھا افتخار عارف سے لے لیجئے ان کے پاس ہے۔ اور جب یہ نقص کتاب کا پورا ہوگیا اور میں نے ان کو اطلاع دی کہ مسودہ ہر طرح مکمل ہے۔ بھیج دوں! تو انہوں نے فرمایا فوراً بھیج دیجئے یہ کتاب پندرہ دن میں چھپ جائے گی۔

میری زندگی میں بہت سے ایسے واقعات آئے ہیں کہ جن کے سبب مجھے نظامِ قدرت کے اکثر امور میں ایک خاص اثر انگیز ڈرامائی عنصر نظر آیا ہے اور اس لیے یقین ہو چلا ہے کہ ہماری زندگی کے واقعات کی ترتیب میں بھی اچھے مشق کردہ ڈراموں کی سی کلائمکس کی طرف بتدریج پیش رفت اور نقطۂ عروج پر پہنچ کر بجلی کا فیوز اڑ جانے کی طرح کا ڈراپ سین ہوا کرتا ہے۔ جس دن متفرقات غالبؔ کا مسودہ نکھ سکھ نوک پلک سے ہر طرح درست اور طباعت کے لیے تیار ہوگیا اسی دن جمیل جالبی صاحب اپنے معمول کے کسی کام پر کراچی سے اسلام آباد پہنچے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ خواجہ صاحب کی حالت تشویش ناک ہے اور وہ آغا خان میں داخل ہیں۔ اور دوسرے دن صبح میں نے ٹی وی کی خبروں میں سنا خواجہ صاحب واصل بالحق ہو گئے ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ع خوش درخشید ولے شعله مستعجل بود.

پچھلے گیارہ سال سے غالبؔ کے فارسی خطوط میرا اوڑھنا بچھونا ہیں اور میرے عمل و ردِ عمل کی ساری کائنات بھی ان خطوط ہی میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب کی وفات کی خبر سن کر مجھ پر بھی تقریباً ویسا ہی اثر ہوا جو غالبؔ پر اپنے مربّی و مشفق انڈریو زاسٹرلنگ کی موت پر ہوا تھا۔ اور میں بھی وہی کچھ کہنے پر مجبور ہوں جو انہوں نے ان سانحے پر سراج الدین احمد خان کے ایک خط میں تحریر کیا تھا 'حیران ہوں کہ جواں اقبال و جواں سال حاکم یعنی انڈرواسٹرلنگ کی ناگہانی موت کا کیا مقصد ہے اور قضا و قدر کے کارخانۂ عالیہ کے کارکنوں کو اس سانحے سے کیا منظور ہے۔ اب معلوم ہوا کہ غالبؔ بدبخت کی آس و امید کی عمارت کو سپردِ سیلاب فنا کرنا

چاہتے تھے اور وہ ممکن نہ تھا بجز اس ہوش ربا ہنگامے کے اظہار کے.....اب یہ حال ہے کہ چارہ گری کی چھ جہتیں بند ہیں اور آسمان کے ساتھ ستارے بھی میرے مخالف نظر آتے ہیں''۔ مجھے بھی اب دنیا تاریک نظر آ رہی ہے منصوبوں اور عزائم کی عمارت منہدم و مسمار ہو چکی ہے۔ سامنے اندھیری تنہائی ہے اور حالی کی زبانی یہ کہنے کے سوا چارہ نہیں۔

ایک روشن چراغ تھا نہ رہا — شہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا
اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ — کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ
نقد معنی کا گنجداں نہ رہا — خوان مضموں کا میزبان نہ رہا
اٹھ گیا، تھا جو مایہ دار سخن — کس کو ٹھہرائیں اب مدار سخن
مظہر شان حسن فطرت تھا — معنی لفظ آدمیت تھا
کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں — آج بلبل نہیں گلستاں میں
ماہ کامل میں آ گئی ظلمت — آب حیواں پہ چھا گئی ظلمت

کم لنا فیہ من بکاء و عویل
و عتاب مع الزمان طویل

متفرقات غالب کا وہ مسودہ کہ طباعت کے لیے ہر طرح تیار تھا کن کن ڈیوڑھیوں کے طواف کرتا کب اور کن حالات میں دوبارہ ادارۂ یادگار غالب پہنچا اور کن مراحل سے گزرتا طباعت کے شرف سے سرفراز ہوا ایک طویل و دلدوز داستان ہے۔ اس کو کبھی آئندہ کے لیے اٹھا رکھتا ہوں ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ اوائل سال ۲۰۰۶ میں طبع ہو گیا اور ادارے نے مجھے حق مصنف کے طور پر میری کتابیں بھی ارسال کر دیں لیکن ادارے نے کتاب پر سال طباعت ۲۰۰۵ ہی ڈالا گویا کتاب مشفق خواجہ صاحب کی اعلان کردہ خواہش کے مطابق فروری ۲۰۰۵ ہی میں چھپی ہو۔

مقالہ نگاروں سے التماس

طبع شدہ یا کسی اور رسالے کو ارسال کردہ مقالے مخزن میں اشاعت کے لیے نہ بھجوائیں اور نہ ہی مخزن میں بھجوائے گئے مقالے اشاعت کا فیصلہ ہونے تک کسی اور رسالے کو ارسال کریں۔

مدیر

مشفق خواجہ بحیثیت شاعر

غلام شبیر رانا

مشفق خواجہ نے اپنی تحقیقی کامرانیوں سے اہل علم کو حیرت زدہ کر دیا۔ اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ مشفق خواجہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ''ابیات'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ زبان و بیان پر ان کی خلاقانہ دسترس ان کے اسلوب میں نمایاں ہے۔ شاعری ان کے نزدیک حال دل کہنے کا موثر وسیلہ ہے۔ ان کی شاعری خلوص اور دردمندی کی مظہر ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت میتھیو آرنلڈ کی یہ رائے قابل غور ہے:

> ''شاعری کا مستقبل بہت شاندار اور نہایت وسیع ہے جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، بنی نوع انسان کو شاعری پر زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل ہوتا جائے گا''۔[1]

مشفق خواجہ کو اپنے جذبات و احساسات کے اظہار پر جو قدرت حاصل تھی وہ ان کے اشعار میں نمایاں ہے۔ سادگی، سلاست اور خلوص ان کی شاعری کا اہم وصف ہے۔ انھیں اس بات کا شدید قلق تھا کہ بعض شاعر ساز، قلم فروش اور ضمیر فروش لوگ متشاعروں کے سدا ساتھ رہتے ہیں۔ اس طرح حقیقی تخلیق کار پر ورش لوح و قلم کرنے کے باوجود اپنے حقیقی مقام و منصب اور پذیرائی سے محروم رہتے ہیں۔ تعلقات عامہ اور بیساکھیوں کے سہارے چور دروازے سے گلشن ادب کے دراندازوں کے قبیح کردار اور گھناؤنی سازشوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے مشفق خواجہ نے انھیں ہمیشہ ہدف ملامت بنایا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''آج سے نصف صدی پہلے لکھنو کے مشہور ادیب مرزا فدا علی خنجر نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ''اردو کے ان پڑھ شعرا'' ہے۔ یہ کتاب بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو کی ترویج و اشاعت کے خیال سے شائع کی تھی۔ اس میں ساٹھ ایسے شعرا کے حالات ہیں جو ان پڑھ ہونے کے باوجود آج کے بہت سے شاعروں سے اچھا شعر کہتے تھے۔ پرانے اور نئے شاعروں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پرانے شاعروں کی شاعری سے ان پڑھ ہونا ظاہر نہیں ہوتا تھا، جب کہ نئے شاعروں کی شاعری ان کے علم و فضل پر دبیز پردہ ڈال دیتی ہے''۔[2]

مشفق خواجہ اپنے فن کارانہ عمل کے اعجاز سے اپنے جذبات و احساسات کو قاری تک اس دل نشیں انداز میں پہنچاتے ہیں کہ ان کی علمی فضیلت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں ابلاغ کو یقینی بنا دیتے ہیں۔ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے وہ اس امر کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ ان کے اور ان کے قارئین کے درمیان کوئی بُعد نہ رہے۔ سوچ کی یکسانیت اور فکر و نظر کی متوازن کیفیات روح میں اتر جانے والی اثر آفرینی کو تحریک دیتی ہیں:

کمال بے ہنری بھی ہنر سے کم تو نہیں　　مرا شمار کہیں ہو مجھے یہ غم تو نہیں

یہی غزل مری محرومیوں کا نوحہ غم
یہی غزل ترا آئینہ جمال بھی ہے

جو پا سکا نہ تجھے میں تو کھو دیا خود کو
یہ میرا عجز ہنر بھی مرا کمال بھی ہے

گزر گئے ہیں جو دن ان کو یاد کرنا کیا
یہ زندگی کے لیے روز روز مرنا کیا

مری نظر میں گئے موسموں کے رنگ بھی ہیں
جو آنے والے ہیں ان موسموں سے ڈرنا کیا

گزر رہی ہے، غنیمت ہے زندگی، ماما
مگر یہ ایک ہی انداز سے گزرنا کیا

غم ہی لے دے کے مری دولت بیدار نہیں
یہ خوشی بھی ہے میسر کوئی غم خوار نہیں

قدم اٹھے تو عجب دل گداز منظر تھا
میں آپ اپنے لیے راستے کا پتھر تھا

یہ کوئی دل تو نہیں ہے کہ ٹھہر جائے گا
وقت اک خواب رواں ہے سو گزر جائے گا

ساتھ کچھ دور چلا دولت دنیا کی طرح
پھر مجھے چھوڑ گیا نقش کف پا کی طرح

مشفق خواجہ کی شاعری میں ان کے تجربات ومشاہدات کا موثر بیان اس قدر روجدانی کیفیات کا حامل ہے کہ قاری مسحور ہو جاتا ہے۔الفاظ کے انتخاب ،تراکیب کے استعمال اور دل نشیں انداز بیان کے اعجاز سے ان کی شاعری سحر نگار بن جاتی ہے۔ان کی شاعری حسن کا دلکش معیار پیش کرتی ہے جذبہ انسانیت نوازی ان کے اسلوب کا اہم وصف ہے۔وطن اور اہل وطن کے ساتھ قلبی لگاؤ اور والہانہ وابستگی ان کی شاعری کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔رنج اور راحت کا بیان ان کی شاعری میں قابل توجہ ہے۔اسے اگر ایک وقوفی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے ہاں خوشی کو ایک حیات آفریں قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جب کہ غم واندوہ کو مرگ آفریں خیال کیا گیا ہے۔اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ہجوم یاس میں جب سینہ و دل پر حسرتوں کا بادل چھا جاتا ہے تو انسان کا ان مسموم حالات میں گھبرا جانا ایک فطری امر ہے۔گردش مدام سے مشفق خواجہ کا دل بھی گھبرا جاتا ہے۔بحیثیت انسان ان کی سوچ آلام روزگار سے اثرات قبول کرتی ہے:

اک ایسا شخص بھی دائم سفر میں رہتا ہے
جو قید اپنے ہی دیوار و در میں رہتا ہے

مری غزل سے نہ سمجھا وہ میرے غم کو تو کیا
یہی بہت ہے وہ اپنا سراغ پائے گا

ہجوم غم سے قائم دلوں کی تنہائی
یہ بستیاں ہوئیں آباد خاک اڑانے کو

ہر شخص سزاوار نہیں دولت غم کا
ہر شخص کو ملتا نہیں یہ منصب عالی

رہ گزر دل کی نہ پل بھر کو بھی سنسان ہوئی
قافلے غم کے گزرتے رہے اکثر کیا کیا

خوش تھے ہم یوں کہ اسیر غم دنیا نکلے
پر یہاں بھی کئی بت طالب سجدہ نکلے

مختصر لاکھ سہی قصۂ بربادئ دل
گر بیاں کیجے تو عمر اور بھی کم ہو جائے

یہی تعبیر ہے خواب دل سودائی کی
زندگی رات ہے اور رات بھی تنہائی کی

غم بچھڑنے کا نہ ملنے کی ہے راحت کوئی
یوں اٹھاتا ہے یہاں زیست کی تہمت کوئی

ہجوم ہم نفساں چارۂ الم نہ ہوا
کہ اس طرح غم تنہا روی تو کم نہ ہوا

خلوص اور دردمندی مشفق خواجہ کی انفرادی خصوصیات ہیں۔یہ خصوصیات ان کی شاعری میں اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں۔اپنی ذہنی اُپج اور آہنگ کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ اپنی واردات قلبی کو ایسی تاثیر سے متمتع کرتے ہیں کہ ان کی بات دلوں میں اتر

جاتی ہے۔تخلیق فن کےلمحوں میں وہ فطرت کی صداقتوں کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ان کی شاعری ان کے قلبی اور روحانی توازن کا دلکش اظہار ہے۔وہ وفا، خلوص اور محبت کو زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔حق وصداقت اور انصاف کی جدوجہد ان کا مطمح نظر ہے۔وہ اپنی تخلیقی فعالیت کے معجز نما اثر سے زندگی کی حقیقی معنویت کو اجاگر کرنے کے آرزومند ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی آزادی اور انسانیت کی سربلندی کو کلیدی اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں۔ظلم، جبر اور ناانصافی کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ان کی شاعری عصری آگہی کا حسین نمونہ ہے۔

مشفق خواجہ کی شاعری میں احساس کی شدت قابل توجہ ہے۔زندگی کے واقعات اور ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات ان کے دل پر جو اثر مرتب کرتے ہیں، انھی داخلی کیفیات کو وہ نہایت دردمندی اور خلوص کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتے ہیں۔تخلیق فن کےلمحوں میں وہ اپنی تمام داخلی کیفیات کی لفظی مرقع نگاری اس فنی مہارت سے کرتے ہیں کہ ان کی یہ طرز فغاں قاری کے لیے ایک روحانی حظ کا وسیلہ ثابت ہوتی ہے۔اپنے نفسی اعمال سے وہ بھرپور آگہی رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ایک سماجی عمل کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

مشفق خواجہ کا اسلوب فطری صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ان کی شاعری عمرانی حقائق کو دل نشیں انداز میں پیش کرتی ہے۔آج کے دور میں جب کہ پورا معاشرتی نظام ہلچل کی زد میں ہے۔اقدار وروایات کی زبوں حالی نے پژمردگی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔مشفق خواجہ کی شاعری ادراک اور شعور کے نئے امکانات لیے ہوئے ہے:

گزرتے وقت کی ہر چاپ سے میں ڈرتا ہوں — نہ جانے کوئی سا لمحہ اداس کر جائے
یادیں رہ جائیں گی اور یادیں بھی ایسی جن کا — زہر آنکھوں سے رگ و پے میں اتر جائے گا
ہم کو اک عمر نہ جینے کا سلیقہ آیا — ہم نے اک عمر تمناؤں کے دھوکے کھائے
آنے والے غم و اندوہ کا دیتا ہے پتا — وہی اک لمحۂ راحت جو میسر بھی نہیں
کبھی پیغامِ سکوں تیری نظر نے نہ دیا — زندگی چھین لی اس طرح کہ مرنے نہ دیا
یہ زندگی کے مسائل سلجھ تو سکتے ہیں — مری طرح سے کوئی پائمال ہو تو سہی
بکھرے ہوئے خوابوں کو سمیٹوں تو یہ سوچوں — کیوں فاصلے بڑھتے ہی گئے فکر وعمل کے
راہ کے مصائب سے تھک کے بیٹھنے والے — زندگی سفر میں تھی، زندگی سفر میں ہے
دل کا لہو آنکھ سے بہا ہے — کاغذ پہ جو حرف بولتا ہے
جب دل میں کوئی تازہ گل زخم کھلا ہے — آئندہ بہاروں کا سراغ اس سے ملا ہے

مشفق خواجہ اپنے حسن بیان سے اپنی تخلیقات میں ایسا رنگ بھر دیتے ہیں کہ قاری ان کی سحر نگاری پر دم بخود رہ جاتا ہے۔وہ زندگی سے محبت کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ انھیں اس بات کا سخت رنج ہے کہ جدید دور میں زندگی کی رعنائیوں کو ہوس زر نے گہنا دیا ہے۔ذاتی مفادات نے بے لوث محبت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ایثار، خلوص اور زندگی کی اقدار عالیہ رفتہ رفتہ عنقا ہونے لگی ہیں۔جانکسل تنہائیوں نے انسان کو جاں بہ لب کر دیا ہے۔مشفق خواجہ کی شاعری میں ایک روحانی کشف کا احساس ہوتا ہے:

تنہائی نے دیواروں پہ وہ نقش گری کی — لگتا ہے کسی اور کا گھر، اب تو گھر اپنا

میں آپ ہی دروازہ ہوں اور آپ ہی دستک — اور آپ ہی بیٹھا ہوں یہاں منتظر اپنا
یہ حال ہے مرے دیوار و در کی وحشت کا — کہ میرے ہوتے ہوئے بھی مکان خالی ہے
دم نظارہ مری حیرتوں پہ غور نہ کر — کہ میری آنکھ ازل سے یونہی سوالی ہے

مشفق خواجہ نے دکھ اور سکھ کے مقام اتصال پر کھڑے ہو کر زندگی کے حقائق کی گرہ کشائی کی ہے۔انھوں نے دل کے آئینے میں تمام حقائق کو محفوظ کرلیا۔ان کا دل ایک جام جہاں نما کا منظر پیش کرتا ہے۔

مشفق خواجہ اپنی تخلیقی فعالیت کو بروئے کار لا کر قاری کو جرأت اظہار اور حریت فکر و عمل کی راہوں پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔وہ کہنہ روایات سے گریزاں ہیں اور افکار تازہ کے وسیلے سے جہان تازہ کی نمود کے متمنی ہیں۔ان کی شاعری جہد و عمل کی نقیب بھی ہے اور حرکت و حرارت کی امین بھی۔وہ مایوسی اور بے یقینی کو ناپسند کرتے ہیں اور امید کا دامن تھام کر آگے بڑھنے کا پیغام دیتے ہیں:

نہ یاد رکھتا تھا مجھ کو نہ بھول جاتا تھا — کبھی کبھی وہ مجھے یوں بھی آزماتا تھا
جلوہ جلوہ رعنائی، چہرہ چہرہ شادابی — یا مری نظر سے ہے یا مری نظر میں ہے
دل آینہ ہے تو اس آینے کو رونق دے — جو آنکھ دی ہے تو پھر خواب بھی دکھا کوئی
بس اک کرن ہی بہت ہے ترے تبسم کی — مسافران شب تار کی سحر کے لیے
وقت کی آندھیاں لاکھ سرکش سہی — سرکشی کچھ انھیں کا تو حصہ نہیں
جن چراغوں کو جلنا تھا جلتے رہے — رہ گزر رہ گزر جگمگاتے رہے
تلخی زیست گوارا ہے اس احساس کے ساتھ — کہ اسی زیست سے وابستہ رہا ہے کوئی
جو مثل باد صبا پاس سے گزر جائے — کبھی ہمیں بھی وہ پہچان کے ٹھہر جائے
تو میرے دل میں مثال چمن مہکتا ہے — میں سانس لوں تری خوشبو بکھر بکھر جائے
میں آینہ ہی نہیں عکس بھی ہوں لیکن تو — وہ روشنی ہے جو دامن کشاں گزر جائے
صرف اک ترے خیال کے آنے کی دیر تھی — رنگینیوں میں ڈوب گئی ساری کائنات

مشفق خواجہ کی شاعری لطیف جذبات اور سچے احساسات سے لبریز ہے۔ان کی خواہش تھی کہ قاری کے جذبات و احساسات کی تہذیب و تزکیہ اس طرح کیا جائے کہ اس دور کی ظلمت کے مسموم اثرات کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں مدد ملے۔وہ فکر و خیال کو مثبت اور صحت مند بنیادوں پر استوار کرنے کے آرزومند تھے۔ان کی شاعری مسائل عصر کی تمازت لیے ہوئے ہے:

آرزو یہ ہے کہ بک جائیں ترے ہاتھ کبھی — ہم یہی سوچ کے آپ اپنے خریدار ہوئے
چشم خوباں کے اشاروں پہ تھا جینا مرنا — روز بنتے تھے بگڑتے تھے مقدر کیا کیا
اس قدر حیرتی جلوہ تھے دیوانے ترے — کچھ نہ کہنے پہ بھی کہتے رہے افسانے ترے
ہم نے ہر شے کو تجھے دیکھ کے دیکھا اکثر — ہم نے ہر روپ میں سو روپ ہیں پہچانے ترے
مجھ کو کھویا تو دل زار یہ نکتہ سمجھا — آینہ بن کے ہر اک عکس کو اپنا سمجھا

مشفق خواجہ کی شاعری میں جذبات و احساسات کی دلکش اور دلنشین کیفیات قاری کے قلب و نظر کو مسخر کر لیتی ہیں۔نوع

انسان سے محبت ایک فطری اور جبلی انداز میں ان کی شاعری میں موجود ہے۔ان کی تخلیقی فعالیت ایک فطری اور جبلی میلان کی آئینہ دار ہے وہ خارجی مظاہر سے بھی داخلی طور پر گہرا اثر قبول کر کے اپنی کیفیات کو اس مہارت سے پیرایۂ اظہار عطا کرتے ہیں کہ ادراک اور وجدان کو جہانِ معنی سے آشنا کرنے میں مدد ملتی ہے۔زندگی کے نشیب وفراز جس طرح انھوں نے محسوس کیے انھیں بعینہٖ پیش کر کے انھوں نے تخلیق کو زندگی کے حقائق سے ہم آہنگ کر دیا۔مشفق خواجہ کی شاعری سے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ ہوا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بحوالہ جمیل جالبی، ڈاکٹر: ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، اشاعت اول ۱۹۷۵ء، ص ۳۵

۲۔ مشفق خواجہ: خواجہ کی مشفقانیاں، ظرافت، کراچی، جلد ا، شمارہ ۵۔۷، فروری اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۱۸

وداع و وصل

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

(میر تقی میرؔ)

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

(غالب)

وصل ہو یا فراق ہو اکبرؔ
جاگنا ساری رات مشکل ہے

(اکبر الہ آبادی)

کتابیات ریاض احمد

نام	ریاض احمد
ولدیت	چوہدری نیاز احمد خاں
تاریخ پیدائش	۲۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء
مقام پیدائش	ایک چھوٹے سا گاؤں تحصیل وزیر آباد میں
ابتدائی تعلیم	چھٹی جماعت تک آس پاس کے دیہاتی مدرسوں میں حاصل کی۔ ساتویں سے بی اے تک سیالکوٹ میں مرے کالج سے ۱۹۳۹ء میں بی اے کیا۔ بعد ازاں ملازمت کے دوران گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے (اردو) اورلاء کالج سے ایل ایل بی کیا۔
ملازمت	۱۹۴۲ء میں دفتر فنانشل کمشنر پنجاب میں بطور جونیئر کلرک شروع کی۔ اسی دفتر سے جو بعد میں بورڈ آف ریونیو پنجاب کہلایا، اسسٹنٹ سیکرٹری کی حیثیت میں ۱۹۸۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد لاہور ہی میں مقیم ہیں۔

کتابیں: تنقیدی مسائل — قیوم نظر
دہان زخم (شاعری) — ریاضتیں۔
دریاب — تصدیق
برٹرینڈ رسل کی چند تحریریں (ترجمہ)

ادارہ مشعل پاکستان کی ایما پر مختلف رسائل میں تنقیدی مضامین۔
تجزیے، تبصرے وغیرہ (زیادہ تر ادبی دنیا (کراچی) علامت لاہور، اوراق، مخزن وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ اب ان کو جمع کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔

کتابیات محمد عالم مختار حق

آپ ۱۴ شوال ۱۳۴۹ھ مطابق ۴ مارچ ۱۹۳۱ء کو جھگیاں شہاب الدین لاہور میں پیدا ہوئے۔ والدین نے محمد عالم نام رکھا مگر پیر غلام دستگیر نامی مرحوم نے تاریخی نام مختار حق رکھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا الحاج محمد حسین بن کرم الٰہی بن حسن محمد بن برہان الدین سے حاصل کی۔ میٹرک پاس کیا تو چودھری جلال الدین اکبر ہیڈ ماسٹر کی صحبت میسر آئی جو فارسی، اردو کے شاعر، ادیب اور صوفی کامل تھے (جلال الدین صاحب اکبر کو سلیمان ندوی پنجاب کا حسرت موہانی کہہ کر یاد فرماتے) علمی ذوق اور فارسی ادب سے لگاؤ پیدا ہوا۔ فاضل فارسی کیا۔ علمی کتابوں کا مطالعہ آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ اچھی کتاب دیکھتے تو نہ صرف پڑھتے بلکہ اپنے کتب خانہ میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ یہ ذوق کتب بینی تھا کہ آپ لاہور کے مشہور مورخ مولانا غلام رسول مہر کے کتب خانہ تک پہنچے۔ نادر کتابوں کو دیکھا تو مولانا مہر کے رفیق مجلس اور معاون قلم بن گئے اور عمر بھر ان کے علمی ذخیرہ سے اپنے ذوق علم کی تسکین کرتے رہے۔ مولانا مہر کو آپ کی محنت، کتاب فہمی اور ذوق مطالعہ پر بڑا ناز تھا۔ متعدد نادر کتابیں اپنے دستخطوں سے عطا کیں۔ سیکڑوں ادبی خطوط آپ کے نام لکھے جو آپ کا سرمایہ حیات ہیں۔ آپ نے آج تک ۱۲ ہزار نادر کتابیں ذاتی کتب خانہ میں جمع کیں۔ اہل ذوق آپ کو مزاج شناس مہر علامہ کہتے ہیں بایں ہمہ وہ ایک صوفی منش، بزرگان دین کے عقیدت منداور اہل علم کے قدردان دوست ہیں۔

رسالہ ''سیارہ ڈائجسٹ'' کے قرآن نمبر کے آپ خصوصی معاون تھے۔ آپ کا اردو پنجابی تراجم پر پُرمغز اور مفصل مقالہ چھپا، جس سے آپ کو علمی حلقوں میں شہرت ملی۔ ملک پر متعدد رسائل میں مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ انور سدید نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ کوئی تحقیقی کام ان کے کتب خانہ سے استفادہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ نقوش کے سیرت نمبر کے لیے ایک انڈیکس تیار کیا جس میں سیرت النبی پر اردو ادب میں جتنا کام ہوا ہے اس پر معلومات جمع کر دی ہیں۔

تصانیف:

۱۔ نقوش جمیل ۱۹۵۹ (حالات والد مکرم الحاج میاں محمد حنیف مرحوم) ۲۔ خطبات یوم رضا ۱۹۸۱ء
۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ایک نادر روزگار شخصیت ۱۹۹۴ء (ترتیب مقالات مولانا غلام رسول مہر)
۴۔ رودادحوزہ نقشبندیہ ۲۰۰۳ ۵۔ یادگاری کتابچہ ۲۰۰۰
۶۔ نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہ (جلد اول) ۲۰۰۴ ۷۔ مشفق من خواجہ من ۲۰۰۶ء
۸۔ مشفق نامے ۲۰۰۶ء

زیر طبع:

۱۔ نذر حکیم (حکیم محمد موسیٰ امرتسری پر لکھے گئے مقالات کا مجموعہ) ۲۔ نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہ (جلد دوم)
۳۔ مولوی شمس الدین، نادرہ کتب فروش ۴۔ اردو میں اربعینات
۵۔ فکر فاروقی (پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کے ماہنامہ جہان رضا میں لکھے گئے اداریوں کا مجموعہ)

چار کتابیں۔ چار زاویے

ڈاکٹر سلیم اختر

ادب کی گرمی بازار کتب وجراید کی مرہون منت ہے۔ ذرا تصور کیجیے ایسے برس کا جس میں مطبوعہ لفظ کی صورت ہی کو ترس جائیں تو فکری اور جمالیاتی لحاظ سے یہ نائٹ میئر سے کم نہ ہوگا۔ اسی لیے ادب کے گلشن کا کاروبار لفظ سے مشروط ہے۔ باتیں بنانے والے الفاظ اور باتیں چھپانے والے الفاظ۔

یہ مختصر تمہید ان کتابوں سے تعارف کرانے کی غرض سے ہے:

۱۔	ف س اعجاز: ''ہشت پہلوفن کار''	از ڈاکٹر سید یحیٰ نشیط
۲۔	آپ بیتی کے تو انا لہجے	از قدرت اللہ شہزاد
۳۔	الست	از منیر سیفی
۴۔	آفتاب ولایت	از علامہ سید زین العابدین شاہ راشدی

ایک کتاب سوانح عمری کی، دوسری تنقید کی، تیسری شاعری کی، چوتھی اردو کے بارے میں اور پانچویں صوفی کے بارے میں، زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کے پانچ قرینے سمجھئے ان کتابوں کو!

پاکستان کے جن اہل قلم کے پاس کولکتہ سے نکلنے والا رسالہ ''انشاء'' آتا ہے ان کے لیے ف۔س اعجاز صاحب کا نام نامانوس نہیں۔ ''انشاء'' ادب کے ساتھ ساتھ، فنون لطیفہ، مذہب، سائنس اور فلم کے بارے میں مقالات کے ساتھ ساتھ معاصر اہل قلم کی تخلیقات کو سلیقہ سے پیش کرنے کی وجہ سے بھارت کی مجلاتی صحافت میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید یحیٰ نشیط تدریس کے پیشہ سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے ''اردو شاعری میں مذہبی رجحانات'' پر تحقیقی مقالہ قلم بند کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی متعدد تحقیقی کتب اور مقالے تحریر کر چکے ہیں اور تحقیق کا یہی رنگ ''ف س اعجاز ہشت پہلوفن کار'' میں بھی نظر آتا ہے۔ ۴۱۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب اعجاز صاحب کی محض سوانح عمری ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے فروغ کے سلسلہ میں بنگال اور کلکتہ سے تعلق رکھنے والے اہل قلم کی مساعی کا تذکرہ بھی ہے۔ اس ضمن میں نشیط صاحب نے شاعری کے ساتھ نثر نگاروں اور ادبی جرائد واخبارات کے بارے میں بھی اچھی خاصی معلومات فراہم کرتے ہوئے تاریخی سیاسی اور عمرانی نقطہ نظر سے اہل بنگال کے مزاج اور شعری ذوق کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے یہ دلچسپ نتیجہ اخذ کیا:

''لکھنوی معاشرت اور بنگالی معاشرت میں خاصہ بُعد پایا جاتا ہے۔ لکھنوی تہذیب شرافت، نزاکت کی حامل ہے ایسی شرافت الجھاؤ اور ٹکراؤ کو پسند نہیں کرتی، اس کے علی الرغم دہلی اور بنگال کی شرافت میں

صلابت پائی جاتی ہے، یہ سرنگونی کو نہیں سربلندی کو پسند کرتی ہے، یہ ٹکراؤ کی کیفیت میں پسپا نہیں ہوتی مدمقابل بننے کو ترجیح دیتی ہے ۔ یہ ساری خصوصیات اہل بنگال میں ہیں اس لیے انہوں نے نزاکت کی بہ نسبت صلابت کو اپنی شاعری میں پسند کیا جو دہلویت کا طرۂ امتیاز ہے''

اور اسی نقطۂ نظر سے نشیط صاحب نے بنگال کے اردو شعرا کا مطالعہ کیا۔

بنگال میں اردو شاعری، نثر اور صحافت کے مفصل مطالعہ کے بعد ف س اعجاز صاحب کی شخصیت، عملی زندگی، مدیرانہ کاوشوں اور تخلیقات کا مفصل مطالعہ کیا گیا ہے جو ۲۷۲ صفحات پر پھیلا ہے جس کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اعجاز سیلف میڈ انسان ہیں ۔ زمانہ طالب علمی میں فیس وغیرہ کے لیے بعض اوقات ٹیوشن پڑھانے پر مجبور ہوئے ۔ بقول اعجاز کے ''میرا امبیشن تو ڈاکٹر بننا تھا لیکن میں ڈاکٹر نہیں بن سکا حالات نے میرا رجحان کاروبار کی طرف کر دیا'' ۔

۱۹۸۶ء میں کلکتہ سے ماہنامہ ''انشاء'' کا اجرا اہم واقعہ تھا ۔ ''انشاء'' اعجاز صاحب کی محنتوں کا ثمر ہے اور ہنوز بھی جاری ہے ۔ ''انشاء'' سے قبل اڑھائی برس تک ''فانوس ڈائجسٹ'' بھی نکالتے رہے ۔ اعجاز صاحب کی اب تک ۹ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے پانچ شعری مجموعے ہیں ''لاشریک''، ''شہنایاں''، ''موسم بدل رہا ہے''، ''صاحب فن''، ''مالک یوم الدین'' ۔

نشیط صاحب نے اعجاز صاحب کے شاعرانہ رجحانات و میلانات کے عنوانات قائم کر کے ان کے تحت مختلف شعری مجموعوں میں بکھرے اشعار، منظومات، غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے نہ کہ مجموعوں کا انفرادی مطالعہ اور اس رویہ کے نتیجہ میں ایک تو وہ تکرار سے بچ گئے اور دوسرے اعجاز صاحب کی شاعرانہ حیثیت کا بہتر طور پر اندازہ ہو جاتا ہے ۔ نشیط صاحب کے بقول:

> ''اعجاز ذات و کائنات کا شاعر ہے ۔ ذاتی کرب و انبساط اور الم و نشاط کے ساتھ ہی ''جگ بیتی'' بھی ان کی شاعری میں جھلکتی ہے لیکن جہاں تک ان کے تغزل کا تعلق ہے وہاں ان کی ذات ہی کائنات بن جاتی ہے ۔ بعض اوقات جگ بیتی کے کرب سے شاعر سسکنے لگتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا ساری کائنات اس کی ذات میں سمٹ آئی ہے ۔ اعجاز کے ایسے اشعار آفاقی شاعری کا ایک حصہ بن سکتے ہیں ۔ اعجاز کی شاعری کا پرکار اخلاق، سماج اور حسن کے مثلث کے تینوں نقطوں کو چھو کر گزرتا ہے ۔ اس لیے ان کی شاعری سماجی حسن اخلاق کا مرقع بن گئی ہے'' ۔ (ص: ۶۱)

یہ تبصرہ جہاں ف س اعجاز کی شاعرانہ خصوصیات کا بیان ہے وہاں مبصر کی تنقیدی حس کا بھی مظہر ہے جو تاثراتی ہے اور فراق گورکھپوری کے ''انداز ے'' سے مشابہ اسلوب کی حامل ۔

اعجاز صاحب کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، ایسے اشعار جو اعجاز کی شعری حسیت کے ساتھ ساتھ ان کے اسلوب کے رنگ خاص کے ذائقہ کے بھی حامل ہیں:

گھنے چناروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں کس لیے اور کیوں کھڑے ہو
نہ آئے گا کوئی تم سے ملنے تم اپنی ہی ضد پہ کیوں اڑے ہو
تمہیں تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے تمہاری طاقت گھٹی نہیں ہے
چلو اٹھو، اپنے ہاتھ جھاڑو تم اتفاقاً ہی گر پڑے ہو

وسعتِ شہرِ الم میں سرخوشی کی بات ہو
آج تو کچھ پتھروں کی دلکشی کی بات ہو

اور تھوڑی دیر سو لیں ہم تیری آغوش میں
نیند سے اٹھیں تو شاید خودکشی کی بات ہو

اسی زندگی کے جھمیلے میں اک دن کہیں عشرت وغم کے ملبے میں اک دن
زمانے کی کروٹ سے ہم کتنا بدلے سوالی نگاہوں سے پوچھا کریں گے

تیرے جلووں سے مری آرزو پیچھے رہ گئی
روشنی آواز سے ہے تیز تر، ثابت ہوا

میرے خیال میں ان چند اشعار سے ف س اعجاز کی سوچ اور اسلوب کا کسی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
نثر میں ''یورپ کا سفرنامہ''، ''اسلامی تصوف اور صوفی''، ''خوابوں کے اسرار'' (ترجمہ)، نیتا جی سبھاش چندر بوس'' (ترجمہ)، گیتا نجلی کی انگریزی نظموں کے تراجم۔ یہ ہیں ان کی دیگر کتب۔
ف س اعجاز محض مدیر نہیں وہ نثر نگار، مترجم اور شاعر بھی ہیں۔ اور نشیط صاحب نے ان کی تمام حیثیتوں کا مفصل تعارف کرایا ہے:

''اردو میں ایسی کتابیں اعجاز کی محنت شاقہ کی وجہ سے آئی ہیں جن کی ادبی اہمیت مسلم ہے اردو ادب کے ساتھ دیگر علم وفن کی بہترین ترجمانی بھی کرتی ہیں۔ مجھے اس امر کے اعتراف میں کچھ بھی تردد نہیں ہے کہ اردو میں ''خوابوں کے اسرار'' اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں طب ونفسیات کے حوالوں سے خواب کی دنیا پر بحث کی گئی ہے۔ بہرحال اعجاز کی یہ تمام تصانیف ان کے تخلیقی شعور کا پتہ دیتی ہیں۔ اپنے کاروباری پیشہ میں مصروف اعجاز ادب نوازی کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں اور سچی عقیدت سے صنم ادب کی پرستش کرتے ہیں۔ کیا اس میں ان کے شعور کو دخل نہیں ہے''۔ (ص: ۲۰۷)

کتاب انشا، پبلی کیشنز، بی ۲۵، زکریا سٹریٹ کولکتہ سے ۲۰۰ روپے میں مل سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

سوانح عمری سے گریز کرتے ہیں آپ بیتی کی جانب، سوصفحات کی ''آپ بیتی کے توانا لہجے' قدرت اللہ شہزاد کی تالیف ہے جس میں خواجہ حسن نظامی (''آپ بیتی'') زیڈ اے بخاری (''سرگزشت'') ڈاکٹر عبادت بریلوی (''یادِ عہد رفتہ'') آل احمد سرور (''خواب باقی ہیں'') اختر الایمان (''اس آباد خرابے میں'') شہرت بخاری (''کھوئے ہوؤں کی جستجو'') مظفر وارثی (''گئے دنوں کا سراغ'') ڈاکٹر جاوید اقبال (''اپنا گریباں چاک'') اداجعفری (''جو رہی سو بے خبری رہی'') کشور ناہید (''بری عورت کی کتھا'') اور قمر جعفر علی عباسی (''ایک عمر کا حصہ'') کا مطالعہ کیا گیا ہے: آپ بیتی کی تنقید میں کچھ حصہ ڈالنے کے لیے ''ابتدائی کلمات'' از مولف)

اردو ادب کی ان دس اہم شخصیات کی آپ بیتیوں کا مطالعہ اس بنا پر قابل توجہ ہے کہ ان سب نے اپنے اپنے انداز اور اسلوب میں اپنا اپنا سیلف پورٹریٹ پینٹ کیا ہے نرگسیت کے رنگوں سے کہیں مدھم اور کہیں چیختا تے اس ضمن میں اگر خواجہ حسن نظامی یہ لکھتے ہیں کہ اوائل عمری میں ایک نیک چلن اور تارک الدنیا شخص حافظ عبدالغنی کو ان سے دعوی عشق تھا (ص: ۹) تو دوسری جانب ڈاکٹر جاوید اقبال ''اپنا گریباں چاک'' میں میموں اور کاروں کی تصاویر شائع کر کے اپنے قاری کی فرسٹریشن میں اضافہ کرتے ہیں۔ الغرض مختلف بلکہ متضاد صفات کے حامل ان قلم کاروں کی آپ بیتیوں کا یہ مختصر مطالعہ اور نہیں تو اس بنا پر قابل توجہ ہے کہ کسی ایک کتاب میں دس اہم شخصیات کی آپ بیتیوں پر تبصرہ مل جاتا ہے۔

البتہ قدرت اللہ شہاب اگر ''توانا لہجے'' کی بھی وضاحت کر دیتے تو بہتر ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ کتاب کا نام رکھتے وقت ان کے ذہن میں "Powerfull" کا لفظ ہو گا۔ اگر نام کو انگریزی میں لکھیں تو وہ "Powerfull Auto Biogra Phies" بن جاتا ہے اور اس کا ترجمہ ''آپ بیتی کے توانا لہجے'' غلط نہیں۔

کتاب شیلج پبلی کیشنز، زنانہ ہسپتال روڈ، بہاول پور سے مل سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

''مثال'' اور ''لو'' کے بعد منیر سیفی کی غزلوں کا تازہ مجموعہ ''الست'' اس سوال کو جنم دیتا ہے کہ کیا ''الست'' کا لفظ اس کے شعری رویوں کا مظہر ہے یا محض برائے شعر گفتن است۔

معاصر زندگی تصوف کے شعور اور اس کے پیدا کردہ رس سے محروم ہے، اگر ایک طرف تصوف قبر پرستی اور تعویذ سازی کے مترادف قرار پایا تو دوسری جانب جدید بستیوں کے مکینوں اور رزق حرام پر پلنے والوں نے کاذب مذہبیت کے اشتہار کے طور پر اپنے پیروں سے پینگیں بڑھائیں اس لیے جب شاعر مجموعہ کا نام ''الست'' رکھے تو یہ سوال بے جا نہ ہو گا کہ کیا یہ بطور فیشن ہے یا برائے تفنن۔ کتاب کا دیباچہ نگار خالد اقبال یاسر تو اسے اس ضمن میں سو نمبر دے گیا ہے:

''منیر سیفی نہ تو سرمد ہے نہ خیام اور نہ ہی میر درد لگتا ہے کہ اس کے لیے زندگی بھی تصوف ہے اور شاعری بھی تصوف''۔

تو آیئے اس انداز کے چند اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں جن سے شاعر کا طرز احساس اجاگر ہو جاتا ہے:

چڑیوں کی آواز نہ کانوں تک آ سکتی
گھر میں اتنا شور مچایا جا سکتا تھا

بستے میں ہر شے رکھی تھی
بچپن رکھنا بھول گیا تھا

اک دیوار گرانے اک پردہ اٹھنے سے
اندر باہر ایک نظارہ ہو سکتا تھا

وہ ایک ساعت جو اک صدی پر گراں تھی سیفی

وہ ایک ساعت گزر رہی تھی تو میں کہاں تھا
کسی سے گفتگو ہی گفتگو میں
مکمل ہو گیا دیوان اپنا

ایک کتا، اک دیا اور اک فقیر
اک تماشا رات بھر ہوتا رہا

کون اترا ہے سیپ کے دل میں
کس نے دیکھا ہے موتیوں کا گھر

وقت کے اندھے کنوئیں میں تو
اپنا نام پکارا کر

مڈر بھی ذات میں اپنی ہوں خود سے خائف بھی
لہو میں میرے حرا بھی ہے ارض طائف بھی

مرا سودا تو کب کا ہو چکا بھی
تو پھر یہ گرمیٔ بازار کیا تھی

اپنے بچوں کے بچوں میں بانٹ رہا ہوں سیفی
میں نے اپنے بچپن سے جو نام سنبھال رکھے تھے

اس انداز اور اسلوب کے حامل اشعار ''الست'' میں وافر ہیں۔ ایسے اشعار جو منیر سیفی کی شاعرانہ حسیت اور اس کے عصری شعور کے حامل ہیں۔ اس مجموعہ کے ناشر کاغذی پیرہن لاہور ہیں اور قیمت ۱۵۰ روپے۔

☆☆☆☆☆☆

پیر جو گوٹھ (ضلع خیر پور میرس سندھ) میں خاندان راشدیہ کے مورث اعلیٰ پیر سائیں روزے دھنی کے احوال و آثار کے بارے میں ۱۲۰ صفحات پر مشتمل کتاب ''آفتاب ولایت'' سید زین العابدین شاہ راشدی کی تحریر کردہ ہے، عقیدت کے اسلوب میں لکھی گئی یہ کتاب ان حضرات کے لیے یقیناً مفید ثابت ہو سکتی ہے جنہیں صوفیائے کرام کے احوال کے بارے میں جستجو ہو۔

ناشر ادارہ پیغام رضا پاکستان PB-13111 کراچی اور قیمت ۵۰ روپے۔

اطراف رشید احمد صدیقی

ڈاکٹر انور سدید

''اطراف رشید احمد صدیقی'' پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی تالیف ہے جن کی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل انگریزی ادب کے گہوارے میں ہوئی۔ پھر وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں انگریزی زبان وادب کی تعلیم وتدریس پر بھی مامور ہوئے اور عنفوان شباب میں شیکسپیئر اور ولیم بلیک سے رغبت اور محبت کا خصوصی ربط وتعلق قائم کرنے کے علاوہ انھوں نے اردو زبان کے شعرا غالب اور اقبال سے بھی عشق کیا اور ان پر متعدد مقالات لکھے جو اب ان کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انگریزی زبان وادب سے ان کی محبت کا زاویہ آکسفورڈ یونیورسٹی نے اور ''اردو'' سے عشق کا انداز علی گڑھ یونیورسٹی نے پیدا کیا۔ فکر وخیال کے تعرج کے لیے انھوں نے ۱۹۷۹ء میں رسالہ ''نقد ونظر'' (ششماہی) علی گڑھ سے ہی جاری کیا تھا جسے اردو کا ایک ایسا معیاری جریدہ تسلیم کیا گیا جو لکھنے والوں کو مصنفین سے اختلاف کا حق بھی دیتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلوب احمد انصاری اختلاف کے اپنے حقوق محفوظ رکھتے ہوئے دوسرے تمام ادیبوں کو اپنی تحریروں سے اختلاف کی اجازت دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی میں ایک مذاکرے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ان پر بے حد کڑوے اور کھردرے اعتراضات کیے لیکن اسلوب احمد انصاری نے انہیں صبر وتحمل سے سنا اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے صدارتی خطبے کے بعد ان کے اعتراضات کا جواب دینا آداب محفل کے خلاف شمار کیا۔ اختلافات پر تحمل۔ برداشت کا یہ زاویہ مجھے پاکستانی ادیبوں میں نظر نہیں آتا۔ بلکہ اب ادبی اختلاف کا انعام ''دشنام غلیظ'' بھی بن چکا ہے۔ چائے کی میز پر اسلوب احمد انصاری سے بات چیت ہوئی تو وہ خنک مزاجی سے بولے: ''فرمان صاحب نے اپنا حق آزادی سے استعمال کیا ہے''۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس محفل میں انھوں نے چائے فرمان صاحب کے ساتھ پی تھی۔

اسلوب احمد انصاری کی زیر نظر کتاب رشید احمد صدیقی کے بارے میں ہے جو شرقی صوبہ جات متحدہ کے تاریخی شہر جون پور میں پیدا ہوئے لیکن علی گڑھ کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ وہ اسے ہندی مسلمانوں کا قرطبہ وغرناطہ قرار دیتے تھے۔ انصاری صاحب نے لکھا ہے کہ ''علی گڑھ سے ان کی شیفتگی کو دیکھ کر اس محبت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو ڈاکٹر جانسن کو لندن سے تھی۔ جس سے دوری اسے ماہی بے آب بنانے کے لیے کافی تھی''۔ رشید احمد صدیقی نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ علی گڑھ میں گزارا اور اس کی تہذیبی، تمدنی، علمی اور ادبی روایات کو تعلیم وتدریس کے علاوہ اردو ادب کے وسیلے سے بھی فروغ دیا کہ ''علی گڑھ مسلمانوں کے لیے ایک کائنات اصغر کا درجہ رکھتا تھا اور ایک معنی میں سقوط سلطنت مغلیہ کے بعد مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز اس سرزمین سے ہوا''۔ (صفحہ ۱۴)

زیر نظر کتاب میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے علی گڑھ کے اس عظیم فرزند کو ان کے ادبی زاویوں سے خراج تحسین

ادا کرنے کی کاوش کی ہے اور شخصی خاکے ''ہمارے رشید صاحب'' میں ان لمحات خیال انگیز ونشاط افزا کی تجدید کی ہے جو علی گڑھ کے علمی وادبی ماحول میں رشید احمد صدیقی کی معیت میں گزرے اور انصاری صاحب کی روح ودل پر اپنا دائمی نقش مرتب کر گئے۔ رشید احمد صدیقی کی دیگر ادبی اطراف میں سے انھوں نے رشید صاحب کا ''طنز ومزاح کا فن''۔ ''قلمی مرقعے''۔ ''تخلیقی نثر''۔ ''افسانوی کردار''۔ ''تنقیدی تحریریں'' اور ''خطوط نگاری'' پر تنقید وتبصرہ کیا ہے۔ اور ان کی انفرادیت کے وہ گوشے آشکار کیے ہیں جو رشید احمد صدیقی کو ان اطراف ادب میں مقام امتیاز عطا کرتے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری بالعموم پہلے اپنے موضوع کے نظریاتی زاویے متعین کرتے ہیں اور پھر ان نظریات کی اساس پر تنقید کو عمل میں لاتے ہیں۔ یہ وہی طریق ہے جسے ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج''، ''اردو ادب میں طنز ومزاح''، ''تصورات عشق وخرد، اقبال کی نظر میں'' اور ''تخلیقی عمل'' میں استعمال کیا ہے۔ پاکستان میں اس طریق کو مشتاق قمر، جمیل آذر، سجاد نقوی، ناصر عباس نیر اور رفیق سندیلوی نے بھی استعمال کیا ہے۔ اسلوب احمد انصاری نے ''مزاح'' اور ''ہجو'' کو تجربے کے دو بنیادی رویے قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک ''مزاح'' مفاہمت کا اور ''ہجو'' عدم مفاہمت کا رویہ ہے۔ ''طنز'' ایک فنی تدبیر یا وسیلہ ہے جس کا استعمال مزاح نگار بھی کر سکتا ہے اور ہجو نگار بھی۔ انھوں نے وضاحت مزید کے طور پر لکھا ہے:

> ''طنز کی موجودگی، مزاح کو نوکیلا اور پہلو دار بنانے میں ممد ومعاون ہوتی ہے اور ہجو کے بے محابا واروں میں مزید کاٹ اور برش پیدا کر دیتی ہے۔ مزاح نگار بالطبع ہنس مکھ ہوتا ہے اور ہجو نگار سرکہ جبیں یعنی خشم گیں اور تند وتلخ لہجے کا مالک ..... مزاح نگار کے ہاں جو قدریں ہیں وہ خوش حال اور سلامت روی کی ہیں اور ہجو نگار کی نظریں بلند اخلاقی اقدار پر مرکوز رہتی ہیں جنھیں وہ بالواسطہ طور پر ایک معیار اور پیمانے کے بطور استعمال کرتا ہے''۔ (اطراف رشید احمد صدیقی، صفحہ ۴۲)

اس تناظر میں اسلوب احمد انصاری نے رشید احمد صدیقی کی فنی خصوصیت کا جائزہ لیا تو یہ نتیجہ نکالا کہ ان کا دائرہ کار بہت وسیع ہے ..... ان کے مشاہدات متنوع ہیں اور حس مزاح اور اس کے پیدا کردہ آثار ونقوش کو احساس تناسب کے ساتھ ابھارنے کے لیے جس حزم واحتیاط اور دیدہ وری کی ضرورت ہوتی ہے وہ رشید صاحب کے ہاں دوسروں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے''۔ انھوں نے رشید صاحب کے مزاح کا یہ افادی زاویہ بھی ابھارا کہ:

> ''رشید صاحب صرف تفنن طبع ہی کے قائل نہیں ہیں، یعنی صرف قہقہہ لگانے اور استہزا پر تکیہ نہیں کرتے بلکہ استہزا کے پس پشت جو تلخ حقیقت ہے اسے بھی نمایاں کیے بغیر نہیں رہتے''۔

لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ حقیقت کی تلخی کا ادراک کرنے کے لیے قاری کا صاحب ذوق ہونا اور گردوپیش کے حالات سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ اس کی مثال مضمون ''شیطان'' کے اس اقتباس سے دی جا سکتی ہے:

> ''شاعر کی ملاقات شیطان سے ہوئی، دونوں نے ایک دوسرے کو اس طور پر دیکھا، گویا ایک دوسرے سے بخوبی واقف تھے۔ شیطان نے کہا ''خوب آئے، اور سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ فلسفی اور مولوی کو اپنے ساتھ نہ رکھا، ورنہ جہنم کی ساری شعریت ختم ہو جاتی۔ تم لوگوں کا وفد دنیا کی ایک گتھی سلجھانے آیا ہے۔ یعنی عقل اور عشق کی پاسبانی یا کارفرمائی؟''

مضمون ''گھاگھ'' سے ایک اقتباس:

''سیاسی گھاگھ کرسی صدارت پر سب سے زیادہ ہار پن کر بیٹھتا ہے اور تحریر وتقریر میں صرف پریس اور حکومت کے نمائندوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔لیکن اگر گولیاں چلنے والی ہوں یا طوق ورسن کی باری آئے تو پھر وہ اپنے ڈرائنگ روم یا قافلۂ کوہ کو اتنا ہی محفوظ سمجھتا ہے جتنا کہ لائڈ جارج برطانوی اقتدار کو آئی،سی،ایس کے آہنی پنجوں میں سمجھتے ہیں''۔

رشید احمد صدیقی کا ہر مضمون پر لطف اور بہجت ومسرت افروز ہوتا ہے لیکن اسلوب احمد انصاری صاحب نے ''اوپر کا کھیت''۔''پاسبان''۔''گھاگھ''اور''مثلث''کو ایسے مضامین قرار دیا ہے جو ہر دور اور ہر معاشرے کے فریم ورک میں اب بھی ٹھیک بیٹھتے ہیں۔مزید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رشید صاحب نے بعض نامور شخصیات کی بوالعجبیوں کو جس محبت سے اجاگر کیا ہے ان سے زیر مضمون شخصیات کا خارجی تناظر بہجت آفریں ہو گیا ہے اور نفی نے اثبات کا محبت آمیز زاویہ بھی ابھار دیا ہے۔اسلوب احمد انصاری نے اس کی مثال مولانا اقبال سہیل کے خاکے سے تلاش کی ہے۔رشید صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا سہیل سے میری ملاقات ۱۹۱۵ء میں ہوئی،اس زمانے میں مولانا شاعری کرتے تھے،یونین کے الیکشن لڑاتے تھے اور مجنوں کھاتے تھے۔اب سنتے ہیں کہ صرف مقدمے لڑاتے ہیں اور بچے پیدا کرتے ہیں۔جس کی ابتدا ایسی ہو،اس کا انجام یہ کیوں نہ ہو''۔

اسلوب احمد انصاری نے خیال ظاہر کیا ہے کہ''رشید صاحب کے فن کی توسیع اگر ملتی ہے تو صرف مشتاق یوسفی کے ہاں۔طنز ومزاح کے فن میں یہی دو نام معتبر بھی ہیں اور محترم بھی۔۔۔''میرا خیال ہے کہ رشید صاحب سے پاکستان میں فیضیاب ہونے والوں میں مشفق خواجہ اور ابن انشا کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔اور توسیع مزید میں اب ڈاکٹر یونس بٹ اور اشفاق احمد ورک بھی سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔اسلوب احمد انصاری کا قول فیصل یہ ہے کہ:

''رشید صاحب نے اردو طنز ومزاح کے فن میں ایک نئے بُعد کا اضافہ کیا ہے اور اپنے ذہن کی براقی، احساس کی ندرت ونفاست اور زبان کے کینڈے پر اپنی بے پناہ قدرت کے طفیل لطف وانبساط کا ایک دفتر کھول دیا ہے''۔

رشید احمد صدیقی کے فن کی ساختہ آرا میں یہ ایک بے حد قیمتی اضافہ ہے کیوں کہ یہ ایک ایسے مصنف کی رائے ہے جو انگریزی مزاح کے اسرار ورموز اور باریکیوں اور رعنائیوں سے پوری طرح واقف ہے اور پاکستان اور بھارت میں لکھے جانے والے استہزائی پھکو پن سے بھی نا آشنا نہیں۔

رشید احمد صدیقی کی طنز ومزاح نگاری پر اسلوب احمد انصاری کے مقالے کا ذکر میں نے زیادہ تفصیل سے کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ طنز ومزاح اور انشا پردازی ان کے فن کے دو بنیادی پہلو ہیں۔انصاری صاحب نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ:

''اول اول انھوں نے اپنا اعتبار تو رکھے اور اچھوتے قسم کے انشائیے لکھ کر قائم کیا جس نے پڑھنے والوں کو یک لخت چونکا دیا اور انھیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ان انشائیوں میں تسلسل کے بجائے عدم تسلسل تخلیقی عمل کا جزو لاینفک تھا''۔

طنز ومزاح نگاری کو رشید احمد صدیقی کے فن کی ''کائنات اکبر''قرار دیا جائے تو ان کی دیگر تمام فنی اطراف اس کائنات ہی کے روشن کرے ہیں۔اسلوب احمد انصاری نے ان کروں کی سیاحت ہمدردانہ جذبات سے کی ہے۔مثلاً قلمی مرقع نگاری کے

باب میں انھوں نے رشید احمد صدیقی کے تین تنقیدی عناصر کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

اول: شخصیت کے مانوس پہلوؤں کو ٹھوس جزئیات کی مدد سے اور حرکی اور روشن انداز میں پیش کرنا۔

دوم: تحریر اور انداز بیان میں بیک وقت صلابت، دیدہ زیبی اور مرصع کاری

سوم: ان اقدار اور آورشوں کی پاسداری اور ان کا انعکاس جنھیں وہ زندگی میں بنیادی اہمیت دیتے ہیں اور شخصیت کی تعمیر اور پرکھ کے سلسلے میں لابدی سمجھتے ہیں''۔

اہم بات یہ ہے کہ ان کی اپنی زندگی کا معاشرتی اور تہذیبی اسلوب بھی ان اساسات پر ہی قائم تھا، چنانچہ یہ کہنا بھی مناسب ہوگا کہ رشید احمد صدیقی نے اہم اور غیر اہم ایسی شخصیات کی مرقع نگاری کی جو ان کی اپنی صادق اقدار پر پورے اترتے تھے، ملک کی ممتاز شخصیات میں سے ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری، مولانا سلیمان اشرف، میر محفوظ علی بدایونی، حسرت موہانی، سجاد حیدر یلدرم، اصغر گونڈوی اور ایک غیر معروف شخصیت حسن عبداللہ کی مرقع نگاری کی۔ حسین انصاری صاحب نے اس طرح کی ہے کہ رشید صاحب کی کتابیں ''گنج ہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' لائبریری سے نکلوا کر بار بار پڑھنے کو جی کرتا ہے اور مطالعے کے دوران یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ آپ ان شخصیات کی خلوت میں داخل ہو گئے ہیں اور ان سے مجلس آرائی بھی کر رہے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری کا اس باب میں تنقید کا حاصل یہ ہے کہ:

> ''رشید صاحب کے ہاں تاثرات کی بازآفرینی اور بنیادی اقدار حیات کے نمایاں کرنے کے مابین ایک نوع کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں یہ مرقعے بلاشبہ خاصے کی چیز ہیں اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ ان کی آب و تاب کو ماہ و سال کی گردش عرصے تک ماند نہ کر سکے گی''۔ (صفحہ ۸۵)

''تخلیقی نثر'' کے باب میں اسلوب احمد انصاری نے اپنی بحث کی اساس رشید صاحب کی مزاح نگاری اور مرقع نگاری کی کتابوں سے زیادہ استوار کی ہے۔ تاہم ان کے اس نظریے کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا کہ:

> ''شاعری کے مثل تخلیقی نثر بھی (اور دونوں کے درمیان ایک زیریں علاقہ ہے) اولیں مرحلے میں غیر تصوری ماقبل منطق اور موضوعی ہوتی ہے اور فن کار کے جذباتی نفس کی گہرائیوں سے برآمد ہوتی ہے۔ یہ تنقیدی نثر سے مختلف مزاج اور پہچان رکھتی ہے''۔

تخلیقی نثر کے اس میزان نقد پر انصاری صاحب نے مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی نعمانی کو کامیاب قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''دونوں کی نثر پر بڑی حد تک فارسی انداز بیان کا استیلاء ہے۔ ان کا دور کا رشتہ داستانوں کی نثر سے بھی ہے۔ دونوں کے ہاں شعوری کاوش اور اہتمام و انصرام کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے''۔

لیکن انھوں نے رشید احمد صدیقی کے ایسے نثر پاروں سے جو ان کی نظر میں کمزور ہیں (مثلاً ''خنداں'' کے مضامین) صرف نظر کرتے ہوئے ان کی نثر کو ایسی تخلیقی نثر قرار دیا ہے جو موضوعی مزاج اور رنگ رکھتی ہے اور شاعری سے قریب تر ہے اور ان کی تخلیقی نثر میں روح کے اضطراب اور تناؤ کا مشاہدہ ایک موج تہہ نشین کی طرح کیا جا سکتا ہے۔

رشید احمد صدیقی روایتی معنوں میں ناول نگار یا افسانہ نویس نہیں تھے لیکن ان کا زندگی کا مشاہدہ وسیع اور عمیق تھا۔ انھیں معاشرے میں صدہا ایسے کرداروں کو دیکھنے، پرکھنے اور ان کی ناہمواریوں پر نظر ڈالنے کا موقعہ ملا کہ کردار نگاری ان کے فن کی ایک

خصوصی جہت قرار دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اسلوب احمد انصاری نے ''اطراف رشید احمد صدیقی'' میں ان کی اس خصوصیت کے تذکرے کے لیے ایک باب ''رشید احمد کے افسانوی کردار'' بھی پیش کیا ہے۔ یہ زندگی کے گھمسان میں ٹھوکریں کھائے ہوئے ایسے کردار ہیں جو اپنی شناخت سے تو محروم نہیں لیکن معاشرے میں وہ نام کی بجائے اجتماعی صورت سے پہچانے جاتے ہیں، اور رشید صاحب چونکہ ان سے گہری یگانگت رکھتے ہیں، اس لیے ان کا تذکرہ بھی انھوں نے اپنے مخصوص فرحت افزا انداز میں کیا ہے۔ اسلوب احمد انصاری نے ان کرداروں کو، جو بالعموم ٹائپ کرداروں کا درجہ رکھتے ہیں، انفرادی زاویوں سے متعارف کرایا ہے۔ مثلاً ایک کردار ''گواہ'' سے ملیے:

> ''گواہ قریب قیامت کی دلیل ہے۔ عدالت سے قیامت تک جس سے مفر نہیں۔ وہ گواہ ہے اور کیوں نہ ہو۔ عدالت ایک مختصر نمونہ قیامت ہے اور قیامت ایک وسیع پیمانے پر نمونہ عدالت۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ عدالت کے گواہ انسان ہوتے ہیں اور قیامت کے گواہ انسانی کمزوریاں یا فرشتے''۔

کردار ''حاجی صاحب'' کی ہیئت یوں ہے:

> ''حاجی صاحب شعر کہتے ہیں اور بسکٹ بیچتے ہیں، شعر اور بسکٹ دونوں خستہ، البتہ یہ بات اب تک معلوم نہیں ہو سکی کہ شعر خستہ کہتے ہیں یا بسکٹ خستہ بناتے ہیں۔ مسعود علی صاحب ندوی المتخلص بہ دارالمصنفین کا بیان ہے کہ حاجی صاحب جس خلوص کے ساتھ شعر کہتے ہیں، اس سے زیادہ مبتلے بسکٹ بیچتے ہیں''۔

رشید احمد صدیقی کے فن کی اس جہت کو اسلوب احمد انصاری نے بالواسطہ طور پر سماجی اداروں کی تنقید قرار دیا ہے۔ ''مقصد ان چور دروازوں کو روشنی میں لانا ہے جن کے ذریعے افراد اس سماجی نظام میں اپنے وجود کو قائم اور باقی رکھنے کے لیے جد وجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی پیشکش کا مقصد ان کے محرکات عمل کو نمایاں کرنا بھی ہے''۔

رشید احمد صدیقی کی تنقیدی تحریروں کے دائرے کو اسلوب احمد انصاری نے کچھ بہت وسیع قرار نہیں دیا۔ ان کی رائے میں رشید صاحب کی بنیادی حیثیت انشا پرداز اور مزاح نگار کی ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ باقاعدہ نقاد نہ ہونے کے باوجود ان کی تنقیدی رائے کو ہمیشہ وقعت کی نظر سے دیکھا گیا اور ان کے متعدد تاثراتی جملے تو ضرب المثل کی صورت بھی اختیار کر گئے۔ چند جملے یہ ہیں:

- ''تنقید نہ یزداں کا فن ہے نہ اہرمن کا۔ وہ انسان کا فن ہے اور انسان کے ادبی کارناموں کو پرکھنے میں دیانت، دانشمندی اور احترام سے کام لینا چاہیے، نہ کہ نام ونفیر سے''۔
- شاعر کا سفلی نفس تو روزمرہ زندگی کے معمولات میں منعکس ہوتا ہے لیکن اس کے مظہر اور اعلیٰ وارفع نفس کا پرتو ہمیں اس کی شاعری میں ملتا ہے''۔
- ''شاعر وہ ہے جو حقیقت کو برافگندۂ نقاب کرنے میں بیک وقت صداقت، جرأت اور صناعت کو بروئے کار لا سکتا ہو''۔
- ''میں شاعری میں تجربات کا قائل ہوں لیکن تجربات میں شاعری کا نہیں''۔
- ''غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں''۔

اسلوب احمد انصاری نے اس قسم کے بیانات کو تنقیدی نقطۂ نظر سے بے معنی قرار دیا ہے اور آخری جملے کو عبدالرحمٰن بجنوری کے اس جملے ''ہندوستان میں الہامی کتابیں دو ہیں۔۔ وید مقدس اور دیوان غالب'' اور کلیم الدین احمد کے اس جملے۔۔

''غزل نیم وحشی صنف سخن ہے'' (انصاری صاحب نے اسے امریکی نقاد جارج سنتیانا کا سرقہ قرار دیا ہے) کی نوعیت کا شمار کیا ہے۔لیکن کیا یہ بات دلچسپ نہیں کہ اس قسم کے جملوں نے قاری کی توجہ زیادہ کھینچی اور خشک، یبوست زدہ تنقید کے برعکس اس نوع کے تخلیقی اظہار کی زیادہ پذیرائی ہوئی۔میں کہہ سکتا ہوں کہ جس رغبت سے رشید احمد صدیقی کی تنقید پڑھی گئی ہے وہ رغبت ترقی پسند نقادوں ممتاز حسین، ریاض صدیقی اور شاید احتشام حسین کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔مزید برآں انشاء پردازی میں جب اسپ خیال تگ وتاز کرتا ہے تو تلفن طبع کو برطرف کرنا ممکن نہیں رہتا۔اس کی ایک دلچسپ مثال اسلوب احمد انصاری نے بھی اقتباس کی ہے جو حسب ذیل ہے:

> ''اکبر کے نقادوں کی دو اقسام ہیں۔ایک مولانا عبدالماجد دریابادی اور دوسری آل احمد سرور، یہ اتنے اشخاص نہیں جتنے اقسام ہیں۔دونوں اپنے اپنے وجود کا جواز اکبر (الہ آبادی) میں ڈھونڈتے ہیں''۔

اسلوب احمد انصاری نے رشید احمد صدیقی کے دو جہتوں سے ان کے شعروادب کے تصور کا استخراج کیا تو اسے سطحی قرار دیا۔یہ دو جملے حسب ذیل ہیں:

> ''غالب کی ارضیت میں ماورائیت اور ماورائیت میں ارضیت ملتی ہے۔جس سے ان کے کلام میں دل آویزی اور رفعت پیدا ہوتی ہے''۔
>
> ''بیدل نے شاعری کے سب سے موٹے اصول کو نظرانداز کر دیا کہ شاعری حقیقت کی آسان اور دلکش ترجمانی ہے، نہ یہ کہ آسان اور دلکش کو بھی دردِسر بنا کر پیش کیا جائے''۔

غالب کی شاعری کا بہت سا حصہ ان کے زمانے میں عام لوگوں کے لیے ہی نہیں، خاص لوگوں کے لیے بھی دردِسر ہی رہا ہے لیکن جب وہ آسان گوئی کی طرف آئے تو انھوں نے خیاباں خیاباں ارم کر دیے اور غالب کی اس شاعری کو رشید احمد صدیقی کے ارشادات مثلاً:

> ''غزل کی تقدیر غالب ہی نے متعین کی اور اس کو ایسی فضا دی جہاں اردو کے تمام ممکنات شعری وشاعری کو برگ وبار لانے کا سامان اور سہولتیں فراہم ہیں''۔

کی روشنی میں پڑھیں تو غالب کو شاعروں کا شاعر تسلیم کرنا پڑتا ہے اور اسلوب احمد انصاری کی اس رائے کو قبول کرنے میں تامل ہے کہ:

> ''رشید احمد صدیقی انشاپردازی کی خاطر تنقید نگاری کو قربان کر دیتے ہیں اور یہ خیال نہیں رکھتے کہ ان دونوں کے درمیان بعدالمشرقین ہے۔تنقید کے نام پر ان کی جو تحریریں جمع کی گئی ہیں، وہ تنقید ادب کے ضمن میں کسی طرح نہیں آتیں۔یہ انشاءپردازی ہے یا رائے زنی یا فقرہ طرازی۔تنقید سے ان کا تعلق بہت ہی اچٹتا سا ہو جاتا ہے''۔(ص ۱۴۰)

خطوط نگاری کسی ادیب کی ذاتی زندگی کا نجی زاویہ ہے، ان میں نہ ادبی اہتمام ہوتا ہے نہ کمال انشاپردازی اور نہ علمیت کا بے جا اظہار۔اس سب کے باوجود بڑے لوگوں اور ادیبوں کے خطوط ان کے باطن میں جھانکنے اور متعدد نفسیاتی گرہیں کھولنے کے علاوہ گردوپیش کی اشیا، مظاہر اور شخصیات پر ان کی رائے معلوم کرنے کا وسیلہ بھی ثابت ہوئے ہیں اور انھیں صداقت کا آئینہ دار بھی شمار کیا جاتا ہے کیوں کہ ذاتی خطوط اشاعت کی غرض سے لکھے ہی نہیں جاتے۔اسلوب احمد انصاری نے اطراف رشید احمد

صدیقی میں ایک باب ان کی خطوط نگاری پر بھی پیش کیا ہے اور لکھا ہے:

''ان خطوط کے پڑھنے سے ان (رشید احمد صدیقی) کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر ہلکی اور تیز روشنی ضرور پڑتی ہے۔ رشید صاحب ایک باغ و بہار شخصیت تھے ..... ان کے تاثرات اور رویوں میں ایک نارمل انسان کا انداز تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ بڑے ذکی الحس بھی تھے، ان میں بعض غیر معمولی خوبیاں، بعض غیر معمولی خامیوں کے ساتھ وابستہ اور مجتمع ہو گئی تھیں، وہ کبھی اپنے کارناموں کا ذکر اپنی زبان سے نہیں کرتے تھے ..... علی گڑھ یونیورسٹی اردو اور مسلمانوں سے انھیں گہرا لگاؤ اور تعلق خاطر تھا۔ اسلام کی طرف بھی ان کی رغبت بلکہ شیفتگی کچھ کم نہ تھی۔ ان میں ایک طرح کی سیر چشمی اور بلند نگہی تھی جو شرفا کا ہمیشہ شیوہ رہی ہے .....''

صدیقی صاحب کے خوگر حمد نے اس کے بعد یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ:

''ان کے خطوط میں ان تمام مثبت خوبیوں کے انعکاس کے علاوہ اور ان کے پہلو بہ پہلو ایک واضح میلان دنیا داری اور موقع پرستی کی طرف ضرور تھا۔ انداز بیان پر انھیں جو خداداد قدرت اور ابلاغ و ترسیل کے وسائل پر ان کی گرفت جیسی مضبوط تھی، وہ ہر مشکل کو ان کے لیے سہل بنا دیتی تھی''۔

اسلوب احمد انصاری صدیقی صاحب کے قریب ترین ناظر تھے، اپنے مشاہدات کی روشنی میں انھوں نے صدیقی صاحب کا ایک حقیقت افروز خاکہ بھی لکھا ہے اور ان کے خطوط سے ان کی شخصیت کے متعدد زاویے دریافت کر کے قاری کو یہ احساس دلا دیا ہے کہ رشید صاحب فرشتہ نہیں، انسان تھے۔ ان میں خوبیاں تھیں تو چند خامیاں بھی موجود تھیں لیکن ان کی مجموعی شخصیت دلآویزیوں کا مرقع ہے جس کے اثرات ان کے متعدد شاگردوں اور دوا فتادہ دوستوں نے ان کے خطوط سے قبول کیے۔ اسلوب احمد انصاری نے ان کے خطوط سے متعدد اقتباسات پیش کیے ہیں جن سے ان کے ادبی رجحان، مزاج کی شگفتگی، بذلہ سنجی اور انسان دوستی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چند اقتباسات حسب ذیل ہیں۔ آل احمد سرور کو لکھتے ہیں:

''جلیل صاحب آئے تو میں ذرا دیر سے گھر سے باہر آیا۔ میں پھٹی ہوئی اور سلیپنگ سوٹ کا پاجامہ اس سے بھی خستہ۔۔۔ دیکھ کر فرمایا ''آپ نے بڑا تکلف کیا، معلوم ہوتا ہے کہ آپ گھر میں ننگے ہی رہتے ہیں''

''..... میں عورتوں اور مولانا ماجد کے خطوط کا بڑی پابندی سے جواب دیتا ہوں، عورتوں سے دنیا سنورتی ہے اور مولانا ماجد سے عاقبت''۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب ''نظم جدید کی کروٹیں'' ملی تو انھیں لکھا:

''راشد نے اپنی نظموں یا میراجی نے دھرتی پوجا کے ضمن میں جو کچھ کہا ہے اور جس طرح کہا ہے، وہ نہ ان کے اچھا شاعر ہونے کی دلیل ہے نہ بڑے شاعر ہونے کی۔ یہ اپنے تند و تاریک ہیجان کو جس بے باکی یا ڈھکے چھپے انداز و الفاظ میں ادا کرتے ہیں، وہ اپنی جگہ مسلم۔ لیکن ان کو یہ نہیں آتا کہ کون سی بات کس طرح اور کس قدر کہی جائے یا بالکل نہ کہی جائے، یہ اپنے نفس کے تقاضے کو دیکھتے ہیں۔ شاعری کے آداب کو خاطر میں نہیں لاتے''۔

نظیر صدیقی کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

''ترقی پسندوں کے بارے میں آپ نے کہیں کہیں بڑے مزے کی باتیں کہی ہیں۔گرم ممالک میں لڑکے لڑکیاں بالغ بہت جلد ہو جاتی ہیں، عاقل بہت دیر میں۔ہندوستان کے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کا یہی حال ہے''۔

اس مضمون میں اسلوب احمد انصاری نے رشید صاحب کے ان کے اپنے نام لکھے ہوئے خطوط کے چند اقتباس بھی پیش کیے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تعریف کرنے میں کتنے کشادہ دل اور کشادہ نظر تھے۔شاید تعریف کر کے وہ مکتوب الیہ کو امتحان میں ڈال دیتے تھے کہ وہ اپنے عمل کی راہ سیدھی کر لے۔کاش! انصاری صاحب وہ تراشے بھی پیش کر دیتے جن میں ان پر تنقید کی گئی ہوگی۔

اسلوب احمد انصاری کے نام:

''آپ تنقید وتبصرے میں قرآن پاک کی اس آیت پر عمل کرتے ہیں: ''تولنے میں ڈنڈی کو سیدھے رکھو'' ۔۔۔چونکا دینے والے جتنے فقرے فراق کہتے یا لکھتے ہیں، اکثر محسوس ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کی کہی ہوئی بات ہوگی۔اس کی تصدیق مجھے گھر کے بھیدی سے ہوگئی''۔

ایک اور اقتباس:

''(رسالہ) 'آج کل' میں آپ پر آپ کا مضمون دیکھا اور خوش ہوا۔بالکل آپ (اسلوب احمد انصاری) ہی کی طرح صاف ستھرا اور دلنشین۔میں نے علی گڑھ میں آپ کا بچپن دیکھا ہے اور آپ کے جسم وجان کے ساتھ آپ کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما بھی نظروں میں رہی، اس لیے مضمون پڑھنے کے دوران یہ بات ذہن میں رہی کہ ان کے بیان کرنے میں آپ کیا انداز اختیار کرتے ہیں۔آپ نے اپنے بارے میں اس سے کم کہا ہے جتنا کہ آپ مستحق ہیں.....بزرگوں کا ذکر آپ نے بڑی سعادت مندی اور ارادت سے کیا ہے۔یہ ایسی بات ہے جو زندگی میں کسی کو بے راہ نہیں ہونے دیتی۔اس کو ماضی کا احترام اور ماضی کا انعام کہتے ہیں''۔

اس کتاب کا آغاز ''ہمارے رشید صاحب'' کے عنوان سے اسلوب احمد انصاری کے خاکے سے ہوتا ہے۔رشید صاحب اور انصاری صاحب کے درمیان عمروں کا فاصلہ بھی تھا اور یہ امتیاز بھی کہ رشید صاحب اردو زبان وادب کے شیدائی تھے اور اسلوب احمد انصاری کی تربیت انگریزی زبان وادب کے گہوارے میں ہوئی تھی لیکن دونوں میں قدر مشترک وہ علمی، ادبی اور تہذیبی فضا تھی جو علی گڑھ سے موسوم ہوتی رہی ہے اور اب ایک یادگار پارینہ بن گئی ہے۔انصاری صاحب نے اس خاکے میں رشید صاحب اور علی گڑھ دونوں کو اپنی یادوں سے بازیافت کیا ہے۔اس کی تابندہ روایات کا تذکرہ میر سے جیسے محروم اور نادار لوگوں کی حسرت میں اضافہ کر دیتا ہے جو علی گڑھ نہ جا سکے اور لڑکپن کے دور میں ہی تعلیم ادھوری چھوڑ کر فکر معاش میں غرق ہو گئے۔انصاری صاحب نے اس کتاب میں علی گڑھ کے خارج اور رشید احمد صدیقی کے ادب کی تمام اطراف میں سیاحت کی ہے اور متعدد جہتوں کو منکشف کیا ہے۔اہم بات یہ کہ اس کتاب میں اثبات کے ساتھ انکار کے اور تحسین کے ساتھ تنقید کے زاویے بھی ابھرے ہیں۔مجموعی طور پر اسے نہ صرف ایک ایسی کتاب تسلیم کرنا ضروری ہے جو رشید احمد صدیقی سے پورا تعارف کرا دیتی ہے بلکہ رشید احمد صدیقی سے سابقہ محبت میں ہزار گنا اضافے کا باعث بھی بن جاتی ہے۔پیش لفظ میں جمیل الدین عالی نے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی تنقید میں بے تعصبی اور وقت نظری کو سراہا ہے۔انھوں نے اسے موجودہ اور آئندہ نقادوں کے لیے ایک نمونہ، ایک راہنما مثال قرار دیا

ہے۔ بلاشبہ انجمن ترقی اردو کراچی نے یہ کتاب چھاپ کر رشید احمد صدیقی کی ادبی شخصیت اور اسلوب احمد انصاری کی تنقید کو پاکستانی معاشرے کے ادیبوں کے سامنے بطور مثال پیش کر دیا ہے۔

برسبیل سخن۔ ایک مطالعہ

ریاض احمد

یادش بخیر پروفیسر جعفر بلوچ کئی حیثیتوں سے ایک ممتاز مقام پر سرفراز ہیں۔ ان کی اول حیثیت تو اردو ادب کے استاد ہی کی ہے لیکن ہمارے ہاں استاد کے ادب و احترام کی روایت بعض دوسری اچھی روایتوں کی طرح دم توڑ چکی ہے۔ پروفیسر بلوچ اور میرے ایک مشترکہ کرم فرما سے ایک دفعہ ایک صاحب کی فروگزاشت کی معذرت میں نے یہ کہہ کر پیش کی کہ آخر اردو کے پروفیسر ہیں تو ان کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے، فرمانے لگے ''شکر کرو۔ پی ایچ ڈی نہیں ہیں''۔ لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ جعفر بلوچ اردو زبان و ادب کے طلبہ کی تربیت کا ذریعہ بھی ہیں۔ پی ایچ ڈی انھوں نے کئی شاگردوں کو کروا دیا ہوگا لیکن خود اس تہمت سے بہرحال بری ہیں۔ تاہم میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ پی ایچ ڈی کے لیے اگر بامعنی تحقیق کو اہمیت حاصل ہے تو جعفر بلوچ اس منزل کو بطریق احسن سر کر چکے ہیں۔ اگر آپ ثبوت مانگیں تو میں صرف ''علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں'' کا حوالہ دوں گا۔ ردی کے ڈھیروں اور سڑک کنارے اڑتے ہوئے کاغذ کے پرزوں کو موڑ کر انھوں نے وہ کولاژ (Collage) تیار کیا ہے کہ علامہ اور مولانا دو انسانوں کی طرح انسانی سطح پر برسرکار نظر آتے ہیں، گویا انھوں نے دونوں کو ''ماورائے انسان'' کوئی اجنبی مخلوق بننے سے بچا لیا ہے۔ بہرحال مجھے معلوم نہیں کہ میرے اس جملے کو آپ ثبت تو صیف قرار دیں گے یا اس سے بھی کوئی ''نفی'' نکالنے کی کوشش کریں گے۔

خیر سردست تو مجھے جعفر بلوچ کی صرف شاعرانہ حیثیت سے سروکار ہے۔ البتہ مشکل اس میں یہ ہے کہ مجھے اس بات میں اولیت کا شرف حاصل نہیں۔ مجھ سے پہلے کئی ایک صاحبان بصیرت ان کی اس حیثیت کا تعین فرما چکے ہیں۔ میرے لیے اس میں ایک پہلو آسانی کا بھی ہے کہ ان محاکمات سے رہبری حاصل کر سکتا ہوں اور ایک مشکل بھی کہ ان کی دکھائی ہوئی راہوں پر چلوں تو ''نقال'' ٹھہروں اور نیا راستہ نکالنے کی کوشش کروں تو بھٹکنے کا خدشہ بہرحال قائم ہے۔

جعفر بلوچ پر لکھنے والوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اپنے معاصر ادبی معیارات کے تناظر میں جعفر بلوچ ایک قادرالکلام شاعر ہیں۔ تاہم اس بات کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قادرالکلامی ایک وسیع اصطلاح ہے۔ حتیٰ کہ بحور کے تجربات کو بھی اس سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ میرے ذہن میں جعفر بلوچ کی قادرالکلامی کا مفہوم کچھ یوں مترتب ہوتا ہے کہ وہ عموماً

مروج بحور کے دلدادہ ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ حسبِ ضرورت مشکل زمینوں اور انوکھے قافیوں سے کام لینے پر بھی بہ سہولت قادر ہیں۔ "مر سبیل سخن" کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر نے ایک نسبتاً مختصر مجموعۂ نظم میں اتنی زیادہ بحروں میں طبع آزمائی کی ہے جتنی شاید جدید شعرا کے ضخیم کلیات میں بھی نہیں ملتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے نظم معریٰ اور نظم آزاد کا رواج ہوا ہے، صرف چند بحریں ہی استعمال میں رہ گئی ہیں۔ تاہم یہ ایک الگ نکتہ ہے کہ بعض اوقات ایک خاص بحر شاعر کے آہنگ و توازن کے احساس پر نامعلوم طور پر غلبہ پا لیتی ہے اور اس کے ہاں مختلف منظومات مضمون کی نیرنگی اور تخلیقی لمحوں کے تفاوت کے باوجود ایک خاص بحر میں ڈھلتی چلی جاتی ہیں۔ مثلاً اقبال کے ہاں "ضربِ کلیم" میں مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن والی بحر زیادہ استعمال ہوئی ہے۔ یہ میرا عمومی تاثر ہے۔ میں نے اس بحر میں نظموں کی تعداد دوسری بحروں کے مقابلے میں شمار نہیں کی۔ یوں بھی شماریات سے ادب میں فیصلے نہیں کیے جاتے۔

جعفر بلوچ کے اسلوب کے سلسلے میں اہم تر بات یہ ہے کہ آہنگ کو ان کے یہاں لفظوں کی معنوی یا نحوی تراش یا دروبست پر تقدم حاصل نہیں۔ لفظ باہم ایک دوسرے میں پیوست ہو کر وزن میں ڈھلتے ضرور ہیں لیکن ڈھول یا طبلے کی تھاپ کی طرح وزن کی اکائی لفظوں کو ٹکڑیوں میں نہیں ڈھالتی۔ جیسے مثلاً امیر خسرو سے منسوب اس مشہور شعر سے واضح ہوگا:

ز حالِ مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

اس شعر کے ہر مصرع میں مفاعلاتن چار بار آتا ہے۔ زحال مسکیں/ رفعاعلاتن، مکن تغافل/ مفاعلاتن وعلیٰ ھذا القیاس۔

جعفر بلوچ کے ہاں تال کی دھڑکن لے پر غلبہ حاصل نہیں کرتی۔ اس لیے توجہ لفظوں کے معنوی ربط اور نحوی ترتیب پر زیادہ مرکوز رہتی ہے اور یوں وزن کے تعین میں قدرے مشکل پیش آتی ہے جس نے اس تاثر کو جنم دیا ہے کہ انھوں نے مشکل یا اجنبی بحروں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ایک ہی نظم کے ان تین مصرعوں کی ساخت پر توجہ فرمایئے:

۱۔ نعت کا قصد ہے اگر اور خیال آبرو
۲۔ خیرِ کثیر عام ہے قریہ بہ قریہ، کو بہ کو
۳۔ نعت ہے، بحر بیکراں، قافیہ ہے مراسبو

پہلے اور تیسرے مصرع میں آہنگ لفظوں کے دروبست پر اس طرح حاوی نہیں جس طرح دوسرے مصرع میں۔ اس سے بھی زیادہ واضح مثال نظم "سیدی عمر فاروق رضی اللہ عنہ" ہے جس میں وزن ذرا مشکل سے ہاتھ آتا ہے، حالانکہ تقطیع میں الفاظ کو زیادہ توڑنا موڑنا نہیں پڑتا:

شکوہ دینِ نبی ﷺ، سیدی عمر فاروق

مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات۔ یاد رہے یہ وہی وزن ہے:

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ

لیکن علامہ اقبال کے ہاں جو گونج ہے وہ یہاں پیدا نہیں ہوئی۔ حالانکہ دونوں نظموں کے مصرعوں میں باہم تبدل وتبادل بہت آسان ہے:

ؔ شکوہ دین نبی ﷺ،سیدی عمر فاروق

ؔ خودی کا سرِ نہاں لاالہ الا اللہ

قوافی کے انتخاب اوران کے برمحل استعمال کے معاملے میں جعفر بلوچ نہایت خوش سلیقگی کا ثبوت دیتے ہیں۔وہ قافیہ پیمائی نہیں کرتے بلکہ صرف ان قوافی کو برتتے ہیں جن سے ان کے موضوع سخن کے متفرق پہلو اجاگر ہوتے ہوں اور قاری یا سامع کے لیے ابلاغ معانی کے افق روشن ہوتے ہوں۔اس ضمن میں وہ حضرت غالب کے موقف کے ہم نوا ہیں کہ ''شاعری معنی آفرینی ہے،قافیہ پیمائی نہیں ہے'' وہ ایسے قوافی سے اجتناب کرتے ہیں جو معنی آفرینی اور ابلاغ معانی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہوں اور اگر کسی مشکل قافیہ کو نظم کرنا ناگزیر ہو تو وہ اسے حسن بندش سے رواں اور سہل بنا دیتے ہیں اور اس کی ثقالت یا نامانوسیت کو دور کر دیتے ہیں۔مثلاً نظم ''چوریاں چکاریاں'' کی ردیف ہے ''چرا تا ہے'' اور اس نظم کے قوافی ہیں کیا کیا،اعلیٰ،ڈبہ،منصوبہ وغیرہ۔اسی نظم میں انھوں نے ''چربہ چراتا ہے'' بھی باندھا ہے لیکن کس سلیقے سے۔ملاحظہ ہو:

اتارے جا رہا ہے کوئی چربے شاہکاروں کے
کوئی مٹ پونجیا اترا ہوا چربہ چراتا ہے

بعض اوقات وہ اساتذۂ فن کے تتبع میں قافیہ آفرینی بھی کرتے ہیں،یعنی ایسا قافیہ لاتے ہیں جو بظاہر نظم کے زمرۂ قوافی میں نہیں آتا۔مثلاً نظم ''اے قلم'' کے قوافی ہیں۔قلم،رقم عجم وغیرہ۔اسی نظم میں وہ لفظ ''نظم'' کو یوں قافیہ بناتے ہیں:

داغدار اغلاط سے ہرگز نہ دامن ہو ترا
مطلقاً نظم و نسق کو لکھ نہ تو نسق و نظم

ادب و انشا میں تراکیب کی اہمیت سے کون آگاہ نہیں۔اس سے کفایت لفظی اور توسیع معانی کے امکان ابھرتے ہیں۔نظم و نثر میں نئی تراکیب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔تراکیب کی تازہ کاری شاعری میں جدت اور لطافت کے نئے باب کھولتی ہے اور زبان و ادب کو زیادہ ثروت مند بناتی ہے لیکن برجستہ اور وجدان افروز نئی تراکیب وضع کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔اس کے لیے جوہر ابداع،سلامت طبع اور جودت تخلیق کی ضرورت ہوتی ہے۔جعفر بلوچ مروج و متداول ادبی تراکیب سے بھی کام لیتے ہیں اور خود بھی دیدہ و دل کو منور کرنے والی نئی ادبی تراکیب تراشنے پر قادر ہیں۔ ''برسبیل سخن'' میں بھی یہ مشعلیں جابجا روشن ہیں۔مثلاً اشک غم زاد(ص ۴۳) کمال آزمائی (ص ۴۸) رسول امکاں (ص ۶۵) خاشاک مذاق (ص ۸۹) نگوں نگاہ(ص ۱۲۶) وغیرہ۔

اس سلسلے میں یہ شعر دیکھیں:

قنوط آلود و یاس آگیں فضاؤں میں بھی
رہا ہمیشہ رسولِ امکاں ظفر علی خاں

سورۂ شعرا کی آیۂ مبارکہ ''وَالشعرآءُ یَتَّبِعُھُمُ الغَاوٗن'' سے استفادہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنی نظم ''اے قلم'' میں ''غاوونیت آموز'' کی ترکیب وضع کی ہے۔

عصر نو غاوونیت آموز ہے اور کج نما
ڈر ہے تو بھی ہو نہ جائے ہرزہ گو، عریاں رقم

جناب جعفر بلوچ کے محاسن شعری میں بعض نکات اور بھی قابل ذکر ہیں لیکن یہ حکایت پھر کبھی سہی۔ اب ہم اپنی توجہ کتاب کے ترتیب وار مطالعہ کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ ''برسبیل سخن'' کو جعفر بلوچ نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ تجلیات: یہ حصہ حمد و نعت اور مناقب پر مشتمل ہے۔ ۲۔ حدیث چمن: اس حصے میں ملی اور قومی نظمیں ہیں۔ ۳۔ آئینہ خانہ: اس حصے میں معاشرتی موضوعات پر سنجیدہ اور ظرافت آمیز نظمیں ملی جلی ہیں۔

''تجلیات'' کے حصے میں جعفر بلوچ نے اساتذہ کے طریقۂ راسخہ کی پابندی کی ہے، یعنی نظموں کی ترتیب میں حمد، نعت، منقبت اور سلام کی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔ منقبت میں بھی انھوں نے ممدوحین میں لفظ مراتب کی تاریخی اور عام طور پر متفقہ ترتیب کو قائم رکھا ہے۔ یہ التزام مولانا ظفر علی خاں کے اس شعر میں بھی موجود ہے:

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی ابو بکر و عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم
ہم مرتبہ ہیں یاران نبی ﷺ کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اظہار عقیدت میں افراط و تفریط کی راہوں میں بھٹکنے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا ہے اور حدِ ادب قائم رکھی ہے۔ علاوہ ازیں ان برگزیدہ ہستیوں کے ذکر میں بے پر کی نہیں اڑائی۔ انھی صفات کے بیان پر اکتفا کیا ہے جن پر شرعی اور تاریخی تحقیق کے اعتبار سے اتفاق پایا جاتا ہے۔ مضمون کی جدت کے علاوہ اسی احتیاط کا ایک نمونہ نعت کا یہ شعر ہے:

تو نعت تو کہہ رہا ہے جعفر، نماز ہے ایک نعت برتر
اٹھ اور پہلے نماز پڑھ لے، نماز کا وقت جا رہا ہے

تاہم ان کے ہاں عقیدت کی سرشاری کی کمی نہیں۔ اس ضمن میں ان کی وہ نعت خصوصاً قابل مطالعہ ہے جس کا مطلع ہے:

حیراں ہیں باب نعت میں فن آشنائیاں
درماندہ ہیں تمام کمال آزمائیاں

جدت کے نقطۂ نظر سے حمد کا یہ پیرایہ بھی توجہ طلب ہے:

میری دانست میں
میرا آہنگ فریاد بھی
شکوۂ درد بھی
اشک غم زاد بھی
ایک پیرایۂ حمد ہے
اے خدا میرا حرف شکایت بھی مقبول ہو
اے خدا یہ عبادت بھی مقبول ہو

قابل غور نکتہ اس میں یہ ہے کہ بندے کا شکوہ و شکایت بھی اس کے ذوق عبودیت پر گواہ ہے۔ شکوہ کیا ہے تو اسی سے جس کی عنایت

کی نظر یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اس نے جب بھی مجھ پہ ڈالی ہے محبت کی نظر
اپنی زیبائی پہ خود بھی پیار آیا ہے مجھے

حمد، نعت اور منقبت میں یوں تو ان کا رنگ سخن یکساں مؤدب اور ایک سنبھلی ہوئی کیفیت کا حامل ہے، تاہم یہ کیفیت واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے کہ مناقب کے حصے میں تراکیب اور الفاظ کا دروبست نسبتاً زیادہ چست اور آہنگ نمایاں تر ہے۔ نعت میں عقیدت کے ساتھ ادب و احترام کا یہ انداز ہر جگہ قائم رہتا ہے:

نعت کا قصد ہے اگر اور خیال آبرو
تو بھی کر اے مرے قلم زمزم اشک سے وضو

البتہ منقبت میں تھوڑا ہی سہی لیکن بے محابا اسلوب کبھی کبھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ مثلاً

محتشم اسلام ان کی سرپرستی سے ہوا
آب و تاب اس کو ملی ہے حضرت صدیقؓ سے

شکوہ دین نبیؐ سیدی عمر فاروقؓ
مراد مصطفوی سیدی عمر فاروقؓ

وہ فخر ملت بیضا وہ بہجت اسلام
وہ احتشام حرم، شان و شوکت اسلام

رشک ماہ و مہر ہے دامان عثمان غنیؓ
نطق و انشا سے ورا ہے شان عثمان غنیؓ

پیغام برگ و بار در شہر علم ہے
سرمایۂ بہار در شہر علم ہے

تو دین حق کا نقش فروزاں ہے یا حسینؓ
تو مظہر جلالتِ ایماں ہے یا حسینؓ
تجھ پر چمن نثار کہ تیرا وجود پاک
تجسیم رنگ و نور بہاراں ہے یا حسینؓ

اس مقام سے نیچے اتر کر ان کی نظر میں قائدین ملت کے جلال و جمال کا بیان بھی احترام اور محبت کے ملے جلے جذبات کا مظہر ہے۔ بالخصوص اقبال، قائداعظم اور ظفر علی خاں۔ نکتہ آفرینی کی حد تک نظم 'اقبال رحمۃ اللہ علیہ' دوسری نظموں کے مقابلے میں نمایاں تر ہے۔ تراکیب کی تراوش یہاں بھی توجہ طلب ہے۔ خضر نگاہ تھا اقبال رحمۃ اللہ علیہ، حرم سپاہ تھا اقبال رحمۃ اللہ علیہ، قلم پناہ تھا اقبال رحمۃ اللہ علیہ، اور خدا گواہ تھا اقبال رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ۔ قائداعظم کی ثنا میں جذبۂ بے اختیار شوق انھیں حقیقت شناسی کی منزل سے دور نہیں لے جا سکا۔

سر سیمائے پاکستاں ہے نام قائد اعظم
کریں گے پاک دل ہی احترام قائد اعظم
یہ نکتہ اور بھی ہو گا عیاں ہر آزمائش میں
کلید باب منزل ہے پیام قائد اعظم

ظفر علی خاں کے لیے وہ سراپا سپاس ہیں:

ظفر علی خاں نشان اجلال دین و ملت
علامت افتخار ایماں ظفر علی خاں
صدائیں آتی ہیں آج بھی قریۂ وفا سے
ظفر علی خاں، ظفر علی خاں، ظفر علی خاں

مولانا کی خدمت میں اس ہدیۂ عقیدت پر تو خود ممدوح بھی داد دیے بغیر نہیں رہ سکیں گے:

جنھیں حفاظت بیشہ کی فکر لاحق ہو
بہل سکیں گے وہ کیا صحبت غزالاں سے

ملت اسلامیہ کی موجودہ صورت حال سے جعفر بلوچ دل گرفتہ ہیں اور اس دل گرفتگی میں ہم سب پاکستانی بھی شامل ہیں۔ تاہم بعض نظموں میں انھوں نے امید اور عزم و ہمت کا پیغام بھی دیا ہے۔ ان میں سے پہلی نظم ''اجلال جاوید'' ہے۔ اس میں بیان کی یہ صفت قابل داد ہے کہ پوری نظم، گویا ایک ہی شعر پر مشتمل ہے۔ اس نظم کے پہلے تین مصرع، گویا مبتدا ہیں اور خبر مقطع ہے:

عرصۂ دہر میں ہے جشن چراغاں جب تک
اے وطن جھک نہیں سکتا کبھی پرچم تیرا
نقش اجلال نہ ہو گا کبھی مدھم تیرا

''آہنگ پاک'' اور ''اہل وطن سے'' بھی اسی کیفیت کی حامل ہیں۔ البتہ نظم ''قدر نعمت'' میں قوم کو خوش خیالی یا خام خیالی کے خطرات پر انتباہ بھی کیا ہے کہ یہ بھی حب وطن کا تقاضا ہے۔ ''حدیث چمن'' کے حصے کی دو نظمیں، یعنی ''آپ کے شہر کی کیا روایات ہیں؟'' اور ''کیا آج ہم آزاد ہیں؟'' ملی اور قومی حوالے سے انتہائی کرب اور تاسف کا اظہار کرتی ہیں اور خطرے کا بگل بجاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اول الذکر نظم کا افتتاحی بند ملاحظہ ہو:

اجنبی دوستو
آپ کے شہر میں مجھ کو رہتے ہوئے

مدتیں ہوگئیں
اور اب تک یہ حسرت رہی ہے کہ معلوم ہو
آپ کے شہر کی کیا روایات ہیں؟

''آئینہ خانہ'' کے حصے میں سنجیدہ اور شگفتہ نظمیں ملی جلی ہیں، یعنی اس حصے کی بعض نظمیں سنجیدہ ہیں لیکن اکثر نظموں میں شگفتہ اور طنزیہ آہنگ نمایاں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس حصے کی ترتیب میں کچھ تساہل یا رواروی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اگر سنجیدہ نظموں کو الگ باب میں پیش کیا جاتا اور طنزیہ و شگفتہ نظموں کو الگ حصے میں رکھا جاتا تو بہتر تھا۔ ترتیب و تنظیم کے اس تسامح سے قاری کو الجھن پیش آتی ہے اور کتاب کے اس حصے کی نظموں کی فضابندی اور تاثر آفرینی پر زد پڑتی ہے۔ البتہ ان دونوں طرح کی نظموں میں ایک قدر مشترک بھی ہے، یعنی آئینہ نمائی کا عنصر ان سب نظموں میں پایا جاتا ہے۔ ''آئینہ خانہ'' کی ابتدائی دو نظمیں یعنی ''اے قلم'' اور ''تحسین فراقی سے'' جعفر بلوچ کے ادبی منشور یا تخلیقی لائحہ عمل کو پیش کرتی ہیں۔ نظم ''پیام خیر و سلام'' ہمیں دائیں بائیں کی غیر حقیقی اور کڈھب تقسیم سے باہر لا کر خیر و شر اور حق و باطل میں امتیاز کرنا سکھاتی ہے اور خیر و سلام کا راستہ اپنانے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس نظم کا آخری بند لازوال شان کا حامل ہے:

یہی مقطع ہے مری سب نمازوں کا
جو میری دائیں جانب ہیں سلام ان پر
جو میری بائیں جانب ہیں سلام ان پر
میں خیر آئین ہوں جعفر
فقط دایاں نہیں ہوں میں
فقط بایاں نہیں ہوں میں

جعفر بلوچ کی شگفتہ اور طنز آمیز نظموں کے بارے میں میرا عمومی تاثر یہ ہے کہ یہ نظمیں ہمارے ماحول اور معاشرے کی ناہمواریوں اور مضحک صورت حال کو سامنے لاتے ہیں لیکن یہاں طنز میں کٹیلا پن زیادہ نمایاں نہیں۔ یہاں طنز اور استہزاء کہیں قہقہہ خیز نہیں ہونے پاتے اور خندۂ استہزاء کہیں خندۂ زیر لبی سے آگے نہیں بڑھتا۔ البتہ بعض نظمیں اس عام تاثر سے مستثنیٰ ہیں اور ان میں طنز کی تلخی نسبتاً غالب ہے۔ اس قسم کی نظموں میں ''ایڈہاکیے''، ''ابہام'' اور ''چوریاں چکاریاں'' کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ نظم بعنوان ''اطلاعاً عرض ہے'' میں سنجیدگی اور شگفتگی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتی ہیں۔ مثلاً:

جاں بہ لب تم سے وفا ہے اطلاعاً عرض ہے
یہ رویہ ناروا ہے اطلاعاً عرض ہے
اس فقیر عشق کو تم نے جو بخشا تھا کبھی
زخم وہ اب تک ہرا ہے اطلاعاً عرض ہے
کر دیا ہے راکھ اس گلشن کو جس کے لمس نے
وہ بزعم خود صبا ہے، اطلاعاً عرض ہے

اے زمانے کے خداؤ کیا ڈراتے ہو ہمیں
اک ہمارا بھی خدا ہے اطلاعاً عرض ہے

ان اشعار میں مزاح اور سنجیدگی کی ملی جلی کیفیت ہے۔ان کے مقابلے میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

پھر سیاست پائے گی پروانۂ غارت گری
پھر الیکشن آ رہا ہے اطلاعاً عرض ہے
محتسب روکے گا کیا پینے پلانے سے ہمیں
خود وہ رند باصفا ہے اطلاعاً عرض ہے

ان اشعار میں مزاح اور طنز کی کیفیت غالب ہے۔نظموں کے اسی حصے میں علامہ اقبال پر تین نظمیں شامل ہیں۔ان کا اسلوب سرتا سر طنزیہ ہے۔یہ طنز اقبال شناسی کے حوالے سے ہمارے رویوں اور نام نہاد ماہرین اقبالیات پر ہے۔شدت طنز اور ہدف افگنی کے لحاظ سے نظم ''ماہر اقبالیات'' اس سلسلے کی باقی نظموں پر فوقیت رکھتی ہے۔

''اب ہم ریٹائر ہو چکے'' اور ''چل بسا جعفر بلوچ'' شاید اس حصے کی نمایاں ترین نظمیں ہیں۔ان میں خالص مزاح کا رنگ پوری شگفتگی کے ساتھ جھلکتا ہے۔پہلی نظم کسی تقریب کے حوالے سے کہی گئی محسوس ہوتی ہے لیکن اس میں کسی نامعلوم طریقے سے ایک ''آفاقیت'' آ گئی ہے۔قارئین کرام کو یہاں لفظ ''آفاقیت'' مبالغہ آمیز معلوم ہوگا۔مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس نظم کو ہر ریٹائر ہونے والا اپنی طرف منسوب کر سکتا ہے۔

کسی شاعر نے کہا تھا کہ جوانی مرنے کا زمانہ ہوتا ہے۔اس پر میں نے یہ تک بندی کی تھی:

دن مرنے کے جی جی کے گزارے ہم نے
جب جینے کے دن آئیں گے مر بھی لیں گے

عجیب تر بات یہ ہے کہ بڑھاپے میں موت کے لفظ سے ڈر آنے لگتا ہے۔بدشگونی کے ڈر سے اس عمر میں لوگ اس لفظ کے استعمال سے کتراتے ہیں۔کسی زمانے کی بات ہو، جعفر بلوچ نے اپنا مرثیہ خود لکھا ہے۔ان سے پہلے قیوم نظر نے بھی لکھا تھا۔ویسے بلوچ قوم موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے والی قوم ہے۔بہرحال کچھ بھی ہو جعفر بلوچ کی اس نظم کا ذکر شہزاد احمد نے بھی کیا ہے بلکہ بات ہی اسی پر ختم کی ہے۔انھیں افسوس ہے کہ وہ اس پر ''آمین'' بھی نہیں کہہ سکتے (شاید انا للہ کہنا چاہتے تھے)۔رفعِ شر کے لیے نظم کے آغاز میں نیک شگون کا قرینہ موجود ہے۔یعنی:

ہو غلط یارب، سنا ہے چل بسا جعفر بلوچ

دراصل بین السطور ایک آخری بند بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

جاودانی زندگی کا استعارہ ہیں یہ شعر
نفی میں اثبات کا آئین گویا ہیں یہ شعر
یہ بھلا ممکن ہو کیونکر خود کہے جعفر بلوچ
چل بسا جعفر بلوچ

زندۂ جاوید ہے جعفر بلوچ!

اب آمین کہیے۔

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کی تازہ مطبوعات

مبصر: اورنگ زیب نیازی

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور اردو کی ترویج وترقی کے لیے سرگرم ایک اہم پاکستانی ادارہ ہے جو تنقیدی وتحقیقی کتب کی اشاعت کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے۔ جامعاتی سطح پر لکھے جانے والے تحقیقی مقالات کی اشاعت اس ادارے کی ترجیحات میں ہے۔ ۲۰۰۵ء میں اس ادارے کے زیر اہتمام درج ذیل کتابیں شائع ہوئیں جن کا ذکر مقصود ہے۔

۱۔ Feminism in Urdu Poetesses/عنبرین صلاح الدین

۲۔ ادیبوں، شاعروں کے کیری کیچر/اسلم کمال

۳۔ Gabrial's Wing کا تجزیاتی اور تنقیدی جائزہ/محمد سلیم اللہ شاہ

۴۔ ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر: شخصیت اور فن/ڈاکٹر ریاض قدیر

۵۔ تحسینیات/عابد صدیق (مرتبہ: حافظ رضوان محمد چوہان)

تاریخ نے عورت کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ مرد مرکز معاشرے میں عورت کی حیثیت ہمیشہ ثانوی رہی اور اس کی پہچان مرد کے ساتھ اس کے رشتوں پر استوار ہے۔ تاریخ کے اس جبر نے بالآخر عورت کے اندر عرفان ذات اور بیداری کی لہر کو جنم دیا اور عورت نے اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائی۔ بیداری کی اس لہر کو Feminism (تحریک نسواں) کا نام دیا گیا۔ اس کا نقطۂ آغاز انقلاب فرانس ہے جب پہلی مرتبہ عورت نے اجتماعی سطح پر اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائی۔ رفتہ رفتہ اس لہر میں شدت آتی گئی۔ عالمی سطح پر ورجینیا وولف، ڈورتھی رچرڈسن، سیمون دی بووا اور کیٹ ملٹ جیسی خواتین مصنفین نے ثقافتی اور معاشی سطح پر عورت کو درپیش مسائل اور تعصبات کو اپنا موضوع بنایا اور اس موضوع پر کھل کر لکھا۔ تحریک نسواں کے اثرات برصغیر تک بھی پہنچے اور اردو کی خواتین مصنفین کی تحریروں میں اس کی واضح گونج سنائی دینے لگی۔

"Feminism in Urdu Poetesses" عنبرین صلاح الدین کی انگریزی تصنیف ہے جو دراصل ایم اے۔ فلسفہ کی نصابی ضروریات کے تحت پنجاب یونیورسٹی میں جمع کرائے گئے تحقیقی وتنقیدی مقالے کا کتابی روپ ہے۔

دیباچے اور تعارف کے بعد یہ کتاب آٹھ ابواب میں منقسم ہے۔ آخر میں کتابیات اور اشاریہ ہے۔

پہلا باب The Quest for Personal Identity ہے جس میں عالمی سطح پر عورت کو درپیش مسائل کا جائزہ، مختلف دانشوروں کی آرا کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ دوسرے باب کا عنوان The Birth of Feminism ہے جس میں Feminism کے پس منظر، اس کی مختلف صورتوں اور اس کے آغاز وارتقا پر بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں تحریک نسواں کے لیے کام کرنے والی مختلف تنظیموں اور رسائل وجرائد کا تعارف بھی شامل ہے۔

Women awakening in the Subcontinent اس کتاب کا تیسرا باب ہے جس میں مصنفہ نے برصغیر پاک وہند میں Feminism کی بنیادیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں اعداد وشمار کے ذریعے برصغیر میں عورت کی تعلیمی پسماندگی کے مسئلے پر سیر حاصل بحث ہے اور ان خواتین کی کوششوں کا ذکر ہے جو تحریک پاکستان میں مردوں کے شانہ بشانہ شامل رہیں۔

Breaking the Barriers کتاب کا چوتھا باب ہے جس میں مصنفہ نے اردو ادب کے ابتدائی عہد سے لے کر موجودہ دور تک کے ادب میں Feminism کے اثرات کا سراغ لگایا ہے۔ ان کے مطابق اردو کے کلاسیکی عہد میں صرف چند خواتین مثلاً زاہدہ خاتون، زیب النساء، صبا لکھنوی اور صفیہ شمیم کے نام ملتے ہیں جن کے ہاں نسوانی طرز احساس تلاش کیا جا سکتا ہے۔ جدید شاعروں میں ادا جعفری، زہرا نگاہ، شبنم شکیل، یاسمین حمید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، بشریٰ اعجاز اور نوشی گیلانی کی شاعری کو موضوع بناتے ہوئے مصنفہ نے ان شاعرات کے ہاں نسوانی شعور کی موجودگی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ کتاب کا پانچواں باب Poetess of Fragrance پروین شاکر اور چھٹا باب Rebellious Voices کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کی شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ ساتواں باب Realization of Concepts تمام مباحث کا تنقیدی جائزہ ہے۔ آٹھواں باب My Vision میں مصنفہ نے عورت کے متعلق ہمارے معاشرے میں رائج غلط تصورات کو رد کرتے ہوئے اسلامی عقائد اور قرآن تعلیم کی روشنی میں عورت کا صحیح مقام ومرتبہ متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

کتاب میں عنبرین صلاح الدین کا تنقیدی شعور اور تخلیقی طرز احساس بھرپور طریقے سے سامنے آیا ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر مزید لکھنے کی گنجائش تو موجود رہے گی۔ مگر یہ کہنا بجا ہے کہ مصنفہ نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

اس کتاب کے صفحات ۱۹۱ اور قیمت ۲۰۰ روپے ہے۔

کیری کیچر دراصل کسی شخصیت کے اصل خدوخال کو مبالغہ آرائی کے ساتھ قابل توجہ بنانے کا فن ہے۔ جو سیاسی، سماجی اور ادبی طنز کا بہترین وسیلہ اظہار بھی قرار پاتا ہے۔ کیری کیچر اگر کسی ادبی شخصیت کا ہو اور بنانے والا خود بھی ایک صاحب اسلوب

ادیب ہوتو لفظ اور نقش کا ایک حسین امتزاج سامنے آتا ہے۔ اسلم کمال پاکستان کے معروف مصور ہیں۔ خاص طور پر اسلامی خطاطی کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے مختلف ادبی شخصیات کے کیری کچر ایک طویل عرصے تک ''ماہِ نو'' میں شائع ہوتے رہے۔ ان کیری کچر کا ایک انتخاب مع اضافہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور نے ''ادیبوں، شاعروں کے کیری کچر'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اسلم کمال کے موئے قلم کا یہ شاہکار ۵۸ معروف ادیبوں اور شاعروں کے کیری کچر اور ایک کیری کچر گارڈن پر مشتمل ہے۔ ہر کیری کچر کے ساتھ ایک نثری تحریر، نظم یا خط بھی شامل ہے۔ یوں لفظ اور نقش کا یہ رشتہ ادبی تنقید کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ اسلم کمال نے کسی شخصیت کو مضحکہ خیز بنانے کے بجائے اس کی مختلف جہات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کہیں طنز کا پہلو آیا بھی ہے تو اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ یہ البم ادب کے ساتھ ان کے والہانہ لگاؤ اور ان کی فنی دیانت کا ثبوت بھی ہے اور ان کے تخلیقی وتنقیدی شعور کا بہترین نمونہ بھی۔

بڑی تقطیع کے اس البم کی قیمت ۳۰۰ روپے اور صفحات ۱۲۸ ہیں۔

۳

ڈاکٹر این میری شمل بیسویں صدی کی معروف مستشرق اور ماہر لسانیات ہیں۔ اسلام، مشرقی علوم اور اقبال ان کی دلچسپی کا خاص محور رہا۔ کلام اقبال کے انگریزی وجرمن تراجم کے علاوہ Gabril's wing ان کی وہ شہرہ آفاق تصنیف ہے جو مغرب میں افکار اقبال کی تفہیم کا سب سے موثر ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر شمل نے اقبال کی سوانح وشخصیت اور تصانیف کے جائزے کے علاوہ اقبال کے دینی تصورات اور فکر اقبال کے مشرقی ومغربی مآخذ پر بحث کی ہے۔ کئی مقامات پر مصنفہ سے فروگزاشتیں سرزد ہوئیں اور کئی جگہوں پر وہ خود کو غیر جانب دار اور غیر متعصب رکھنے میں ناکام رہی ہیں۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ فکر اقبال کی تفہیم کے وقت ان کا بنیادی مآخذ قرآن کے بجائے دوسرے ذرائع رہے۔

''Gabril's wing کا تجزیاتی اور تنقیدی جائزہ'' سلیم اللہ شاہ کی تحقیقی وتنقیدی کاوش کا نام ہے جس پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی طرف سے انھیں ایم۔فل کی ڈگری دی گئی۔ زیر نظر کتاب اس مقالے کا کتابی روپ ہے۔ مصنف نے کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں این میری شمل کا تعارف اور ان کے کام کا ایک جائزہ ہے۔ دوسرے باب میں برصغیر پاک وہند کے اسلامی پس منظر، حیات وتصانیف اقبال اور اقبال کے دینی محرکات کے بارے میں این میری شمل کے خیالات کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ تیسرے اور چوتھے باب میں بالترتیب ارکان اسلام اور ایمان مفصل کے بارے میں اقبال کے تصورات کے متعلق این میری شمل کے خیالات پر گرفت کی گئی ہے۔ پانچویں باب میں فکر اقبال پر مشرق ومغرب کے تصورات کے اثرات کے بارے میں شمل کے خیالات کا جائزہ اور چھٹا باب تمام تر بحث کا مجموعی جائزہ ہے اور آخر میں کتابیات ہیں۔

فکر اقبال کی تعبیر وتشریح میں ڈاکٹر شمل سے جو تسامحات سرزد ہوئے ہیں، سلیم اللہ شاہ نے فرداً فرداً ان پر تنقید کی ہے اور اقبال کا صحیح نقطۂ نظر قرآن کریم کی روشنی میں وضاحت سے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ معروف اقبال شناسوں کی کتب سے اس کے حوالے بھی دیے ہیں۔

شمل نے اپنی کتاب میں کوشش کی ہے کہ اقبال کے الہیاتی تصورات پر مغربی مفکرین کی چھاپ کو ثابت کیا جا سکے۔ مصنف، شمل کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے اس کوشش کو مضحکہ خیز بتاتے ہیں کیونکہ اللہ کی ابدیت اور اول وآخر ہونے کا ذکر

قرآن مجید میں بار بار آیا ہے تو اس کے ہوتے ہوئے اقبال یہ تصور مغرب سے مستعار کیسے لے سکتے ہیں؟

اسی طرح شمل کا یہ کہنا کہ اقبال مغرب کے جدید سائنسی علوم کے خلاف ہیں، مصنف کے نزدیک قابل گرفت ہے کیونکہ اقبال نے مغرب کے صرف ان علوم پر تنقید کی ہے جو انسان کی روحانی زندگی کی تباہی کا سبب ہیں ورنہ سائنسی علوم اور ان میں مغرب کی ترقی کے تو اقبال خود معترف ہیں۔

اقبال کے دینی تصورات کی تشریح کرتے ہوئے بھی شمل سے بہت بھول چوک ہوئی۔ صور اسرافیل، جہاد، ملائکہ اور ابلیس کے بارے میں بعض مقامات پر شمل کی تشریحات اقبال کے عقائد کو غلط رنگ دینے کے مترادف ہیں۔ جس کو مصنف نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

اگرچہ مصنف کے زور قلم کا بڑا حصہ ڈاکٹر شمل کے خیالات کی تردید میں صرف ہوا ہے لیکن ان کی تحقیق اور درست تجزیوں کے اعتراف میں بھی انھوں نے بخل سے کام نہیں لیا اور جہاں جہاں ضرورت پیش آئی انھوں نے شمل کی تنقیدی بصیرت کو سراہا بھی ہے۔ یہ کتاب یقیناً تنقید اقبال میں اہم اضافہ ہے۔

کتاب کے صفحات ۲۲۲ اور قیمت ۲۰۰ روپے ہے۔

۴

''ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر: شخصیت اور فن'' ڈاکٹر ریاض قدیر کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے جو انھوں نے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی نگرانی میں مکمل کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے اس پر ڈگری لی۔

یہ مقالہ چھ ابواب میں منقسم ہے۔ شروع میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا پیش لفظ اور مصنف کا ''حرف اول'' ہے۔ پہلا باب ''سوانح حیات'' ہے جس میں مصنف نے ذیلی عنوانات کے تحت حیات تاثیر کے مختلف گوشوں سے انتہائی تلاش و تحقیق سے پردہ اٹھایا ہے۔ دوسرے باب ''تاثیر کی شخصیت'' میں مصنف نے ایم ڈی تاثیر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

''تصانیف'' اس کتاب کا تیسرا باب ہے جس میں مصنف نے تاثیر کے شعری، نثری اور تنقیدی مجموعوں کا جائزہ نہایت تفصیل سے لیا ہے اور ان کے مشمولات کی اولین اشاعتوں کا سراغ لگایا ہے۔ علاوہ ازیں اس باب میں تاثیر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے غیر مطبوعہ مقالے کا تعارف و تجزیہ بھی شامل ہے۔

باب چہارم میں ''تاثیر کی شاعری کا فنی و اسلوبیاتی جائزہ'' لیا گیا ہے اور مختلف اصناف سخن کی روشنی میں بطور شاعر، اردو شاعری میں تاثیر کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پانچواں باب ''تاثیر کی تنقید نگاری'' ہے جسے درج ذیل چار ذیلی عنوانات میں منقسم کیا گیا ہے: (ا) نظری تنقید (ب) عملی تنقید (ج) آرٹ اور آرٹسٹ (د) تاثیر کی تنقید نگاری کا مجموعی جائزہ۔

اس باب میں مصنف نے تاثیر کا تنقیدی نظریہ پیش کرتے ہوئے ان کے تنقیدی مباحث پر روشنی ڈالی ہے اور اقبال، غالب، آرٹ اور مصوری پر ان کی عملی تنقید کا مربوط جائزہ لیتے ہوئے ان کے اسلوب تنقید سے بحث کی ہے۔

باب ششم میں ڈاکٹر ریاض قدیر نے کتاب کے مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں ایم۔ ڈی تاثیر کا ادبی مقام و مرتبہ

متعین کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔خاص طور پر تاثیر کو اردو تنقید کا ایک اہم فرد قرار دیتے ہوئے بعض حوالوں سے انھیں اولیت دینے کی بھی کوشش کی ہے:

''تاثیر نے اپنی تنقید میں بھی ذوق اور جمالیات حسن کو نہایت سلیقے اور شعور سے برتا ہے اس طرح انھوں نے پہلی بار فنون لطیفہ سے متعلق معیارات نقد مہیا کیے اور اردو خواں طبقے میں فنون لطیفہ سے متعلق ذوق جمالیات کی تربیت کا آغاز کیا''۔(ص ۴۳۳)

کتاب کے پس ورق پر مختار الدین احمد اور ڈاکٹر وحید قریشی کی آرا درج ہیں جنھوں نے اس مقالے کی اشاعت کو اردو کے تحقیقی وتنقیدی ادب میں ایک اہم اضافہ قرار دیا ہے۔

۵۰۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ۳۰۰ روپے ہے۔

۵

''تحسینیات'' عابد صدیق کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جن کی جمع وتدوین ان کے صاحب زادے حافظ صفوان محمد چوہان نے کی ہے۔ان میں سے اکثر مضامین مختلف کتب ورسائل میں شائع شدہ ہیں اور بعض بقول مرتب ''ریڈیائی تقاریر کی شکل میں تھے جنھیں بعد میں باقاعدہ تحریر کی شکل میں منتقل کیا گیا۔''

اس مجموعے میں متنوع موضوعات پر کل ۲۲ مضامین ہیں۔آغاز میں ''معروض'' کے عنوان سے مرتب کا دیباچہ ہے۔اس کے بعد عابد صدیق۔میرا دوست (پیش گفتار) ڈاکٹر خورشید رضوی کا تحریر کردہ ہے۔''عابد صدیق۔سوانح حیات ایک نظر میں'' میں عابد صدیق کی حیات، شخصیت اور مشاغل ومصروفیات کے بارے میں وقیع معلومات فراہم کی گئی ہیں۔اس مجموعے میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔جمہوریت کیا ہے؟	۲۔غزل، علامتیں اور مرزا غالب
۳۔دور قدیم میں رنگ جدید (مرزا اسداللہ خاں غالب)	۴۔شعر اور اصول انتقاد
۵۔اقبال کا تصور ملت	۶۔اسلامی ثقافت، اردو شاعری اور اقبال
۷۔آزاد نظم کی غنائیت	۸۔رسول اللہ کے رجزیہ کلمات
۹۔اقبال کے فن کا پس منظر اور اس کا تصور فن	۱۰۔عزیز احمد کا تصور فن
۱۱۔مہر صاحب	۱۲۔اقبال اور تصور پاکستان
۱۳۔انوار انجم کی نظم ''ایک بوند لہو کی'' کا بے لاگ جائزہ	۱۴۔مسلم تشخص اور ہماری ملی شاعری
۱۵۔عبدالعزیز خالد کی شاعری	۱۶۔ہماری کلاسیکی موسیقی کی ثقافتی اہمیت
۱۷۔محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری	۱۸۔اردو کی ترقی میں بہاول پور کی ادبی انجمنوں کا کردار
۱۹۔سرسید احمد خاں اور رسالہ اسباب بغاوت ہند	۲۰۔دوہیل
۲۱۔جامی صاحب کی باتیں	۲۲۔شاعری کا کارٹون

عابد صدیق ایک بے لاگ اور صاف گو تجزیہ نگار تھے۔ان مضامین میں ان کی ادبی دیانت داری اور ملک وملت سے ان کی گہری وابستگی صاف محسوس ہوتی ہے۔یہ مضامین ان کی تنقیدی بصیرت کا واضح ثبوت ہیں۔

ہر مضمون کے آغاز میں مرتب نے ایک نوٹ لکھا ہے جس میں مضمون کے ماخذ، تاریخ اشاعت اور اولین طباعت کے بارے میں معلومات دی ہیں۔علاوہ ازیں مناسب مقامات پر دیے گئے مفید حواشی نے اس کتاب کی قیمت کو دوگنا کر دیا ہے۔ مرتب کی محنت اور سلیقہ مندی یقیناً قابلِ تحسین ہے۔

کتاب کے صفحات ۱۵۲ اور قیمت ۱۵۰ روپے ہے۔

مختصر تبصرے

ارمغان ڈاکٹر سید عبداللہ

مبصر: محمد ہارون عثمانی

مرتبین: ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر ضیاء الحسن۔ناشر: شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور۔ سنہ اشاعت ۲۰۰۵ء۔ صفحات ۵۷۴ + ۴۵ قیمت ۴۰۰ روپے۔

ارمغان ڈاکٹر سید عبداللہ، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے 'مرحوم اساتذہ کی یاد میں' سلسلے کی دوسری کتاب ہے۔پہلی کتاب ''ارمغان شیرانی'' مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر زاہد منیر عامر میں حافظ محمود شیرانی کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا جبکہ 'ارمغان سید وقار عظیم'، 'ارمغان عبادت بریلوی'، 'ارمغان افتخار احمد صدیقی' اور 'ارمغان سجاد باقر رضوی' ابھی پائپ لائن میں ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کا شمار تحقیق کے دبستان شیرانی کے اہم اساتذہ میں ہوتا ہے اور ان کا نام اردو ادب کی تدریس، تنقید اور تحقیق کے باب میں سند کی حیثیت رکھتا ہے۔زیر تبصرہ کتاب سید صاحب کا یادنامہ ہے جسے مرتبین نے 'ارمغان ڈاکٹر سید عبداللہ' کا عنوان دیا ہے۔کتاب دو بڑے حصوں میں منقسم ہے۔پہلا حصہ جو تین مضامین پر مشتمل ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ کی شخصیت سے متعلق ہے جبکہ دوسرے میں تیرہ مضامین (بشمول دو انگریزی مضامین) ان موضوعات پر ہیں جن سے سید صاحب کو دلچسپی رہی ہے۔مرتبین کا دیباچہ 'سخنے چند' اور رفاقت علی شاہد کی مرتب کردہ 'قلمی معاونین کے کوائف / منتخب تصنیفات و تالیفات' اس کے علاوہ ہیں۔

سید صاحب کی شخصیت والے حصے میں پہلے مضمون کے طور پر مختار الدین احمد کے نام ڈاکٹر سید عبداللہ کے ۴۴ خطوط بمعہ ڈاکٹر مختار الدین احمد کا تعارف اور حواشی و تعلیقات شامل ہیں۔ان خطوط کی مدد سے سید صاحب کی شخصیت کی چند پرتیں کھلتی ہیں۔اس حصے کا دوسرا مضمون ''آ جی'' سید صاحب کی صاحبزادی عطیہ سید کا تحریر کردہ ہے۔عطیہ خود ایک افسانہ اور ناول نگار ہیں، اس لیے اس مضمون کا اسلوب بھی افسانوی ہے۔عطیہ نے سید صاحب کی شخصیت کے ان گوشوں تک رسائی ممکن بنائی ہے جو

ابھی تک ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔لیکن اس مضمون میں ہلکی سی تشنگی کا پہلو بھی ملتا ہے۔ہم سید صاحب کی صاحبزادی سے اس سے زیادہ کی توقع رکھتے تھے۔تیسرا مضمون سید جمیل احمد رضوی کی مرتب کردہ کتابیات ڈاکٹر سید عبداللہ ہے۔یہ کتابیات رضوی صاحب نے مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے لیے ایک عرصہ پہلے ترتیب دی تھی۔مرتبین کے مطابق ''اب ۲۰۰۵ء میں اس پر نظر ثانی کر کے اضافوں کے ساتھ اسے شامل کتاب کیا جا رہا ہے تا کہ اختصار کے ساتھ سید عبداللہ کے علمی کارناموں کی تفصیل اہل علم تک پہنچ جائے۔'' کتابیات میں سید صاحب کی تمام کتابیں درج نہیں ہو سکی ہیں۔مثلاً اردو اکیڈمی لاہور سے شائع شدہ انگریزی میں اکیڈمی کی اردو زبان کے بارے میں کتاب اور اس نوعیت کی چند دیگر تصانیف۔اسی طرح سید صاحب کو ملنے والے اعزازات اور ایوارڈوں کا ذکر بھی اس فہرست میں نہیں ہے۔

دوسرے حصے میں شامل اکثر مضامین اہم موضوعات پر ہیں۔گیان چند جین نے قاضی عبدالودود کی تحقیق نگاری کا اچھا جائزہ لیا ہے لیکن کہیں کہیں موجود شخصی حوالوں کی وجہ سے اس مضمون میں ہلکی سے جانب داری پیدا ہو گئی ہے۔ڈاکٹر انصار اللہ نے شاگردان رشک کا تذکرہ پیش کیا ہے۔ڈاکٹر معین الدین عقیل کا 'ملیشیا میں غالب کے نوادر' محمد عالم مختار حق کا 'نقد غالب' ابوالکلام قاسمی کا 'سردار جعفری کے تنقیدی رویے' اردو تحقیق وتنقید میں اہم اضافے ہیں۔

کتاب پر سنہ اشاعت ۲۰۰۵ء درج ہے لیکن پس ورق پر چیئرمین شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ڈاکٹر محمد سلیم ملک کے کیپ میں ان کے نام کے نیچے ۲۱ مارچ ۲۰۰۶ء کی تاریخ رقم ہے۔مجموعی طور پر کتاب کی پیش کش مناسب ہے۔

مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں
(انتخاب ردو جلدیں)

مبصر: محیط اسمٰعیل

مجتبیٰ حسین اردو طنز و مزاح کا معروف و معتبر نام ہے۔جنھوں نے روزنامہ سیاست (حیدرآباد دکن) میں ۱۹۶۲ء سے ہفتہ وار فکاہیہ کالم کا آغاز کیا۔سولہ سال بعد ایک تعطل واقع ہوا۔ ۱۹۹۳ء سے دوبارہ مذکورہ اخبار میں لکھنا شروع کیا۔درمیان میں کچھ تعطل کی وجہ شاید غیر ملکی سفر ہیں اور سفرنامے لکھ کر طے کیا کہ لکھنا کبھی موقوف نہیں رہا بلکہ مسلسل اور منفرد اسلوب میں لکھنے ہی سے ان کا نام اور مقام بنا ہے۔پاکستان میں ان کے بھائی ابراہیم جلیس نے بھی طنز نگاری میں خوب نام کمایا ہے۔

مجتبیٰ حسین کو لکھتے چالیس پچاس برس ہو چلے ہیں، لیکن ان کی تحریر آج بھی وہی تروتازگی رکھتی ہے جو ابتدا سے لہلہاتی، چلبلاتی اور مسکراتی سب کو دکھائی دی تھی۔ان کے قلم میں ایسی جان ہے کہ رکنے یا تھکنے کا نام نہیں۔ان کے قارئین کی تعداد بلا شبہ لاکھوں میں ہے۔ان کے بہت سے کالم اور مضامین پاک و ہند کے کئی ادبی رسائل و اخبارات میں قارئین کی ضیافت طبع کے لیے نقل کیے جاتے ہیں۔اب تو انٹرنیٹ پر بھی ان کی شگفتہ تحریریں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔

فکاہیہ کالم نگاری میں کمال انشا پردازتو ہوئے ہی تھے، خاکہ نگاری کے میدان میں بھی بہت جلد اپنا ''سونا'' منوالیا۔اب

تک دوسو سے زاید خاکے گنوا ہی نہیں چکے، منوا بھی چکے ہیں۔ اس وقت کیلکو لیٹر ہمارے پاس نہیں، ورنہ مضامین کی تعداد بھی شاید بتا سکتے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کی مشہور کتابوں کے نام ہیں: تکلف برطرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بہرحال، الغرض، بالآخر، آخرکار ان کے دل چسپ سفرنامے ہیں: جاپان چلو، جاپان چلو، اور سفر لخت لخت۔ کالموں کا ایک انتخاب ''میرا کالم'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ خاکوں کے مجموعے بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں: آدمی نامہ، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ اور ہوئے ہم دوست جس کے۔

حال ہی میں ان کی پندرہ سولہ کتابوں سے ایک انتخاب دو جلدوں میں دہلی سے شائع ہوا اور اسی کا ایک ایڈیشن پاکستان میں چھپ کر سامنے آیا ہے۔ سرسری مطالعے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انتخاب معیاری ہے۔ مجتبیٰ حسین کی تخلیقات کی تحسین مستند شخصیات نے بھی کی ہے۔ جن میں عقیل سرورق کے مطابق پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں کہ مجتبیٰ حسین اس دور کے ممتاز مزاح نگاروں میں سے ہیں، وہ طنز نگار نہیں مزاح نگار ہیں۔ وہ زندگی کی ناہمواریوں، اس کے عجائبات اور شخصیتوں کے تضاد کا مذاق اڑا کر زندگی کے لطف و انبساط میں اضافہ کرتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے مجتبیٰ حسین کی تین خوبیاں بیان کی ہیں: ایک یہ کہ قلم برداشتہ لکھتے ہیں، دوسرے ان کے یہاں تکرار کا عمل نہیں ہے اور تیسرے ان کی تحریروں میں تروتازگی برقرار ہے۔ بقول سرور صاحب: ہمارے دور کے سب سے بڑے مزاح نگار اور طنز نگار کا مجتبیٰ حسین کو یہ خراج تحسین قابل ذکر ہے۔

مشفق خواجہ صاحب جو اردو دنیا اور طنز و مزاح میں دوسرا بڑا نام ہے مجتبیٰ حسین کے لیے اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں: مجتبیٰ حسین خاصے ''جہاں دیدہ'' ہیں ..... محاورۃً دنیا کو خوب اچھی طرح برتا ہے اور عملاً دنیا کے کئی ملکوں کو دیکھا ہے، اس لیے ان کے تجربات و مشاہدات میں تنوع بھی ہے اور وسعت بھی۔ انھوں نے طنز کی گہرائی اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس سے اور اسلوب کی چاشنی بھائی کے جگری دوست ابن انشا سے لی ہے۔ مزاح میں کسی کے مقلد نہیں، ان کے بیشتر مضامین افسانوی نوعیت کے ہیں جن میں وہ دل چسپ واقعات اپنے دل چسپ ترین اسلوب میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ (ان میں) ..... معنی خیز اور فکر انگیز جملے کثرت سے آتے رہتے ہیں (مثلاً) ''اب ادیب کا قلم کان پر نہیں رکھا جاتا۔ اسے ادیب یا تو اپنی جیب میں رکھتا ہے یا قلم سمیت ادیب کو حکومت اپنی جیب میں رکھ لیتی ہے۔ پہلی صورت میں قلم محفوظ رہتا ہے اور دوسری صورت میں ادیب''۔

مضامین ہوں یا خاکے یا سفرنامے ان کا بنیادی وصف مجتبیٰ حسین کا انداز بیان ہے، وہ ایک ایسی بے تکلفانہ فضا تخلیق کرتے ہیں کہ قاری مسحور ہو جاتا ہے۔

۴۶ منتخب مزاحیہ مضامین کی جلد اول کے صفحات ۳۴۳ ہیں اور دوسری جلد جو بہترین خاکوں پر مشتمل ہے اس کی ضخامت ۳۵۲ صفحات کی ہے۔ قیمت دونوں جلدوں کی پانچ سو روپے ہے۔ مشینی کتابت، کاغذ اچھا اور مضبوط جلد دیکھنے میں سادہ مگر خوب صورت۔

اس کے مرتب ہیں حسن چشتی صاحب جنھوں نے بہت دور یعنی امریکا میں جا بیٹھنے کے باوجود اپنے دیرینہ دوست (مجتبیٰ حسین) سے خلوص اور دوستی کا حق ادا کیا ہے یعنی اتنی محنت و محبت سے اتنا کام کر دیا کہ بہ درجہ یادگار ہے اور سدا بہار ہے۔

(ناشر: دارالنوا در لاہور۔ تقسیم کار: کتاب سرائے لاہور)

رسالۂ ذکر مغنیان ہندوستان بہشت نشان

(ایک تعارف)

محمد اطہر مسعود

''لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلمبند کرتے ہیں۔ میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولتمندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں۔

پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے۔''

(گدڑی کا لال۔ نور خان)

انبائے اردو مولوی عبدالحق

عمرانیات سے واجبی شناسائی رکھنے والے اصحاب بھی جانتے ہیں کہ افراد معاشرہ کی گروہ بندی امارت اور غربت کے علاوہ بھی کئی پہلوؤں سے ممکن ہے۔ فنون لطیفہ ہی کو لیجئے۔ تاریخ انسانی کے ہر دور میں کسی بھی معاشرہ کو صریحاً دو ایسے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جو یا تو فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھتے ہوں یا اس کے برعکس ان کی اہمیت کو سرے سے ہی تسلیم نہ کرتے ہوں۔ اول الذکر گروہ کو مزید تقسیم کریں تو یہ تعداد اپنی اپنی پسند کے فن لطیف کے حوالے سے سکڑتی نظر آئے گی۔ بدقسمتی سے فن موسیقی کا شمار بھی ایسے ہی فنون لطیفہ میں ہوتا ہے جس کی طرف ارباب نظر کی توجہ بوجوہ کم رہی ہے۔ بادی النظر میں اس کم اعتنائی کی بڑی وجہ موسیقی کو محض تفریح طبع کا وسیلہ جاننا اور اس سے وابستہ فنکاروں کو محض Entertainer یا Performer قرار دیتے ہوئے دیگر فنون مثلاً شاعری، سنگتراشی، مصوری سے وابستہ فنکاروں کے برعکس مکمل طور پر نظر انداز کر دینا ہے۔

تاریخ نویسی کے لحاظ سے اس اہم خلاء کو متقدمین سے بہتر انداز میں محسوس کرنے والا پہلا شخص عنایت خان راسخ بن شمس الدولہ لطف اللہ خان صادق بہادر مہتور جنگ مولف رسالۂ ذکر مغنیان ہندوستان بہشت نشان تھا جس نے رسالۂ مذکور کے آغاز میں ہی اس اہم نکتے پر روشنی ڈالی ہے:[1]

''....روزی بہ خاطر فاتر بندۂ عاصی عنایت خان راسخ بن شمس الدولہ لطف اللہ خان صادق بہادر مہتور جنگ

مغفور خطور نمود کہ احوال شعراء و دیگر ارباب کمال اکثر علوم در کتب تاریخ مضبوط است مگر ذکر نغمہ سرایان قدیم ہند کہ در ممالک دیگر مثل آنہا شدہ اند، مذکور نیست و موجب آن چیست ؟ بعد تفتیش بسیار منکشف گشت کہ اکثر اساتذۂ قدیم فن غناء کہ آنہان را بہ زبان ہندی تکریماً نایک می گفتند چندان کاری بہ پیرایش عبارت نداشتند ۔ بیشتر ہمت بہ صنائع آہنگ و اصول کہ عبارت از سر و تال باشد می گماشتند و مردم این گل زمین تصانیف آنہان را کہ اکثر بیش[کرم خوردہ]بود از عدم درک معانی کمتر یاد می گرفتند ۔ اکثر با خوانندگان رفت و[کرم خوردہ] نگاہی نام و نشان از صفحہء روزگار برافتاد مگر کلام متاخرین کہ کیفیت مضامین دلنشین آن نشۂ حسن صورت را دوبالا ساختہ مشہور است و نام آن طایفہ بتقریب در بعضی کتب تواریخ مذکور۔ "[2]

"نغمہ سرایان قدیم ہند" کے احوال و واقعات زندگی قلمبند کرنے والے عنایت خان راسخ کی اپنی شخصیت کے متعلق کچھ زیادہ معلومات میسر نہیں ۔منزوی نے اس کا پورا نام عنایت خان راسخ اکبرآبادی لکھا ہے۔[3] غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہرات سے ہجرت کرکے پانی پت میں آباد ہونے والے اس خاندان کے اکثر افراد علم و ادب اور تصوف سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ راسخ کے والد شمس الدولہ لطف اللہ خان صادق نیک نام، مہتور جنگ متوفی ۱۸ رمضان المبارک ۱۱۶۶ ہجری بمطابق ۲۰ جولائی [4] ۱۷۵۳ء کے چھ اور بعض روایات کے مطابق سات بیٹے تھے۔[5] راسخ کا سال ولادت عنایت نامہ، جس کا ذکر آئندہ صفحات میں ہوگا، کی ایک داخلی شہادت کی بناپر ۱۱۱۴ ہجری قرار پاتا ہے۔ اس کے اپنے الفاظ میں:

"بندہ عاصی عنایت خان راسخ بن شمس الدولہ لطف اللہ خان صادق بہادر، مہتور جنگ، درین سن عبرت آگین خود کہ سنہ یکہزار و یکصد وشت و سہ ہجری، چہل و نہ مرحلہ از مسلک زندگی طی نمودہ.......الخ"[6]

راسخ کی تاریخ وفات کے بارہ میں بھی محققین خاموش ہیں۔ پروفیسر نبی ہادی صرف died unknown لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔[7]

رسالۂ ذکر مغنیان...... کے مندرجات پر تفصیلی بات کرنے سے پہلے عنایت خان راسخ کے دیگر آثار کا ایک اجمالی تعارف کروا دینا مناسب ہوگا۔ راسخ کی مختصر فہرست آثار میں رسالۂ مذکور کے علاوہ درج ذیل کتب شامل ہیں:

۱۔ رقعات عنایت خانی: راسخ کی یہ کتاب *عنایت نامۂ نثر* کے نام سے بھی معروف ہے۔ *رسالۂ ذکر مغنیان*..... کے مرتب سید علی حیدر نیر کے بقول پٹنہ یونیورسٹی والے نسخہ کے مقدمہ میں مذکور ہے کہ:

"الحمدللہ والمنۃ کہ شاہد این امنیۃ محض بہ عنایت الٰہی چہرہ کشا گردیدہ پیرایۂ انجام یافت و بہ حسب مرجوبہ عنایت نامۂ نثر مسمی گردید۔"[8]

تاہم نیر صاحب کے تحریر کردہ کتاب ہذا کے مختصر تعارف مشمولہ رسالۂ مذکور سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ آیا کتابخانہ خدا بخش اور پٹنہ یونی ورسٹی کی لائبریری ہر دو جگہ اس کا ایک ایک نسخہ موجود ہے یا وہ پٹنہ میں موجود ایک ہی نسخہ کی بنیاد پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں؟[9] منزوی اور مارشل نے بانکی پور کے علاوہ بھی *رقعات عنایت خانی* یا *عنایت نامۂ نثر* کے مزید نسخوں کی نشاندہی کی ہے[10]

جن کا ذکر نیر صاحب نے نہیں کیا۔ اپنے منفرد موضوع اور مندرجات کے اعتبار سے یہ کتاب تاریخ برصغیر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے حد اہم ہے۔

۲۔عنایت نامہ: قدیم فارسی شعراء کے اشعار کے انتخاب پر مشتمل یہ قلمی بیاض راسخ کے ذوق مطالعہ کا عمدہ ثبوت ہے۔ چودہ ابواب اور ''مضامین مختلفہ و مطالب متنوعہ'' پر مشتمل ایک ضمیمے جسے پندرھواں باب کہنا مناسب ہوگا، سے تشکیل پانے والی یہ کتاب ۱۱۵۳ ہجری میں مکمل ہوئی اور بقول سید علی حیدر نیر ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہ ہوئی ہے۔[۱۱]

عنایت نامہ کے حوالے سے ایک قابل ذکر بات اس کے قلمی نسخوں کی تفصیل ہے۔ رسالۂ ذکر مغنیان..... کے مرتب سید علی حیدر نیر اس کے صرف ایک قلمی نسخہ مملوکہ محمد لطف علی عرف صفدر نواب مخزونہ کتابخانۂ خدا بخش، بانکی پور پٹنہ کا ذکر کرتے ہیں[۱۲] جبکہ پروفیسر نبی ہادی نے اس کے دو اور نسخوں مخزونہ عبدالسلام کلیکشن و حبیب گنج کلیکشن (کتابخانۂ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ) کی نشاندہی کی ہے۔[۱۳]

۳۔فالہائے حافظ شیرازی: ایران، افغانستان، وسطی ایشیا اور برصغیر پاک و ہند میں بالخصوص اور ان مناطق کے علاوہ جہاں کہیں بھی فارسی زبان سے محبت رکھنے والے لوگ موجود ہیں وہاں بالعموم فال حافظ کی ایک منفرد سماجی، ادبی اور معاشرتی اہمیت ہے۔ ایک اندازے کے مطابق قرآن مجید کے بعد مذکورہ بالا علاقوں میں اگر کسی کتاب کو فال کے لئے سب سے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے تو وہ دیوان حافظ ہی ہے۔ عنایت خان راسخ نے بھی اس موضوع پر ایک مختصر رسالہ قلمبند کیا تھا جس کی تفصیل سید علی حیدر نیر نے رسالۂ ذکر مغنیان..... کے مقدمہ میں دی ہے۔ آپ کے بقول ستائیس (۲۷) اوراق پر مشتمل اس رسالہ کا نام فالہا ے حافظ شیرازی ہے اور یہ کتابخانۂ خدا بخش، بانکی پور (پٹنہ) میں موجود ایک مجموعۂ رسایل کے صفحات ۱۲ ب تا ۲۹ ب پر محیط ہے۔[۱۴] راسخ کے اس رسالہ کے بارے میں بھی نام کے حوالے سے متضاد معلومات ریکارڈ پر ہیں۔ ڈی این. مارشل کے مطابق اس کا نام فالہای حافظ شیرازی جبکہ نبی ہادی کے بقول فال نامۂ حافظ شیرازی ہے۔[۱۵]

۴۔دیوان راسخ: اٹھارہویں صدی عیسوی میں دہلی کے نامور علمی و ادبی خاندان سے تعلق رکھنے والے کسی شخص سے یہ توقع رکھنا کہ وہ خود شعر نہ کہتا ہو، بڑی عجیب سی بات ہے۔ اگرچہ رسالۂ ذکر مغنیان..... کے مرتب نے تالیفات راسخ کی ذیل میں فقط عنایت نامہ، رسالۂ ذکر مغنیان...، فالہائے حافظ شیرازی اور عنایت نامۂ نثر کا ذکر کیا ہے تاہم پروفیسر نبی ہادی کے بقول راسخ کی تالیفات میں ایک دیوان شعر بھی شامل ہے۔[۱۶]

۵۔کارستان: راسخ کی دیگر تصانیف کے مقابلے میں کارستان کو اس کی نو دریافت تالیف کہنا بجا ہوگا۔ اردو حروف تہجی کی املا کے قواعد پر فارسی زبان میں لکھے گئے مختصر رسالہ کارستان کے واحد قلمی نسخے کی دریافت کا سہرا معروف محقق ڈاکٹر عارف نوشاہی کے سر ہے۔ پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں ذخیرۂ پیر زادہ محمد حسین مہمی کے فارسی مخطوطات کی فہرست مرتب کرتے ہوئے کارستان کا قلمی نسخہ انہیں دستیاب ہوا۔ اس رسالے کے دیباچے میں چھیڑے گئے لسانی نکات کو اہم پا کر موصوف نے یہ دیباچہ محترمہ شاہدہ عالم (ریسرچ سکالر، شعبہ فارسی جامعہ پنجاب) سے اپنی نگرانی میں ترجمہ کروا کر ایک فاضلانہ مقدمے کے ہمراہ مجلّہ بازیافت (تحقیقی مجلّہ شعبہ اردو جامعہ پنجاب) میں شائع کروا دیا۔[۱۷]

اٹھارہویں صدی عیسوی/ بارہویں صدی ہجری میں فارسی اور ہندی حروف تہجی کی املا کے حوالے سے درپیش مسائل کے

تجزیے اور حل کے لئے کی جانے والی مساعی سے مطلع ہونے کے لئے اس رسالے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ راسخ نے *کارستان* کی وجہ تالیف بتاتے ہوئے اپنی ایک اور تصنیف کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اس کے بقول اس نے "ہندی کبت پر مشتمل ایک کتاب *سدھاسروور* تالیف کی تھی جس میں مثالیں بھاکھا برج کے اشعار میں تھیں۔"[۱۸] برصغیر خصوصاً راسخ کے جائے قیام متھرا (یو۔ پی) میں مستعمل ہندی آوازوں کی ادائیگی کے لئے فارسی حروف تہجی میں اصوات موجود نہ تھیں۔ لہٰذا مولف نے اپنی مذکورہ بالا تصنیف *سدھاسروور* کی صحیح خوانی ممکن بنانے کے لئے *کارستان* نامی رسالہ تصنیف کیا جس میں اس دور کے متداول حروف تہجی اور اعراب میں بعض ترامیم اور چند نئے حروف و اعراب کے اختراع کی کوشش کی گئی ہے۔

مندرجہ بالا محدود معلومات کی بنا پر عنایت خان راسخ کی شخصیت متنوع دلچسپیوں کا خوبصورت مرقع دکھائی دیتی ہے۔ قدیم شعراء کے معروف اشعار پر مبنی بیاض کی تشکیل، فالنامۂ حافظ کی ترتیب، مختلف کتب سے موسیقاروں کے احوال و اذکار کی جمع و تدوین، تیموریان ہند کے حوالے سے رقعات نویسی اور ان سب پر مستزاد ایک دیوان شعر؛ پروفیسر نبی ہادی کی یہ رائے کہ:

His exuberent wit and creative ability gathered a large number of pupils and literary friends around him.[۱۹]

صائب معلوم ہوتی ہے نیز یہ قیاس بھی حقیقت سے چنداں دور نہ ہوگا کہ راسخ اپنے دور میں علوم و فنون کے حوالے سے دہلی کی ممتاز شخصیات میں شمار ہوتا ہوگا۔

☆☆☆

رسالۂ ذکر مغنیان ہند...... برصغیر کی موسیقی کے حوالے سے ایک دلچسپ دستاویز ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مولف نے موسیقی کے علمی یا فنی پہلوؤں سے اجتناب کرتے ہوئے خود کو صرف فن موسیقی سے وابستہ فنکاروں کے احوال و اذکار تک محدود رکھا ہے نیز اس رسالہ میں درج بیشتر معلومات یا واقعات "بعض کتب تواریخ" سے مستعار لے کر درج کی ہیں۔
نایک بیجو، نایک گوپال، امیر خسرو، نایک بخشو، تان سین، لعل خان، خوشحال و بسرام، بابا رام داس بیراگی و نایک دھوندو، سلطان حسین شرقی، باز بہادر و روپ متی، شیخ شیر محمد و شیخ کبیر، شیخ معین الدین، ذوالقرن، بدھ سنگھ اور نعمت خان جیسی شخصیات کے ذکر پر مشتمل *رسالۂ ذکر مغنیان ہند*...... کے مندرجات کے لئے مولف کا بیشتر انحصار *شاہجہان نامہ* اور *مرآۃ سکندری* پر ہے تاہم دیگر کتب تاریخ و تذکرہ مثلاً *خلاصۃ العیش عالم شاہی*، *مرآۃ آفتاب نما* اور *صوت الناقوس* سے مستفاد جملات و عبارات بھی رسالۂ مذکور میں ملتی ہیں۔ مصحح نے اسی حقیقت کے پیش نظر مقدمہ کے متصل بعد ان تمام کتب کے متعلقہ حصے بعینہ درج کر دیے ہیں۔[۲۰]
راقم کی دسترس میں موجود ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی (پٹنہ) سے شائع شدہ *رسالۂ ذکر مغنیان ہندوستان بہشت نشان* کے متن پر تاریخ اشاعت درج نہیں تاہم اکثر محققین اسے مطبوعہ ۱۹۶۱ء لکھتے ہیں۔[۲۱] بعض نے تو اس کے اردو ترجمہ کا بھی ذکر کیا ہے مگر ایسا شاید کسی تسامح کی بنا پر ہے۔[۲۲]
برصغیر کی موسیقی کے ایک اہم ستون نعمت خان سدارنگ کے حوالے سے بھی *رسالۂ ذکر مغنیان*.....کی خاص اہمیت ہے۔ سطور بالا میں اشارہ ہو چکا ہے کہ راسخ نے مغنیان ہند کا ذکر کرتے ہوئے ترتیب زمانی کو ملحوظ رکھا۔ اس بنا پر اٹھارویں صدی عیسوی کی چوتھی دہائی میں وفات پانے والے اس عظیم گائیک کو بجا طور پر مولف کا ہمعصر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس امر کی تائید یوں بھی ہو جاتی ہے کہ زمانی

ترتیب کے مطابق سدا رنگ کا ذکر رسالہ کے آخر میں آیا ہے جس کے بعد ایک رباعی اور ترقیمہ پر یہ رسالہ ختم ہو جاتا ہے۔

تاریخ موسیقی برصغیر پاک و ہند پر نظر رکھنے والے اصحاب جانتے ہیں کہ نعمت خان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا۔ عین ممکن ہے کہ ایک ہی دور میں دہلی، جو آج کل کے دہلی کے مقابلے میں کہیں چھوٹا شہر ہوگا، میں قیام پذیر ہونے کے باعث راسخ اور نعمت خان کی ایک دوسرے سے ملاقات بھی رہی ہو۔ تاہم اس کا کوئی مستند حوالہ ریکارڈ پر نہیں۔ راسخ نے اپنے ہمعصر کا ذکر نہایت اچھے الفاظ میں کیا ہے:

> ''درین اخیر دوران مثل نعمت خان علیہ الرحمۃ والغفران، صاحب کمال در فن موسیقی نبود بلکہ در ما یکہا ی سلف ہم باین جامعیت نشدہ۔ در بین نوازی خود وصف او مافوق بیان است و در خواندن دھرپد و خیال و ترانہ ہم قصب السبق از مغنیان روزگار می ربود و اقسام خیال و ترانہ باعتبار نازکی طرز و پختگی کلام در مرتبۂ اعلیٰ تصنیف می نمود.....الخ'' [۲۳]

سدا رنگ کے فن پر اس سے زیادہ جامع اور بھرپور تبصرہ کسی اور کتاب میں شاذ ہی ملے گا۔ تاہم واضح رہے کہ راسخ نے اپنی تحریر میں موصوف کو فقط نعمت خان لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ اس کے تخلص ''سدا رنگ'' کے ذکر سے عمداً یا سہواً اجتناب محققین کے لئے توجہ طلب ہے۔

رسالۂ ذکر مغنیان..... کے محولہ بالا منحصر بفرد نسخہ [۲۴] کی تصحیح قیاسی از سید علی حیدر نیر کا بغور مطالعہ اس ایڈیشن میں موجود کئی خامیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ مصحح نے کتابیات میں جن کتب کے نام دیے ہیں ان میں مطبوعہ کتب کم اور صرف بانکی پور میں موجود قلمی نسخوں کا ذکر زیادہ ہے۔ کتاب میں شامل اقتباسات اگر ان کتب کے تصحیح شدہ و مطبوعہ ایڈیشنوں سے لیے جاتے تو کتاب کی اہمیت دوچند ہو سکتی تھی۔ پروف خوانی کی بعض غلطیاں جیسا کہ *صوت الناقوس* کو *ناقوس الصوت* لکھ دینا (ص ۸۰) بھی مصحح کی کم توجہی پر صاد ہے۔ اگر کوئی ادارہ اٹھارویں صدی عیسوی تک برصغیر کے منتخب موسیقاروں کے اس مختصر تذکرہ کی از سر نو تدوین و پیشکش کا بیڑا اٹھا لے تو یہ ہماری موسیقی کی بڑی خدمت ہوگی۔

حواشی

۱۔ برصغیر پاک و ہند کے فارسی ادب کا ایک عمومی جائزہ اس بات کا شاہد ہے کہ تقریباً ہر دور کے مورخین، تذکرہ نگار یا دیگر مصنفین اپنی تالیفات میں فن موسیقی اور اس سے وابستہ فنکاروں کا ذکر بجا طور پر کرتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں *اکبرنامہ* از ابوالفضل، *راگ درپن* از فقیر اللہ سیف خان اور *تحفۃ الہند* از مرزا محمد ابن فخر الدین فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ تاہم راقم کے محدود مطالعہ کے مطابق موسیقاروں کے احوال زندگی اور ان کی شخصیت سے وابستہ واقعات کے حوالے سے فارسی زبان میں ایک مستقل کتاب قلمبند کرنے والا پہلا شخص عنایت خان راسخ ہی ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں اردو، ہندی اور انگریزی زبان میں اس موضوع پر چند کتب مزید لکھی گئیں جن کے اجمالی تعارف کے لئے استاد بدر الزماں کی کتاب *سدا رنگ* مطبوعہ لاہور ۱۹۹۸ء میں شامل جناب رشید ملک کا پیش لفظ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ نیر، سید علی حیدر (مصحح و مرتب)، *رسالۂ ذکر مغنیان ہندوستان بہشت نشان*، مطبوعہ ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، بہار (پٹنہ)، سال اشاعت ندارد، ص ۵ (متن)

۳۔ منزوی، *فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان*، (جلد پنجم)، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ص ۳۱۲۔ ۳۱۳

۴۔ نیر، ایضاً، ص ۵ (شرح احوال مولف)

۵۔ ایضاً، ص ۶

۶۔ ایضاً، ص ۷

۷۔ Nabi Hadi, *Dictionary of Indo-Persian Literature*, Delhi 1995, p. 257

۸۔ نیر، ایضاً، ص ۱۲

۹۔ نیر، ایضاً، ص ۱۱ و ۱۲

۱۰۔ (ا): منزوی، *فہرست مشترک نسخہ ہای خطی در پاکستان*، (جلد پنجم)، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ص ۳۱۲ ۔ ۳۱۳
(ب): مارشل، ڈی۔این، *مغلز ان انڈیا* (انگریزی)، لندن ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۵

۱۱۔ نیر، ایضاً، ص ۹ و ۱۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۸ و ۹

۱۳۔ Nabi Hadi, *ibid.* , p.664

۱۴۔ نیر، ایضاً ، ص ۱۰

۱۵۔ (i) Marshall, D.N., *Mughals in India,* London 1967, p. 205
(ii) Nabi Hadi, *ibid.*, p. 258

۱۶۔ Nabi Hadi, *ibid.*, p. 258

۱۷۔ عارف نوشاہی و شاہد ہ عالم (مرتبین)، دیباچہ *کارستان*، مجلہ بازیافت، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، شمارہ ۴، ص ۹۷ تا ۱۱۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۹۷

۱۹۔ Nabi Hadi , *ibid.* , p. 257

۲۰۔ نیر، ایضاً، صفحات ۱۳ تا ۵۸

۲۱۔ محمد اسلم، پروفیسر، *شاہان مغلیہ کا ذوق موسیقی* (مقالہ)، مشمولہ *تاریخی مقالات*، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۲ تا ۱۷۷

۲۲۔ ممتاز محقق رشید ملک نے *راگ درپن کا تنقیدی جائزہ*، مطبوعہ لاہور ۱۹۹۸ء، ص ۵۲۰ پر ڈاکٹر نجمہ پروین احمد کی کتاب *ہندوستانی میوزک* (انگریزی)، مطبوعہ دہلی ۱۹۸۴ء کے حوالہ سے *رسالۂ ذکر مغنیان ہندوستان بہشت نشان* سے ایک اقتباس درج کرتے ہوئے اسکا اردو ترجمہ ۱۹۶۱ء میں پٹنہ سے شائع ہونا بتلایا ہے ۔ تاہم ڈاکٹر نجمہ کی محولہ بالا کتاب میں الیس ۔ اے ۔ حیدر نیر کے ہاتھوں فقط اس کی تدوین و اشاعت ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے ۔

۲۳۔ نیر، ایضاً، ص ۳۰ (متن)

۲۴۔ مصحح سید علی حیدر نیر بقول اس کا واحد قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں سیریل نمبر ۳۵ ۔ ۱۷۴۳ کے تحت محفوظ ہے ۔ تیس (۳۰) اوراق پر مشتمل اس مخطوطہ کی دیگر تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: نیر، ایضاً، ص ۲ (مقدمہ)

خطِ نستعلیق، عبدالمجید پرویں رقم اور ان کی روشِ خطاطی

محمد راشد شیخ

خطِ نستعلیق اور اس کا آغاز

خطِ نستعلیق کے آغاز سے متعلق مؤرخین میں عام طور پر دو آرا پائی جاتی ہیں۔ پہلے گروہ کا خیال ہے کہ خطِ نستعلیق کے موجد ومخترع میر علی تبریزی (وفات ۸۵۰ھ) ہیں۔ اس بارے میں سلطان علی مشہدی کے یہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

''نسخ تعلیق اگر خفی و جلی است
واضع الاصل خواجہ میر علی است
وضع فرمودہ او ز ذہن دقیق
از خط نسخ و از خط تعلیق''[1]

بعض محققین کے نزدیک خطِ نستعلیق میر علی تبریزی سے پہلے موجود تھا۔ میر علی تبریزی اس خط کے موجد ومخترع نہیں بلکہ انھوں نے اس کے اصول وقواعد وضع کیے اور اسے مزید جمال عطا کیا۔

انھی محققین میں ترکی کے نامور ماہر خطاطی ڈاکٹر نہاد چیتن بھی شامل ہیں۔ وہ اپنی محققانہ تالیف The Art of Calligraphy in the Islamic Heritage میں لکھتے ہیں:

''ایک اور خط جس کا ارتقا ایران میں ہوا، خطِ نستعلیق کہلاتا ہے۔ یہ خط طویل عرصے تک ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد موجودہ شکل میں سامنے آیا۔ ابوالفرج الاصفہانی (وفات ۳۵۶ھ) کی ''کتاب الاغانی'' کے ایک اقتباس سے پتہ چلتا ہے اس سے ملتا جلتا خط ''خطِ تعلیق'' اس کے عہد میں موجود تھا۔ البتہ دستاویزی شہادتوں سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اس خط کا آغاز ساتویں صدی ہجری سے ہوا۔ اس خط نے اپنی تکمیلی شکل نویں صدی ہجری کے آغاز میں ایران میں حاصل کی۔ بعض مورخین کی رائے کے مطابق اسے میر علی تبریزی نے ایجاد کیا۔ وہ اس خط کی ایجاد کا سال ۸۴۳ھ بھی بیان کرتے ہیں۔ درحقیقت میر علی نے اس خط کو مزید نکھارا اور اس کے بعد یہ ایک تسلیم شدہ خط بن گیا جو اصول وقواعد کی بنا پر موجود تھا۔[2] (ترجمہ از انگریزی)

اس بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خط نستعلیق میر علی تبریزی سے پہلے موجود تھا۔ تقریباً یہی رائے ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' میں پیش کی ہے۔

جمال خط نستعلیق

برصغیر پاک و ہند اور ایران میں سب سے زیادہ رائج اور پسندیدہ خط نستعلیق ہی ہے۔ فارسی اور اردو زبان لکھنے کے لیے یہی خط رائج ہے۔ خط نستعلیق کے محاسن اور جمالیاتی پہلوؤں کے حوالے سے ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں:

> ''طرز نستعلیق میں ہر حرف کے لکھنے کے لیے ایک خاص اصول اور گرد و نواح کی پابندی لازمی ہے۔ ورنہ یہ سب عمل بے ربط ہو جائے گا، یعنی تختی یا کاغذ پر متوازی مساوی الفاصلہ لکیریں کھینچ کر ہر حرف کو لکھا جاتا ہے اور ان اصولوں کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ اس سے ہر حرف خود بخود صاف اور متمیز صورت میں اپنے مقام پر بصورت دائرہ، مد، کشش وغیرہ اپنی شکل اختیار کر لیتا ہے۔''[۳]

خط نستعلیق کی خوبیوں اور خصوصیات کے بارے میں ہمارے ملک کے نامور خطاط سید نفیس الحسینی مدظلہ لکھتے ہیں:۔

> ''خط نستعلیق بابر بادشاہ کے ساتھ برصغیر میں وارد ہوا۔ لکھنے پڑھنے میں صاف اور واضح ہونے کی وجہ سے آتے ہی مقبول ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ کم سے کم جگہ میں جلی سے جلی لکھا جا سکتا ہے..... خط نسخ کا پھیلاؤ عرض میں نسبتاً بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نستعلیق کے مقابلے میں جگہ اور وقت زیادہ لیتا ہے۔''[۴]

پاک و ہند میں نستعلیق

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، برصغیر پاک و ہند میں خط نستعلیق بابر کے عہد میں آیا۔ بابر خود بھی خطاط اور ایک مخصوص خط ''خطِ بابری'' کا موجد تھا۔ خط بابری کو تو یہاں قبول عام حاصل نہ ہو سکا بلکہ وہ وقت گزرنے کے ساتھ ناپید ہو گیا۔ جبکہ خط نستعلیق کو نہ صرف قبول عام حاصل ہوا بلکہ بابر کی اولاد، یعنی بعد میں آنے والے مغل بادشاہوں نے اس خط کی خوب سرپرستی کی۔

عہد شاہ جہان میں میر عماد الحسنی کو ایران میں شہید کر دیا گیا۔ میر عماد کے بھانجے اور داماد عبدالرشید دیلمی ایران سے جان بچا کر پہلے لاہور اور پھر آگرہ پہنچے جہاں دربار شاہی میں عرض داشت پیش کی۔ شاہ جہان کی جانب سے عرض داشت منظور ہو گئی اور عبدالرشید دیلمی ۱۰۵۰ھ میں دربار شاہی میں بطور شاہی خطاط منسلک ہوا۔[۵] عبدالرشید دیلمی کی آمد کے بعد برصغیر پاک و ہند میں خط نستعلیق کو خاص فروغ حاصل ہوا۔ ان کے تلامذہ کے زیر اثر فن خطاطی کے تین دبستان قائم ہوئے یعنی (۱) دبستان لاہور (۲) دبستان دہلی (۳) دبستان لکھنو۔

دبستان لاہور کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز معروف نستعلیق نگار امام ویردی (م ۱۸۸۰ء) سے ہوتا ہے۔ ان کے تلامذہ میں مولوی سید احمد ایمن آبادی اور احمد علی کشمیری مشہور خوش نویس تھے۔ مولوی سید احمد ایمن آبادی کے فرزند خلیفہ نور احمد کے تلامذہ میں خطاط مشرق عبدالمجید پرویں رقم مرحوم تھے جو نہ صرف ایک بلند پایہ نستعلیق نگار تھے بلکہ لاہوری طرز نستعلیق کے موجد بھی تھے۔

احوال و آثار عبدالمجید پرویں رقم

عبدالمجید پروین رقم ۱۰۹۱ء میں ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب سات واسطوں سے مولوی حافظ محمد عارف خوشنویس عہد مغلیہ سے ملتا ہے۔ اس خاندان کے بعض خطاطوں کو مغل شہزادوں کے معلم خطاطی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔[۶] انھوں نے خطاطی کی ابتدائی تعلیم ایمن آباد ہی میں حافظ خلیفہ نور احمد فرزند مولوی سید احمد ایمن آبادی سے حاصل کی۔ بعد ازاں آپ ایمن آباد سے لاہور آ گئے اور ایرانی طرز نستعلیق میں کمال حاصل کیا۔ لاہور میں آپ کا قریبی تعلق حکیم فقیر محمد چشتی (وفات ۱۶/ اکتوبر ۱۳۹۷ء) سے قائم ہوا جو شاعری، مصوری اور خطاطی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ حکیم صاحب کی صحبت اور مسلسل غور و خوض کے نتیجے میں پروین رقم نے مروجہ ایرانی طرز نستعلیق میں نہایت دلکش ترامیم کیں جس کے نتیجے میں ''لاہوری طرز نستعلیق'' وجود میں آیا۔ اس طرز کو قبول عام حاصل ہوا۔ آگے ہم اس طرز نستعلیق کی بعض تفصیلات پیش کریں گے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ کسی بھی خط میں تبدیلی کا عمل تدریجاً ہوتا ہے یک دم نہیں۔ طرز نستعلیق لاہوری میں بھی یہی ہوا۔ اس کے بعد بھی پروین رقم اس طرز میں مزید بہتری اور خوبیاں پیدا کرتے رہے۔ جیسا کہ آگے حروف ابجد کی دو تختیوں سے واضح ہوگا۔

عبدالمجید پروین رقم کے فنی سفر کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے خط نستعلیق میں مہارت اور اسے خوب سے خوب تر لکھنے میں تمام صلاحیتیں صرف کیں۔ ابتدا میں وہ ایرانی طرز میں نستعلیق لکھتے تھے اور اس طرز میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ اس دور میں وہ اپنی کتابت کردہ کتب کے آخر میں عبدالمجید خوش رقم لاہوری لکھتے تھے۔ ۱۹۲۸ء سے انھوں نے طرز جدید میں خطاطی کا آغاز کیا۔ اسی برس آپ کو 'پروین رقم' کا خطاب معروف عالم اور محقق مولانا غلام رسول مہر نے عطا کیا۔[۷] ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۶ء تک آپ کی کتابت کردہ کتب، قطعات وغیرہ کے ساتھ ''عبدالمجید پروین رقم'' لکھا موجود ہے۔

عبدالمجید پروین رقم کا انتقال ۴/ اپریل ۱۹۴۶ء کو لاہور میں ہوا۔ ۴۶ برس کی مختصر عمر میں آپ نے خط نستعلیق کا جو بلند معیار پیش کیا۔ لاہوری طرز میں اس معیار تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ آپ کی کتابت کردہ خوبصورت کتب میں علامہ اقبال کے دواوین، دیوان گرامی، رباعیات گرامی، بیاض آزاد، خمکدہ خیام، اقبال از احمد دین و دیگر کتب پر آپ کا خط آج بھی دعوت نظارہ دیتا ہے۔ ان کے خوبصورت خط کے بارے میں بالکل درست کہا گیا کہ جب بھی اسے دیکھیں ناظر کی آنکھوں میں جنت نظر کا سماں بندھ جاتا ہے۔ جن معروف اخبارات و رسائل کی پیشانیاں پروین رقم نے اپنے خوبصورت خط میں لکھیں ان میں نوائے وقت، انقلاب، سیاست، پرتاپ، مساوات (امرتسر)، ادبی دنیا، ہمایوں، عالمگیر، شاہکار، اورینٹل کالج میگزین، بیسویں صدی، افسانہ، صوفی، فیض عالم، قوس قزح، الطبیب، ساربان، اشاعت اسلام وغیرہ شامل ہیں۔[۹]

پروین رقم کے صاحبزادے اقبال ابن پروین رقم بھی اپنے والد کی طرح ایک ماہر نستعلیق نگار تھے۔ علامہ اقبال کے مزار کی اندرونی چھت پر اقبال ابن پروین رقم کے خوبصورت خط میں علامہ کی فارسی نظم قائم دید ہے۔

علامہ اقبال اور پروین رقم

شاعر مشرق علامہ اقبال اپنی کتابوں کی کتابت اور خطاطی پر بھی خاص توجہ دیتے تھے۔ ان کی زندگی میں ان کے کلام کے جتنے مجموعے شائع ہوئے تقریباً تمام کی کتابت کا اعزاز پروین رقم کو حاصل ہوا۔[۱۰] علامہ اقبال نے اپنے ایک خط میں پروین رقم کو لاہور کا بہترین کاتب قرار دیا۔[۱۱]

کلام اقبال اردو و فارسی کے دواوین علامہ اقبال کی زندگی میں اور اس کے بعد بھی طویل عرصے تک پروین رقم کے خوبصورت خط میں شائع ہوئے۔ ان کتابوں میں خطاطی تو نہایت اعلیٰ درجے کی ہے لیکن اس عہد میں طباعت کا طریقہ نہایت ناقص، یعنی لیتھو کا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں فرزند اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال نے جب جدید آفسٹ طریقے سے کلام اقبال کی اشاعت کرائی تو اس کی کتابت کے لیے پروین رقم کے شاگرد محمود اللہ صدیقی مرحوم کی خدمات حاصل کیں۔ کلیات اقبال کے اس ایڈیشن کی ابتدا میں جاوید اقبال تحریر فرماتے ہیں:۔

''علامہ اقبال نے کتابت کے لیے جو خاص اہتمام ملحوظ رکھے تھے ان کا اندازہ کچھ اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔ اس دور کے بہترین خوش نویس جناب صوفی عبدالمجید صاحب پروین رقم کے اعجاز اور علامہ کے شوق کی بدولت حسن کتابت وطباعت کا جو مرقع تیار ہوا تھا اس کا مثیل تو میرے لیے ممکن نہ تھا تاہم میں نے تا بہ مقدور کوشش کی ہے کہ جدید کتابت وطباعت شاعر مشرق کے کلام کے شایان شان ہو۔'' [۱۲]

اس کے بعد اقبال اکیڈمی لاہور نے کلیات اقبال اردو شائع کی جس کی کتابت جمیل احمد قریشی تنویر رقم سے کرائی۔ اس کلیات کے مقدمے میں ماہر اقبالیات پروفیسر مرزا محمد منور تحریر فرماتے ہیں:۔

''.....اقبال نے اپنے مجموعوں کی کتابت میں بھرپور دلچسپی لی کیونکہ خراب کتابت شاعری کے حسن کو دھندلا کر دیتی ہے۔ ہمارے سامنے بھی اہم ترین مسئلہ یہی تھا کہ خوشنویسی کا وہ معیار کیوں کر برقرار رکھا جائے جو استاد یگانہ مرحوم عبدالمجید پروین رقم قائم کر گئے ہیں [۱۳]۔''

عبدالمجید پروین رقم کی روشِ نستعلیق

عبدالمجید پروین رقم لاہوری طرز نستعلیق کے موجد ومخترع ہیں۔ اس مخصوص طرز میں انھوں نے حروف کی شکلوں، پیوندوں کی ساخت وپرداخت میں جو خوبصورتی پیدا کی، اس کے بعد نستعلیق کو قدیم طرز سے زیادہ خوبصورتی حاصل ہوئی۔ اس طرز کو پروین رقم کے معاصرین اور بعد میں آنے والے خطاطوں نے اختیار کیا اور اب بھی زیادہ تر خطاط اس طرز میں نستعلیق نگاری کرتے ہیں۔

کسی مخصوص طرز خطاطی میں کی گئی اصلاحات کو الفاظ میں بیان کرنے سے بات پوری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس خط کے قدیم وجدید نمونوں کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ یہاں ہم طرز نستعلیق میں کی گئی اصلاحات کی بعض تفصیلات پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد پروین رقم کی طرز قدیم اور طرز جدید کے بعض نمونے پیش کریں گے جن سے تفہیم میں آسانی ہوگی۔ وضاحت کے لیے جو حروف پیش کیے ہیں وہ پروین رقم ہی کے خط میں ہیں۔

مفردات میں پروین رقم نے درج ذیل اصطلاحات کیں:

نقطہ: قدماء کے ہاں نستعلیق کا نقطہ چپٹا ہے۔ پروین رقم نے اس میں ذرا سا خم پیدا کیا جس سے نقطے میں ایک نئی رعنائی پیدا ہو گئی۔

خم

◆

دائرہ دار حروف: قدما کے ہاں دائرہ تین قط گہرا ہے۔ پرویں رقم نے اسے ساڑھے تین قط گہرا کر دیا نیز دائرے کے آخری شوشے کو ذرا اٹھا کر اس میں نئی شکل پیدا کی۔

آخری شوشہ

ج ل ن ی

یہاں دائرے دار حروف کی گہرائی ساڑھے تین قط ہے۔

س، ش: پرویں رقم نے اس کے دندانوں میں خم پیدا کیا۔ مروج س یا ش کے دائرے کے آغاز میں پیوند کو ذرا بھاری کیا۔

دندانوں میں خم — س ش — بھاری پیوند

ص: ص کے شروع والے حصے کو پرویں رقم نے ذرا خمیدہ کیا۔ دائرے کے آغاز والے پیوند کو حسب سابق ذرا بھاری کیا۔

ابتدائی حصہ خمیدہ
ص بھاری پیوند

ع: ع کے انتہائی بلند حصے میں ذرا سا خم دیا۔اس کے علاوہ صادی شوشے کے بعد عام نقطے کے بجائے نقطہ مدورہ لکھا۔

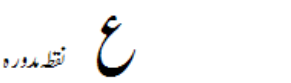

ف،ق،و: ان تینوں حروف کا ابتدائی حصہ نقطۂ مدورہ بنتا ہے۔نقطۂ مدورہ کو اوپر سے گھمانے سے قلم کی ایک فطری خمیدگی بنتی ہے جسے پرویں رقم سے پہلے خطاط قلم سے گول کر دیا کرتے تھے۔پرویں رقم نے اس فطری خمیدگی کو برقرار رکھا۔اس کے علاوہ ق کے دائرے کو دیگر دائرے دار حروف کی طرح ساڑھے تین قط گہرا کر دیا۔

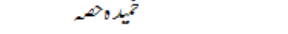

ہ،ھ: ہ،ھ وغیرہ کی ابتدائی، درمیانی اور آخری شکلیں خط نستعلیق میں مختلف ہیں۔انھیں پرویں رقم نے جو خوبصورتی عطا کی اس کے بعد اب شاید ہی ان حروف میں کوئی مزید خوبصورتی پیدا کر سکے۔

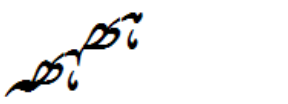

مفردات کی طرح مرکبات میں بھی پرویں رقم نے جوڑوں اور پیوندوں میں خوبصورت ترامیم کیں۔ایرانی طرز نستعلیق

میں جوڑ اور پیوند باریک اور ہلکے ہیں۔وقتی ضرورتوں کے تحت پرویں رقم نے انھیں ذرا بھاری اور مزید جاذب نظر بنادیا۔[۱۱]

آخر میں ہم عرض کریں گے کہ فن خطاطی کی تاریخ میں کئی مصلحین آئے اور انھوں نے مروجہ خطوط میں حسن و جمال کے نئے نئے اضافے کیے لیکن جتنی کم عمر میں پرویں رقم مرحوم نے جو بلند معیار پیش کیا اور جس قدر انھوں نے اپنی روشِ نستعلیق سے معاصرین اور بعد کے خطاطوں کو متاثر کیا، اس کی مثال تاریخ خطاطی میں مشکل ہی سے ملے گی۔

پرویں رقم کے انتقال کے بعد پیر غلام دستگیر نامی نے یہ قطعہ تاریخ کہا:

چو عبدالمجید از جہاں کرد رحلت
بگفتم کہ شد خویش قلم از جہانے
ز تاریخ فوتش چو پرسند نامی
''بگو رفت پرویں رقم از جہانے''

۱۳۶۵ھ

حواشی

۱۔ ملاحظہ فرمایئے ''سرگزشت خط نستعلیق'' از ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، کتاب خانہ نورس لاہور، ص ۶، س ن

۲۔ ملاحظہ فرمایئے ڈاکٹر نہاد چیتن کا محققانہ مضمون The Rise and Development of the Art of Calligraphy. در کتاب The Art of Calligraphy in the Islamic Heritage Research Center for Islamic Hustory, Art and Culture, Islamabad,1998, p-30

۳۔ ''سرگزشت خط نستعلیق''، ص ۱۷

۴۔ ملاحظہ فرمایئے ''مقالات خطاطی حضرت سید نفیس الحسینی شاہ مدظلہ'' مرتبہ حافظ سید انیس الحسن و محمد راشد شیخ، ناشران خاوران لاہور، ص ۷۹، اشاعت اول ۲۰۰۶ء

۵۔ میر عماد الحسنی کی شہادت اور عبدالرشید دیلمی کی آمد کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں ''پاک و ہند میں اسلامی خطاطی'' از ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، لاہور، ۱۹۷۶ء، صفحات ۵۴ تا ۶۷

۶۔ بحوالہ ''حواشی گنجینۂ گوہر'' از محمد عالم مختار حق، ماہنامہ الرشید لاہور، اکتوبر ۱۹۹۴ء، ص ۸۱

۷۔ عبدالمجید پرویں رقم نے طرز جدید فن خطاطی کے بنیادی اصولوں اور قواعد کے دائرے میں رہتے ہوئے اختیار کی۔ یہاں یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ پرویں رقم اور مصورانہ خطاط شاکر علی کی کبھی ایسی ملاقات نہیں ہوئی جس کے نتیجے میں روشنائی کی دوات کلر بکس میں اور کاغذ کینوس میں تبدیل ہوا ہو۔ یہ محض افسانہ ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں (ملاحظہ فرمایئے مخزن شمارہ ۷، ص ۹۹)

۸۔ بحوالہ حواشی گنجینۂ گوہر، ص ۸۱

۹۔ جناب محمد عالم مختار حق تقریباً نصف صدی سے عبدالمجید پرویں رقم کے فنی آثار پر تحقیق کر رہے ہیں۔ ان کی مرتبہ ''نوادر پرویں رقم'' کی دو قسطیں ماہنامہ الرشید لاہور بابت اپریل ۱۹۹۵ء اور جولائی ۱۹۹۶ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے خطاطوں میں کسی خطاط کے فنی آثار کی کھوج اور تلاش سے متعلق اس طرح کی یہ پہلی تحقیق ہے۔

۱۰۔ علامہ اقبال کی زندگی میں کلام اقبال کی ہر کتاب کے ہر ایڈیشن کے لیے نئی کتابت کرائی جاتی تھی۔ ان میں سے ہر ایڈیشن میں علامہ ترمیم و

اضافات بھی کرتے۔ ''اسرارِ خودی'' کے پہلے ایڈیشن کی کتابت منشی فضل الٰہی مرغوب رقم نے کی۔ اس کتاب کے بعد ''رموزِ بے خودی'' کے پہلے ایڈیشن (۸۱۹۱ء) سے پرویں رقم نے کلامِ اقبال کی کتابت کا آغاز کیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۸۱ برس تھی۔ اس کے بعد علامہ کی ہر کتاب اور اس کے مختلف ایڈیشنوں کی کتابت پرویں رقم نے کی۔ ''ارمغانِ حجاز'' علامہ اقبال کے انتقال کے بعد چھپی جس کی کتابت بھی پرویں رقم ہی نے کی۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں ''تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ'' از رفیع الدین ہاشمی، اقبال اکیڈمی لاہور، ۲۸۹۱ء

۱۱ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں ''علامہ اقبال کے غیر مطبوعہ رقعات بنام پرویں رقم'' از رفیع الدین ہاشمی، سہ ماہی اقبال ریویو لاہور، جنوری ۱۹۸۴ء، ص ۲۱۸۔ یہ مضمون ہاشمی صاحب کی کتاب ''اقبالیات۔ تفہیم و تجزیہ'' مطبوعہ ۲۰۰۴ء میں بھی شامل ہے۔

۱۲ ''کلیاتِ اقبال اردو'' مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۲ء۔ محمود اللہ صدیقی مرحوم نے کلیاتِ اقبال اردو اور کلیاتِ اقبال فارسی دونوں کی جدید کتابت کی۔ انھوں نے کتابت کردہ سرخیوں اور اشعار میں الفاظ کی بعینہٖ وہی نشست رکھی ہے جو ان کے استاد عبدالمجید پرویں رقم نے رکھی تھی۔

۱۳ ''کلیاتِ اقبال اردو'' اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۔ پرویں رقم کے بھانجے جمیل احمد قریشی کی کتابت کردہ یہ کلیاتِ اقبال لاہوری طرزِ نستعلیق میں نہیں بلکہ ایرانی طرزِ نستعلیق سے مماثل خط میں ہے۔ انھوں نے اقبال اکادمی کے لیے صرف اردو کلیاتِ اقبال کی کتابت کی۔ کلیاتِ اقبال فارسی کی کتابت ایرانی کاتب نے کی۔

۱۴ پرویں رقم کی اصلاحات کی بعض تفصیلات کے لیے ہوئے معروف خطاط حافظ محمد یوسف سدیدی مرحوم کے ایک غیر مطبوعہ انٹرویو سے استفادہ کیا ہے۔ یہ انٹرویو غلام نظام الدین مرولوی نے لیا تھا۔

اگلے صفحات میں عبدالمجید پرویں رقم کی روشِ نستعلیق
کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں

انتخاب میر تقی میرؔ (دیوان اول)

امجد اسلام امجد

خدائے سخن میر تقی میرؔ کا انتخاب بھی ان کے کلام کی طرح بھاری بھرکم ہے۔سو پہلی قسط کے طور پر صرف ان کے دیوان اول کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔انتخاب کلام کا تعلق چونکہ انتخاب کنندہ کی ذاتی پسند، ناپسند، ذوق شعر اور ترجیحات کا پابند ہوتا ہے اس لیے اس میں اختلاف کے پہلو یقیناً نکل سکتے ہیں۔

میرا یہ انتخاب بنیادی طور پر اس اصول کے تابع ہے کہ میر تقی میرؔ کے کون سے اشعار ایسے ہیں جو آج بھی اپنی کسی مخصوص خوبی کے باعث ''زندہ'' کہے جا سکتے ہیں اور زندہ سے میری عمومی مراد یہ ہے کہ اگر یہ اشعار آج یعنی دو ڈھائی سو سال بعد بھی لکھے جاتے تو شاید کم و بیش اسی طرح سے لکھے جاتے۔

جانا نہیں کچھ جز غزل آ کر کے جہاں میں — کل میرے تصرف میں یہی قطعہ زمیں تھا

اس کا منہ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں — نقش کا سا ہے سماں میری بھی حیرانی کا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات؟ — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا — حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

آگ سی سینے میں سلگے ہے کبھو بھڑکی تو میرؔ — دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

اس سیم بدن کو تھی کب تاب تعب اتنی — وہ چاندنی میں شب کی ہوتا تو پگھل جاتا

کم فرصتی جہاں کے مجمع کی کچھ نہ پوچھو — احوال کیا کہوں میں اس مجلس رواں کا

رہ گزر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد، دہر
اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا

گور مجنوں سے نجاویں گے کہیں ہم بے نوا
عیب ہے ہم میں جو چھوڑیں ڈھیر اپنے پیر کا

اگتے تھے دست بلبل و دامانِ گل بہم
صحن چمن نمونۂ یوم الحساب تھا

کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اس بن
شوق نے ہم کو بے حواس کیا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

گرمی عشق مانع نشوونما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اگا اور جل گیا

ہر ذرہ خاک تیری گلی کا ہے بے قرار
یاں کون سا ستم زدہ مٹی میں رل گیا

عرق فشانی سے اس زلف کی ہراساں ہوں
بھلا نہیں ہے بہت ٹوٹنا بھی تاروں کا

ہر قدم پر تھی اس کی منزل ایک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

دھوکا ہے تمام بحر دنیا
دیکھے گا ہونٹھ تر نہ ہو گا

آ خانہ خرابی اپنی مت کر
قحبہ ہے یہ اس سے گھر نہ ہو گا

میں نہ کہتا تھا کہ منہ کر دل کی اور
اب کہاں وہ آئینہ، ٹوٹا گیا

یہ توہّم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

وہ دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دور آبا

خانہ خراب کس کا کیا تیری چشم نے
تھا کون یوں جسے تو نصیب ایک دم ہوا

نمود کر کے وہیں بحر غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میرؔ بھی اک بلبلا تھا پانی کا

گلی میں اس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر
میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار رہا

دل کے تئیں آتش ہجراں سے بچایا نہ گیا
گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخم خواہش دل میں تُو بوتا ہے کیا

ڈر سے اس شمشیر زن کے جوہر آئینہ سال
سر لے کر پاؤں تک میں غرق آہن میں رہا

ہیں چاروں طرف خیمے کھڑے گردباد کے
کیا جانیے جنوں نے ارادہ کدھر کیا

زمیں گیر ہو عجز سے تو کہ اک دن
یہ دیوار کا سایہ دیوار ہو گیا

شیخ قلاش ہے جوئے میں نہ لاؤ
یاں ہمارا رہے ہے مال پڑا
خربزہ اب نہیں ہیں گندم گوں
میر ہندوستاں میں کال پڑا

دانستہ ہے تغافل، غم کہنا اس سے حاصل
تم دردِ دل کہو گے وہ سر جھکا رہے گا

دکانیں حسن کے آگے ترے تختہ ہوئی ہوں گی
جو تو بازار میں ہو گا تو یوسف کب بکا ہو گا
معیشت ہم فقیروں کی سی اخوان جہاں سے کر
کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہو گا

شاید کہ مند گئی ہے قمری کی چشم گریاں
کچھ ٹوٹ سا چلا ہے پانی چمن کے جُو کا

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث
برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا
جس گھر میں ترے جلوے سے ہو چاندنی کا فرش
واں چادر مہتاب ہے مکڑی کا سا جالا

لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں آنکھیں اگر یہی ہیں تو پھر نیند سو چکا

نشوونما ہے اپنی جوں گرد باد انوکھی بالیدہ خاک رہ سے ہے یہ شجر ہمارا

سرسری تم جہان سے گزرے ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

دھوپ میں جلتی ہیں غربت وطنوں کی لاشیں تیرے کوچے میں مگر سایۂ دیوار نہ تھا

کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں عاشقوں کا جلا وطن دیکھا

جہاں کو فتنے سے خالی کبھو نہیں پایا ہمارے وقت میں تو آفتِ زمانہ ہوا

گئی تسبیح اس کی نزع میں کب میؔر کے دل سے اسی کے نام کی سمرن تھی جب منکا ڈھلکتا تھا

مغاں مجھ مست بن پھر خندہ ساغر نہ ہووے گا مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

ایک دو ہوں تو سحر چشم کہوں کارخانہ ہے واں تو جادو کا

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا

موند رکھنا چشم کا ہستی میں عین دید ہے کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے جناب
کچھ نہیں بحرِ جہاں کی موج پر مت بھول میؔر دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

نکتہ دانانِ رفتہ کی نہ کہو بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ
ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ

حال گلزار زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق　　رنگ کچھ اور ہی ہو جائے ہے اک آن کے بیچ

ہم امید وفا پہ تیری ہوئے　　غنچۂ دیر چیدہ کے مانند
سر اٹھاتے ہی ہو گئے پامال　　سبزۂ نو دمیدہ کے مانند

خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں　　کس خرابے میں ہم ہوئے آباد
ہر طرف ہیں اسیر ہم آواز　　باغ ہے گھر ترا تو اے صیاد

کس ڈھب سے راہ عشق چلوں، ہے یہ ڈر مجھے　　پھوٹیں کہیں نہ آبلے ٹوٹیں کہیں نہ خار
میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے　　دونوں ہاتھوں سے تھا میے دستار

یا رب رہِ طلب میں کوئی کب تلک پھرے　　تسکین دے کے بیٹھ رہوں پاؤں گاڑ کر

دل سے میرے شکستیں الجھی ہیں　　سنگِ باراں ہے آبگینے پر

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ڈوبے اچھلے ہے آفتاب ہنوز　　کہیں دیکھا تھا تجھ کو دریا پر
یاں جہاں میں کہ شہر کوراں ہے　　سات پردے ہیں چشم بینا پر

مجنوں کا دل ہوں محمل لیلیٰ سے ہوں جدا　　تنہا پھروں ہوں دشت میں جوں نالۂ جرس

ابروئے کج ہے موج کوئی چشم ہے حباب　　موتی کسی بات ہے سیپی کسی کا گوش

کن نے لیا ہے تم سے مچلکہ کہ داد دو　　تک کان ہی رکھا کرو فریاد کی طرف

محبت نے شاید کر دی دل میں آگ　　دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

مانند طیر نو پر اٹھے جہاں گئے ہم　　دشوار ہے ہمارا آنا پھر آشیاں تک

عشق کا شور کوئی چھپتا ہے نالۂ عندلیب ہے گلبانگ

سبزہ نورستہ رہگذر گا ہوں سر اٹھایا کہ ہو گیا پامال

کیوں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے آشیاں تھا مرا بھی یاں پرسال

جانیں ہیں فرش رہ تری مت ہال ہال چل اے رشک حور آدمیوں کی سی چال چل
اک آن میں بدلتی ہے صورت جہان کی جلد اس نگار خا سے کر انتقال چل

حیران میں حال تدبیر میں نہیں ہر اک کو شہر میں ہے یہ آزار آج کل

جتنے تھے کل تم آج نہیں پاتے اتنا ہم ہر دم چلے ہی جاتے ہو آب رواں سے تم

کرتے ہیں گفتگو سحر اٹھ کر صبا سے ہم لڑنے لگے ہیں ہجر میں اس کے ہوا سے ہم

بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں جیسے دریا کہیں ابلتے ہیں

مت کھا فریب عجز عزیزان حال کا پنہاں کیے ہیں خاک میں یاروں نے دام یاں

ہوئی عید سب نے پہنے طرب وخوشی کے جامے نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں یہ لباس سوگواراں

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتش دل ایک دو آنسو، تو اور آگ لگا جاتے ہیں

گو طاقت و آرام و خور و خواب گئے سب بارے یہ غنیمت ہے کہ جیتا تو رہا ہوں

تمہیں بھی چاہیے ہے کچھ تو پاس چاہت کا ہم اپنی اور سے یوں کب تلک نباہ کریں

آسودہ کیونکر ہوں میں کہ مانند گرد باد آوارگی تمام ہے میری سرشت میں

پھاڑا ہزار جا سے گریبان صبر میرؔ — کیا کہہ گئی نسیم سحر گل کے کان میں

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں — بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں

رکھا کر ہاتھ دل پر آہ کرتے — نہیں رہتا چراغ ایسی پون میں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ترے تیر ناز کے جو یہ ہدف ہوئے ہیں ظالم — مگر آہنی توے ہیں جگر نیاز منداں

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں — ہم اپنے سوائے کس کو مقصود جانتے ہیں

چاہے ہے آج ہوں، میں ہفت آسماں کے اوپر — دل کے مزاج میں بھی کتنی شتابیاں ہیں

مہمان میرؔ مت ہو خوان فلک پہ ہرگز — خالی یہ مہر و ماہ کی دونوں رکابیاں ہیں

یہ جی جو میرے گلے کا ہے ہار تو ہی لے — ترے گلے کے لیے میں یہ ہار لایا ہوں

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی — انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

ظالِ حق ہم کو بھی وہ ہی چاہیے — جوں ہماری ہوتی ہیں پرچھائیاں
ایک بھی چشمک نہ اس مہ کی سی کی — آنکھیں تاروں نے بہت جھمکائیاں

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں — اب ہم نے بھی کسو سے آنکھیں لڑائیاں ہیں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر — میں ورنہ وہی خلوتی رازِ نہاں ہوں

جی میں پھرتا ہے میرؔ وہ میرے جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

آب وہوائے ملک عشق تجربہ کی ہے میں بہت کرکے دوائے درد کوئی بھی پھر جیا نہیں

شاہد لوں میرؔ کس کو اہل محلّہ سے میں محضر پہ خوں کے میرے سب کی گواہیاں ہیں

حاصل ہے کیا سوائے ترائی کے دہر میں اٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں

اک سسکتا ہے ایک مرتا ہے ہر طرف ظلم ہو رہا ہے یاں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میرؔ اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

کیا سیر اس خرابے کا بہت اب چل کے سو رہیے کسو دیوار کے سائے میں منہ پر لے کے داماں کو

گر ذوق سیر ہے تو آوارہ اس چمن میں مانند عندلیب گم کردہ آشیاں ہو

از خویش رفتہ ہر دم رہتے ہیں ہم جو اس بن کہتے ہیں لوگ اکثر اس وقت تم کہاں ہو

رنگ رفتہ بھی دل کو کھینچے ہے ایک شب اور یاں سحر دیکھو

راحت پہنچی تک تم سے تو رنج اٹھایا برسوں تک سر سہلاتے ہو جو کبھو تو بھیجا بھی کھا جاتے ہو

میں نے آئینہ صفت در نہ کیا بند غرض اس کو مشکل ہے جو آنکھوں میں حیا رکھتا ہو

استخواں توڑی مری اس کی سگی کے سگ نے جس خرابی سے میں واں رات رہا، مت پوچھ

بود آدم نمود شبنم ہے ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ

میں تو، ہیں وہم دونوں کیا ہے خیال تجھ کو جھاڑ آستین مجھ سے ہاتھ آپ سے اٹھا رہ

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میرؔ کوئی دبے جب بگڑ گئی

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی
بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

ہم تو ہی اس زمانے میں حیرت سے چپ نہیں
اب بات جا چکی ہے سبھی کائنات کی

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے

خاک تھی موجزن جہاں میں اور
ہم کو دھوکا یہ تھا کہ پانی ہے

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھو سرو و گل کے سائے تھے

کچھ تو ابھرا ے صورت شیریں کہ دکھاؤں
فرہاد کے ذمے بھی عجب کوہ کنی ہے

باغ کو تجھ بن اپنے بھائیں آتش دی ہے بہاراں نے
ہر غنچہ اخگر ہے ہم کو ہر گل ایک انگارہ ہے

شیخ کی تُو، نماز پر مت جا
بوجھ سر کا سا ڈال آتا ہے

مطلب کو تو پہنچتے نہیں اندھے کے سے طور
ہم مارتے پھرے ہیں یونہی ٹپے ٹوئیے
اب جان جسم خاک سے تنگ آ گئی بہت
کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے

کہاں تک ناز برداری کروں شام غریباں کی
کہیں گرد سفر سے جلد بھی صبح وطن نکلے

بڑھتی نہیں پلک سے تا ہم تلک بھی پہنچیں　　پھرتی ہیں وے نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

آبشار آنے لگے آنسو کی پلکوں سے تو میرؔ　　کب تلک یہ آب چادر منہ پہ تانا کیجیے

کہتے ہیں داغ اکثر نان و نمک کی خاطر　　جینے کا اس سے میں اب کیا مزا رہا ہے

بنائیں رکھیں میں نے عالم میں کیا کیا　　ہوں بندہ خیالات باطل کا اپنے

رکا جاتا ہے جی اندر ہی اندر آج گرمی سے　　بلا سے چاک ہی ہو جاوے سینہ تک ہوا آوے

ترا ہے وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں　　نگاہ غور سے کر، مجھ میں کچھ رہا بھی ہے

امیر زادوں کے دلی کے مل نہ تا مقدور　　کہ ہم فقیر ہوئے ہیں انھیں کی دولت سے

ہر اک سے کہا نیند میں پر کوئی نہ سمجھا　　شاید کہ مرے حال کا قصہ عربی ہے

در پئے خون میرؔ ہی نہ رہو　　ہو بھی جاتا ہے جرم آدم سے

عالم میں آب و گل کا ٹھہراؤ کس طرح ہو　　گر خاک ہے اڑے ہے اور آب ہے رواں ہے

کیا اس غریب کو ہو سِ سایہ ہما　　جو اپنی بے دماغی سے مکھی نہ جھل سکے

شب خواب کا لباس ہے عریاں تنی میں یہ　　جب سوئیے تو چادر مہتاب تانیے

تک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ　　دل بھی کیا لق و دق جنگل ہے

زیر فلک بھلا تو رووے ہے آپ کو میرؔ　　کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

یاں فقط ریختہ ہی کہنے نہ آئے تھے ہم　　چار دن یہ بھی تماشا سا دکھایا ہم نے

ہے جو اندھیر شہر میں خورشید دن کو لے کر چراغ نکلے ہے

آرا اور تبصرے

سچ یہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کا 'مخزن نہم پر ایک نظر' کے عنوان سے تبصرہ گزرا۔ یقیناً یہ تبصرہ دلچسپ، عمدہ، علمی و ادبی نوعیت کا ہے۔ میں ان دنوں سخت بیمار ہوں لیکن ''مخزن'' کا مطالعہ میرے لیے باعث تقویت بنتا چلا آ رہا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی ادارت میں چھپنے والا پرچہ وقیع بھی ہے اور تنوعات لیے ہوئے ہے۔ یقیناً یہ بات لائق ستائش ہے۔

''مخزن'' بس کے تمام مضامین سنجیدہ مطالعے کا تقاضا کرتے ہیں۔ موجودہ پرچہ فی الواقعی علوم وفنون کی تشریحات کا بے بدل نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی کی یادیں زندہ کر دی ہیں۔ یہ صرف یادوں کی تفصیل نہیں، بلکہ یہ تاریخ کا حصہ ہیں۔ اسی طرح یہ زندہ رہ سکتی ہیں کہ انھیں وقتاً فوقتاً صفحۂ قرطاس کی زینت بننا چاہیے۔

ڈاکٹر سید نظیر حسنین زیدی مرحوم کے فرزند ارجمند سید مسعود زیدی نے مجلس یادگار ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی قائم کی اور پھر سہ ماہی نوادر لاہور کا اجرا کیا اور اس طرح ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی نے نام نامی کو زندہ کر دیا اور ان کے کام کی اہمیت وافادیت کو واضح کر دیا۔

تمام مضامین دلچسپ، معلومات افزا، علمی عرفان سے پر اور لائق مطالعہ ہیں۔ تنقیدی مقالات اور تحقیقی مقالات پرچے کی جان ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے یہ حقائق مترشح ہوتے ہیں کہ ''مخزن'' کی روایت کو آگے بڑھانا خاصا مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں چھپنے والے اس ادبی پرچے کے معیار وتنوعات میں اضافہ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ جو پرچے کو وقیع بناتا ہے۔ آگرہ میں اردو صحافت (آغاز اور آزادی کے بعد) اس مضمون میں ڈاکٹر سید اختیار جعفری (آگرہ) نے آگرہ میں اردو صحافت کا جائزہ بڑے تاریخی انداز میں پیش کیا ہے اور خوب خوب نقشہ کھینچا ہے۔ اور یہ نقشہ اس قدر واضح ہے کہ عہد بہ عہد پوری تاریخ سامنے آ جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے پُرمغز مقالے بعنوان ''پاکستان میں تحقیق کی موجودہ صورت حال'' میں ایک ایسا آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے جس سے ان پوشیدہ حقائق سے پردہ اٹھتا ہے جس سے اچھے اچھے محققین نابلد واقع ہوئے ہیں۔ ایک طرح یہ بڑی بات ہے کہ عموماً کچھ محققین ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو دوسروں کی تحقیق کا سہارا لے کر اپنا نام محققین میں شامل کر لیتے ہیں اور ہماری درس گاہوں اور جامعات میں سندی تحقیق میں ایسا ہو رہا ہے۔

خداوند کریم مخزن کو تادیر علم وعرفان کا درخشندہ ترجمان بنائے رکھے اور ڈاکٹر موصوف کی یہ خدمات قبول عامہ پائیں

اوران کے جملہ رفقائے کار کو بصحت وسلامتی قائم ودائم رکھے۔آمین

ابوالمعانی عصری، کنوینر دائرہ علم و ادب پاکستان، دلیوالی، ضلع میانوالی

اردو ادب کے دو مخزن

ویسے تو اردو ادب کے خزانے اور خزینے پوری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو زبان کا ادب دہلی، لکھنو، لاہور، کراچی اور اسلام آباد میں ہی نہیں پنپ رہا بلکہ اس کی نئی بستیاں برطانیہ، امریکہ، کینیڈا اور مشرق وسطی کی تمام ریاستوں کے علاوہ جرمنی، فرانس، روس اور ناروے میں بھی قائم ہیں اور وہاں بھی اردو ادب کثرت سے تخلیق ہو رہا ہے اور اس کو متعارف کرانے کے لیے اس وقت اردو کے جو متعدد رسائل شائع ہو رہے ہیں، ان میں ''مخزن'' نام کے دو رسائل کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ان میں سے ایک مشرق کے دارالادب لاہور سے اور دوسرا مغرب کے مرکز ادب برطانیہ (برمنگھم فورڈ) سے شائع ہوتا ہے۔اول الذکر کے مدیر ڈاکٹر وحید قریشی ہیں اور ان میں مجلس ادارت میں انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور انور سدید شامل ہیں۔صدر مجلس جناب عنایت اللہ ہیں جن کی جدت پسندی اور تنوع نظری کسی تعارف کی محتاج نہیں۔رسالے کی منتظم پہلے محترمہ شہناز مزمل تھیں، اب جناب محمد ہارون عثمانی ہیں۔دوسرے رسالہ ''مخزن'' کے مدیر معروف افسانہ نگار اور سابق ''راوی'' (برمنگھم فورڈ) کے مدیر مقصود الٰہی شیخ ہیں جو اب بھی برمنگھم فورڈ (برطانیہ) میں مقیم ہیں اور اپنے ''مخزن'' کو پوری دنیا کے اردو ادب کا نمائندہ بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔

''مخزن'' لاہور کا مزاج تحقیقی اور تنقیدی ہے اور اس کا مقصد اردو ادب کے خزینوں کی بازیافت اور ان ادبیات شخصیات کا تعارف ہے جو نئی نسل کی نظروں سے اوجھل ہو چکی ہیں لیکن جن کے انوار علوم سے اردو ادب تابندہ ہے۔ششماہی بنیادوں پر چھپنے والے اس پرچے کا حال ہی میں گیارھواں شمارہ شائع ہوا ہے۔محقق مشفق خواجہ (مرحوم) کی پہلی برسی پر ڈاکٹر وحید قریشی نے ''اداریے'' میں پاکستان میں تحقیق کے زوال کو موضوع بنایا ہے اور تشویش کا اظہار کیا ہے کہ:

''تحقیق اور تنقید کے باہمی رشتے ایک استہزائی اور تحقیری سرگرمی کی بنا پر آپس میں دست وگریباں ہو گئے۔ادیب علمی رسائل سے اخبارات میں جا نکلا۔گروہ بندیوں نے حقائق کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا۔چنانچہ بعض ادبا نے ادب کی بجائے دوسرا کاروبار سنبھال لیا۔تنقید اور شاعری کے نام پر چھابڑیاں لگا کر کھٹے مٹھے پیر بیچنے لگے .....تحقیق پر موشن (مالی ترقی) کا وسیلہ بنی .....اب ماشاءاللہ ہر شہر میں تحقیق کی فیکٹریاں کھل گئی ہیں، جن میں لنگڑے لولے گھوڑے کمائی میں مصروف ہیں .....ایسے میں پاکستان میں ''تجارتی تحقیق کا دبستان'' مصروف کار ہے''۔

یہ صورت حال بڑی خوف ناک ہے کیونکہ ایسے مقالات بھی پکڑے گئے ہیں جن کا تمام تر انحصار ''سرقہ نویسی'' پر تھا، اب جن مقالات پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جاتی ہے وہ کتابی صورت میں چھاپے ہی نہیں جاتے تاکہ غیر معیاری کام سامنے ہی نہ آئے اور سرقہ پکڑا نہ جائے۔اس بدعت کا تدارک اس طرح ہو سکتا ہے کہ گزشتہ ربع صدی کے ڈگری یافتہ مقالات کی خفیہ جانچ پڑتال کرائی جائے اور غیر معیاری مقالات پر دی گئی ڈگریاں منسوخ کر دی جائیں۔آئندہ مقالہ نگار کو اپنا مقالہ یونیورسٹی اور

بیرون یونیورسٹی کے فضلا وعلما کی مجلس کے سامنے پیش کرنے کا پابند بنا کرا سے اپنے دفاع کا موقع دیا جائے ۔مدیر ''مخزن'' کا یہ فکر انگیز اداریہ قوم کے علمی زوال اور اخلاقی فقدان کی نشاندہی کرتا ہے جس کا فوری علاج ضروری ہے ۔

اس پرچے میں حافظ صفوان چوہان نے تحقیق کے خان خاناں رشید حسن خان کی تحقیق نگاری کے گوشے عصری دانش کی مشارکت سے بڑی خوبی سے ابھارے ہیں ۔معنوی طور پر یہ مقالہ تحقیقی ژرف نگہی کے علاوہ مخزن کے اداریے کی شکایت کی عملی مثال بھی ہے اور حافظ محمد صفوان چوہان صاحب کئی پی ایچ ڈی محققوں پر فوقیت کے حقدار نظر آتے ہیں ۔علمی، ادبی، تحقیقی زاویوں سے ناصر عباس نیر کا مقالہ ''افلاطون کے تنقیدی نظریات'' بھی اپنی نظیر آپ ہے اور ان کے گہرے مطالعے سے نئے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت کا مظہر ہے ۔یہ دونوں مقالہ نگار ''نان پی ایچ ڈی'' ہیں لیکن تحقیق کے کام سے ان کی لگن مثالی ہے ۔ادب کی اعلیٰ شخصیات میں سے اس مرتبہ ڈاکٹر محمد عمر داؤد پوتہ، پطرس بخاری، نواب مستقیم جنگ نامی، خطاط اعظم استاد محمد یوسف دہلوی اور ممتاز افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی پر شخصیت نامے شامل کیے گئے ۔ڈاکٹر سلیم اختر کے سفرنامہ چین میں مصنف کی زیادہ توجہ چینی کھانوں اور لڑکیوں پر مرتکز نظر آتی ہے ۔محمد ہارون عثمانی، ریاض احمد، پرتو روہیلہ اور ڈاکٹر وحید عشرت کے مضامین اور تبصرے دلچسپی کے حامل ہیں ۔''مخزن'' لاہور اگرچہ ایک مخصوص مزاج کے نثری ادب کا پرچہ ہے لیکن اس کی افادیت مقبول عام ادبی رسائل سے زیادہ ہے ۔اس میں شامل ہر مقالہ مصنف کی محنت کا آئینہ دار اور کئی کتابوں کے مطالعے کا حامل نظر آتا ہے ۔''مخزن'' قائداعظم لائبریری لاہور کا ادبی مجلّہ ہے اور اس کے دفتر واقع باغ جناح لاہور سے صرف ۱۰۰ روپے میں دستیاب ہے ۔

ڈاکٹر انور سدید، نوائے وقت ۱۱/ اگست ۲۰۰۶

آپ کا ارسال کردہ ادبی مجلّہ مخزن نمبر گیارہ موصول ہوا، شکریہ ۔میں نے چند مضامین کا بڑی بے تابی سے گہرا مطالعہ کیا اور بڑا لطف آیا ۔لعبتان چین اور جہان مرغ وماہی از ڈاکٹر سلیم اختر:

بیار اے لعبت ساقی اگر تلخ است دگر شیریں
کہ از دستت شکر باشد اگر خود زہر ہا بستی

سچ یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے ۔یقیناً سفرنامے کے لیے یہ نہایت من موہنا، پسندیدہ، دلکش اور معلومات افزا ہے ۔ڈاکٹر سلیم اختر صاحب ہماری تہذیبی وتاریخی روایت کے امین ہیں اور ان کا وجود شاداب قلم کی وجہ سے مسلمہ ہے ۔لہٰذا ہماری قومی زندگی میں اردو زبان سے ناگزیر حد تک وابستہ ہے ۔ڈاکٹر صاحب نے یہ انکشاف کیا ہوتا کہ اردو زبان چین میں بذریعہ تعلیم وتدریس بقول آنسہ کوثر جمال صاحبہ ۱۹۵۴ء میں آئی ۔تو چین میں یہ ہمارے قومی وثقافتی رشتوں کو مضبوط کرتی چلی آتی ہے ۔یہ ہماری آن وآبرو کا مظہر ثابت ہوتی ۔محترمہ کوثر جمال صاحبہ نے اس بات کا اظہار مقتدر قومی زبان اسلام آباد کے جاری کردہ کتابچہ میں کیا تھا ۔

شمس العلما ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتہ از محمد حنیف شاہد اور افلاطون کے تنقیدی تصورات از ناصر عباس نیر، دونوں مضامین خاصے معلومات افزا ہیں ۔افلاطون کے تنقیدی تصورات بڑے گہرے مطالعے کا انکشاف کرتا ہے ۔تاہم ان پر مزید ادق بحث بھی چل سکتی ہے ۔وہ اس طرح کہ کچھ ذی علم شخصیتیں افلاطون کے نظریات وتصورات کو جس انداز میں اخذ وتنسیخ کی چھلنی سے گزارتی

ہیں اس کا بھی وہ ایک علمی جواز ہے۔ تاہم محترم ناصر عباس نیر نے فیصلہ کن انداز میں اس ادق بحث کو آگے بڑھایا ہے اور خوبصورت علمی جواز فراہم کیا ہے۔یقیناً یہ ان کی علمی لگن کا مظہر ہے۔اور اس بات کا انکشاف ہے کہ ہماری اردو تنقید جو کئی حوالوں سے تشنہ نظر آتی ہے، ایسی علمی پیش رفت سے توانا اور سودمند ہو سکتی ہے۔خداوند کریم ان کے شاداب قلم کو ہمیشہ سرسبز رکھے آمین۔مولانا امین احسن اصلاحی کی صحافتی خدمات از محمد ہارون عثمانی، ایک بہترین لائق مطالعہ مضمون ہے۔ایسے مضامین رسائل و جرائد میں محفوظ ہونے چاہئیں۔تاکہ انسانی علمی تاریخ کا تسلسل برقرار رہے۔سچ یہ ہے کہ محترم محمد ہارون عثمانی صاحب بڑی ذی علم شخصیت ہیں اور ان کا علمی نچوڑ حاصل مطالعہ کی صورت میں جب سامنے آتا ہے تو لطف آ جاتا ہے۔یقیناً یہ خوبی اور اکتسابی قوت طویل محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔خداوند کریم انھیں صحت وسلامتی دے۔ ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام کی تازہ ترین کتاب ''اقبال ایک تحریک'' پر ڈاکٹر وحید عشرت کا تقریظی تبصرہ جو طویل مضمون کی صورت میں ہے، خوب ہے اور لائق مطالعہ ہے۔

یہ سچ ہے کہ علامہ اقبال بحیثیت قومی ہیرو ایک تحریک کے عنوان سے ہمارے برصغیر کے معاشرے میں ناگزیر صورت میں ابھرا اور اس وقت کے سیاسی حالات کے پس منظر میں ان کی علمی وفکری روشنی زیادہ قوت سے سامنے نہ آ سکی۔اس کی ایک وجہ تو وہ فکری تصادم تھا جو بے سروپا اور بلا جواز تھا۔لیکن ان کی توانا آواز نے جسے اس وقت کے غیر موافق سیاسی حالات کا رخ دیا۔ علامہ اقبال علیہ رحمۃ پر تکفیر کے جو فتوے لگائے گئے اس کا منفی اثر ضرور سامنے آنا چاہیے تھا اور یقیناً یہ منفی اثر ہوا جو سیاست کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔اور وہ لوگ جو سیاست کے اسرار ورموز سے ناآشنا تھے اور ان کا عوام الناس میں بڑا اثر وروسوخ تھا، اس توانا فکری وعلمی تحریک کو نقصان پہنچانے میں پیش پیش رہے۔

ہمارا ایک مذہبی طبقہ جو حضرت قائداعظم اور علامہ اقبال علیہ رحمۃ کی مشترکہ سیاسی مساعی کو بلا جواز مشکلات سے دوچار کر رہے تھے، اس کا علامہ اقبال علیہ رحمۃ کی فکری تحریک پر معکوس اثر ہوا۔اور یہ فکری توانا حیثیت دب کر رہ گئی اور آج ہمارے ذی علم حضرات ان چیزوں کا جواز سامنے لاتے ہیں۔یقیناً یہ اس پس منظر میں ہونے والا سرد ورفتہ کا جواز ہی ہے لیکن اب یہ حالات نہیں رہے۔وہ قومی درد کی ہمہ گیر پہنائی ووسعت اور مدوجذر کی منہ زور قوت نہیں رہی اور نہ ہی وہ مخلص ودیانت دار قومی ہیرو رہے ہیں۔اور یہ قومی درد تنہائی وخلوت میں آہیں بھرنے کے سوا کچھ نہیں رہا۔اب اسلامی نشاۃ ثانیہ کا احیاء کس طرح ممکن ہے؟

ڈاکٹر وحید عشرت ایک علمی دانشور شخصیت ہیں اور ان کا تنقیدی تبصرہ پرمغز ومعنی خیز اور بڑا جچا تلا ہے۔اور جس انداز میں اس کی تنقیدی وضاحت سامنے آتی ہے۔اس کی کئی جہتیں ہیں اور ان پر مزید وضاحتی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ علامہ اقبال علیہ رحمۃ پر جو علمی کام ہوا ہے وہ جامعات میں کئی صورتوں میں تشنہ نظر آتا ہے۔ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام کا کام نوعیت کے اعتبار سے اہم بھی ہے اور قابل غور بھی اور اس کا فکری ناگزیر جواز بھی ہے۔خدا کرے کہ ہمارے دانشور اس پر پیش رفت کریں۔

مخزن کا ہر مضمون لائق مطالعہ اور متنوع ہوتا ہے۔جو ہمارے قاری کی فکر رسا کو توانا، ترفع پسند اور قابل عمل بنانے کا جواز مہیا کرتا ہے۔مجموعی طور پر مخزن اس عہد کا عہد ساز ہے۔خداوند کریم اس کی ادارتی ٹیم کو صحت وسلامتی سے رکھے۔آمین

ابوالمعانی عصری، کنوینر دائرہ علم و ادب پاکستان بمقام دلیوالی، ضلع میانوالی

مخزن کا نام جسٹس شاہ محمد دین ہمایوں، صلاح الدین احمد، خوشی محمد ناظر وغیرہ کے حوالے سے ذہن نشین ہے۔ کلاسیکی ادب، تدریس کے ذیل میں اسکول، کالج وجامعات کی سطح پر لکھے گئے نثری ومنظوم انتخاب (۱۹۵۰ء تا ۲۰۰۴ء) پر نظر رہی ہے۔ ترقی پسند مصنفین کے قیام سے لے کر اس سے وابستہ اہل قلم کی تمام تخلیقات مرحلہ وار مطالعے میں آتی رہی ہیں۔ انگارے، آگ کا دریا، کفن، پرمشیر سنگھ، کھول دو، یا خدا، مفتیانے، اردو نثر کی تاریخ، اردو کے اولین شاعر سے ۲۰۰۵ء تک کے شعراء کی نگارشات دیکھی گئی ہیں۔ جوش تا احمد فراز سب کو گردانا اور مانا ہے۔ بھارت اور پاکستان دونوں جانب کا ادب زیر مطالعہ رہتا ہے۔ کراچی نامہ میں آپ کا ذکر میں نے کیا ہے۔

رشید حسن خاں، نجم الاسلام، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (نوراللہ مرقدہ) مشفق خواجہ کی رحلت پر تحقیق کے دو اہم رجحانات کی یک لخت روانگی کا نوحہ ہمارے قلب وذہن کی ترجمانی ہے۔ شاعر نقاد جمال پانی پتی ۱۰ جولائی ۲۰۰۵ء کو رخصت ہوئے ان کی برسی منا رہے تھے کہ ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء کو احمد ندیم قاسمی، مدیر فنون، ہمہ جہت شخصیت، برصغیر میں ریڈیو، صحافت، ڈرامہ نگاری، فکشن، نقد ونظر اور شاعری کے ایک اہم ستون کی جدائی کا صدمہ بھی اس صدی کے اہم قلم کاروں اور اہل فکر ودانش کی تقدیر کا حصہ بنا۔

مخزن شمارہ ۱۱ پیش نظر ہے۔ ہر مضمون انتخاب ہے۔ رد وقبول، اختلاف فکری ونظری ردعمل کا حق ''قاری'' کو ہے۔ ''کیا یہ اہم دستاویز سہ ماہی نہیں ہوسکتا (یا ہوسکتی!)'' مدیر شاعر بمبئی۔ ''اور کوئی صورت نکالیے کہ یہ سہ ماہی ہوسکے''۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل کراچی (میں متفق ہوں)۔ خطاط اعظم کے حوالے سے استاد محمد یوسف دہلوی کے وفات کے سانحہ کا ماخذ ''قمر ہاشمی'' کی کتاب نوحوں کا مجموعہ ''تماشا طلب آزار'' ہے۔ اس میں منظوم نوحہ کا پہلا شعر ص ۱۲۹ اور دوسرا ص ۱۳۰ سے راشد شیخ نے ''بقول شاعر'' نقل تو کرلیا مگر ''تجاہل عارفانہ'' سے کام لے کر ماخذ کو نظر انداز کر گئے! ''ڈاکٹر محمد حمید اللہ پر مرتبہ ان کی کتاب میں راقم کا انگریزی سے ترجمہ کردہ (The Mirror London) سے ماخوذ کردہ مضامین کا سلسلہ جسارت سنڈے میگزین میں پورے صفحے پر مدیر کے انٹرویو کے ساتھ شائع ہوا تھا عطیہ سدید اللہ (بھتیجی حمید اللہ) کا آخری انٹرویو بھی اسی طرح محمد راشد شیخ نے میرے جسارت کراچی کے حوالے کے بغیر شامل کیا تھا۔ ایک مضمون پر میرا نام دے دیا۔ کتاب کا تقاضا کیا تو انکار کر دیا۔ میں ذاتی طور پر ان صاحب سے آشنا نہیں، آج تک ملا نہیں۔ مشفق خواجہ کے خطوط بنام محمد عالم مختار حق میں بھی ایک آدھ جگہ ان کا نام آیا ہے۔ علمی وادبی کام کرنے والوں کو ناموں (اور ان کے کار+ناموں) سے جانتا ہوں!

ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتہ نے ۱۹۶۵ء میں نہیں ۱۹۵۶ء میں ہسٹاریکل کانفرنس میں صدارت کی تھی۔ کمپوزنگ کی غلطی ہے۔ نقوی صاحب کو.....ان کے دوستوں (ص ۱۹) .....نے انہیں (؟) یاد رکھا۔ حشو وزوائد ہے۔ (ڈاکٹر انور سدید)

۱۹۳۶ء میں دہلی اے آئی آر اسٹیشن کا قیام ۱۹۴۰ء میں ڈی جی، پھر گورنمنٹ کالج میں آمد، ''صحیح بخاری'' کا جنم، بھئی مجھے تو صوفی (تبسم) صاحب کی طرح فارغ البالی نصیب نہیں ہے کہ بیٹھا شعر کہتا رہوں۔ جیسا ''فقرہ لگانے'' والے بڑے بخاری صاحب پر ان کے شاگرد رشید غلام رسول تنویر کی روزنامہ امروز ۱۹۵۹ء کی تحریر .....آغا بابر کا ان کی قبر کو دریافت کرنا جیسے واقعات سے غالب کا منقولہ شعر یاد آ گیا:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ　　یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

عصرِ حاضر میں احیائے علوم کے لیے اقبال جو بنیادیں فراہم کرتے ہیں ان کو ان (اقبال) کی تحریروں سے مدون کیا جائے کیونکہ اس وقت اسی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ اپنی کسی فرصت میں سید اکرم شاہ صاحب اس طرف توجہ فرمائیں گے کہ ہمیں اس وقت جو مرحلہ درپیش ہے اس سے اقبال کی فکریات سے رہنمائی حاصل ہو سکے۔ ڈاکٹر وحید عشرت، شعبہ اقبالیات، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے استاد کی اس گزارش پر سید اکرم شاہ (ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام) کو ''پہلی فرصت'' میں توجہ دینا چاہیے کہ یہ ہماری بھی ضرورت ہے۔ شخصیات نگار محترم حافظ صفوان محمد چوہان نے ''رشید حسن خاں صاحب اور عصری دانش کی مشارکت کے حوالے سے'' خاں صاحب کی کلاں اردو لغت جلد اول (مدیر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) پر ''خاں صاحبیت'' کا جو حوالہ دیا وہ 'اظہار' کے صفحات پر تفصیل سے موجود ہے۔ چوہان صاحب نے ''اردو لغت بورڈ کی نئی جلد یعنی ۲۰ ویں جلد کے حوالے سے اسناد کی کمی اور پہلے کے مقابلے میں اسناد کو نسبتاً معتبر قرار دینے کی رشید حسن خاں صاحب کی ''سند'' درج کر کے معاملہ بہتر کر دیا۔ اعتراضات تو شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی کم نہیں کیے مگر ''اردو املا'' پر سند ''خاں صاحب'' کا فرمان ہمارے لیے زیادہ واجب التعظیم اور باعث طمانیت ٹھہرتا ہے۔ خوش قسمتی سے ۱۸ ویں جلد آنے والی ۲۱ ویں جلد میں راقم کا ''پروف'' اضافۂ اسناد کے ذیل میں تھوڑا بہت حصہ رہا ہے اور نام بھی ''معاونین'' میں شامل ہے۔ ''خاں صاحب طرح دے گئے'' چوہان صاحب کی ''سادگی'' سے ''مصلحت'' ہماری اس رواں صدی کے ''بڑے لوگوں'' کے خمیر میں شامل ہے۔ دیگر مندرجات پر گفتگو پھر سہی تنقیدات عبدالحق کے باوجود وہ نقاد نہیں تھے؟ والسلام

سید انور جاوید ہاشمی، گلشن اقبال کراچی

شمارہ ۸ میں آپ نے میرا آپ کے اداریے سے متاثر ہو کر لکھا ہوا خط چھاپ کر شکریہ ادا کرنے کا موقع فراہم کیا۔

جناب ریاض احمد صاحب نے اسی شمارے میں آپ کے اداریے کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے مضمون ''علامہ اقبال اور نیٹشے'' کی ابتدا کرتے ہوئے مژدہ سنایا ہے کہ ''اقبال شناسی کے ضمن میں مغرب میں صورت حال اس حد تک دگرگوں نہیں ہے'' اور ثبوت میں کینیڈا کی مصنفہ شیلا میکڈونولڈ کی کتاب The Flame of Sinai کے ایک حصے کا ترجمہ ''مخزن'' کے لیے پیش کر کے اس مزعومہ کو رد کیا ہے کہ اقبال کے مردِ مومن کے متعلق خیالات نیٹشے سے مستعار ہیں۔

میں آپ کے اداریہ سے متاثر ہوا۔ میں نے خط کے ذریعے چند تجاویز پیش کر دیں۔ ریاض احمد صاحب نے ایک نہایت اہم پہلو قارئین مخزن اور حامیانِ اقبال کے سامنے پیش کیا۔ لیکن آپ کے ایک دردمند اداریہ، میری ایک تجویز یا ریاض احمد صاحب کے ایک مفید مضمون سے وہ بڑا مسئلہ حل تو نہیں ہو گیا۔ یعنی ''صحیح فکرِ اقبال کا ابلاغ اور دفاع''۔

میں نے شمارہ ۸، ۹ اور ۱۰ کے مطابق کل مطبوعات میں سے جو قائداعظم لائبریری میں یا مخزن میں برائے تبصرہ آئی ہیں اقبال کے متعلق کتابوں کا شمار کیا ہے۔ لائبریری میں آمدہ کتابیں ۲۸۱، برائے تبصرہ و دیگر ۷۷ کل ۳۵۸۔ اقبال پر ۹۔ ان ۹ میں خورشید رضوی صاحب کی کتاب 'اطراف' کا صرف ایک مضمون بھی شامل ہے جو نذیر نیازی صاحب سے اقبال کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے۔

تو آپ صحیح فکرِ اقبال کی فکر میں ہیں۔ یہاں فکر کا ذکر ہی غائب ہوتا چلا گیا ہے۔شمارہ ۸ میں آپ بیتی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین اور نادر قلمی نسخوں جیسے بحرالمنافع اور ترجمۂ مختصر پر تحریریں معیاری اور سیر حاصل ہیں اور ۹ میں ثقہ قارئین اور ادیب صحافیوں نے ان پر مثبت خیالات کا اظہار کیا ہے۔پرانے مشاہیر ادیبوں کے حالات مثلاً مولانا ظفر علی خاں اور آل احمد سرور، ان کی تصنیفات، ان کے زمانے کے مشہور ادبی جرائد، ان کے اساتذہ اور شاگردوں کے نام، ان کے کردار کی جھلکیاں، میرے جیسوں کو اس زمانے کے قریب لے جاتے ہیں تو ایسے سوانحی خاکوں کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔مثلاً مرزا محمد سعید صاحب کی اولین تصنیفات میں سے ایک ناول ہے۔یاسمین۔ میں ۱۹۲۲ء میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ہمارے اردو کے استاد جناب عبداللطیف تپش ایم اے، ایم اوایل تھے جو اپنے زمانے کے نامی گرامی شعرا میں سے تھے۔وہ سر شیخ عبدالقادر بانی مدیر مخزن کے داماد تھے۔انھوں نے میری حوصلہ افزائی کے لیے یہ ناول یاسمین عطا کرتے ہوئے فرمایا کہ اسے صحیح زبان سیکھنے کے لیے پوری پوری توجہ سے پڑھنا۔

مرزا صاحب پر مضمون میں ایک جگہ جناب فیض سے منسوب یہ فقرہ تحریر ہے:

''آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ رامی تہذیب یونانی تہذیب کے بعد ابھری''۔

میرا خیال ہے کہ یہاں کتابت کی غلطی سے آرامی تہذیب کی بجائے رامی تہذیب لکھا گیا ہے۔آرامی اور فینیقی تہذیبیں بحرمتوسط کے مشرقی سواحل پر پھلی پھولیں اور اسی لیے اس کا تقابلی ذکر یونانی تہذیب سے ہوتا ہے۔رامی نام کی کوئی تہذیب معروف نہیں۔ہندو تہذیب کبھی بھی رامی تہذیب نہیں کہلائی۔

جناب شاہد احمد دہلوی میرے لیے ایک مانوس نام اور شخصیت تھے۔انھوں نے اپنے رسالہ ساقی کے ایک ہی شمارے میں موپساں کے The Respectable Prostitute کا میرا مال زادی کے عنوان کے تحت کیا ہوا ترجمہ ۱۹۵۵ء یا ۵۶ میں چھاپا تھا۔

جناب حمزہ فاروقی نے سفرنامہ ''ازبکوں کے دیس میں'' صفحہ ۳۵۔ ۳۶ پر تحریر فرمایا ہے:

''انور پاشا جہادِ آزادی میں ہاسماچیوں کے ساتھ شریک ہو گئے اور انھوں نے ۱۹۲۱ء میں میدان جنگ میں شہادت پائی۔''

۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۴ء میں بسلسلۂ ملازمت دہلی میں مقیم تھا۔میرے ہم جماعت اور دوست فضل الرحمٰن (بعد کے مشہور ریا بدنام ڈاکٹر فضل الرحمٰن) جامعہ ملیہ دہلی میں مولانا عبیداللہ سندھی کے زیرنگرانی شاہ ولی اللہ کے کسی پہلو پر تحقیق کر رہے تھے۔میں ان سے ملنے جاتا تو مولانا عبیداللہ سندھی صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوتا۔بڑی شفقت فرماتے۔ایک روز انقلاب روس اور اپنے وہاں قیام کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ ''انور پاشا'' کا روسیوں کے ہاتھوں بڑا ہی دردناک انجام ہوا۔میں وہاں موجود تھا۔لیکن مجھ سے مزید مت پوچھیں۔ان کے لہجے، آواز اور آنکھوں میں گہرے درد و کرب اتر آئے .....اس آواز میں جو بڑھاپے کے باوجود دوسروں کے کانوں میں گونج اٹھتی تھی اور ان آنکھوں میں جن کی چمک بے پناہ تھی۔

شمارہ ۹ اور ۱۰ میں مرحوم محترم جناب مشفق خواجہ کی اپنی تحریروں کے نمونوں، ان پر نامور ادیبوں کے مضامین اور ان کے بولتے ہوئے خطوں کے لیے ایک قابل قدر حصے مختص کر کے آپ نے ان کا جائز حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

پرتو روہیلہ صاحب نے غالب کے فارسی خطوط کو اردو کے قالب میں ڈھال کر بڑا کام کیا ہے۔غنیمت ہے کہ ابھی کچھ

لوگ باقی ہیں جہاں میں جو یہ اہلیت رکھتے ہیں ورنہ حالات جس طرف جا رہے ہیں وہاں تو اردو کا چلن بھی ختم ہوتا نظر آ رہا ہے۔

پاکستانی اسلامی مصوری اور خطاطی کے بارے میں مضامین کا سلسلہ معلومات افزا ہے۔ مرقع چغتائی کی داستان اور وہ بھی عبدالرحمٰن چغتائی کے قلم سے، بہت دلچسپ ہے اور حیران کن ہے۔

شمارہ ۹ میں ڈاکٹر ادیب سہیل صاحب کا جناب بشیر موجد صاحب کے پس منظر پر مضمون عالمانہ رعب داب والا ہے۔

شمارہ ۱۰ میں پروفیسر تنویر صاحب کی تحریر، فن کی تاریخ، ارتقا اور نکتہ طرازیوں کی حامل ہے۔

ڈاکٹر مقبول الٰہی، راولپنڈی

مخزن لاہور (دور جدید) کا گیارھواں شمارہ

قائداعظم لائبریری لاہور کا ششماہی ادبی مجلّہ مخزن (دور جدید) اپنی عمر کے چھٹے سال میں داخل ہو گیا ہے لیکن اصل میں اس کی تاریخ سو سال سے زیادہ قدیم ہے۔ مخزن کا اجرا ۱۹۰۱ء میں سر عبدالقادر کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اس دوران وقتاً فوقتاً اس کی تجدیدی اشاعتیں بھی ہوتی رہیں۔ ہر دور میں اس کا تسلسل لگ بھگ دس برس تک ہی رہا۔ اب قائداعظم لائبریری لاہور سے نکلنے والا یہ مجلّہ ۶ ویں برس میں داخل ہو گیا ہے امید ہے کہ یہ لمبے عرصے چلے گا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ نظر آ رہی ہے کہ نیم سرکاری ادارے کا مجلّہ ہونے کی وجہ سے اسے فنڈز کی کمی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہمارے پیش نظر اس وقت مخزن لاہور (دور جدید) کا گیارھواں شمارہ (جلد ۶، شمارہ ۱، ۲۰۰۶ء) ہے۔

زیر تبصرہ شمارہ نو حصوں میں منقسم ہے۔ اداریہ اس کے علاوہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس مرتبہ اداریہ مشفق خواجہ (مرحوم) کی پہلی برسی کے حوالے سے تحریر کیا ہے لیکن اصل میں یہ پاکستان میں اردو تحقیق کا نوحہ ہے۔ گزشتہ برسوں میں بزرگ محققین کی رحلت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''اردو تحقیق پر بڑا پیغمبری وقت آ گیا ہے۔'' اورینٹل کالج جو اردو تحقیق کا گڑھ رہا ہے، اب تنقید کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ یوں تنقید اور تحقیق میں ہم آہنگی قائم نہ رہ سکی۔ دوسری طرف ادیب علمی رسائل سے اخبارات میں جا نکلا یوں ادب سے زیادہ ادیب کی شہرت ہونے لگی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں کہ:

''چنانچہ بعض ادبا نے ادب کی بجائے دوسرا کاروبار سنبھال لیا۔ تنقید اور شاعری کے نام پر چھابڑیاں لگا کر کھٹے میٹھے بیر بیچنے لگے۔''

ڈاکٹر صاحب خود اردو تحقیق کا ایک بڑا نام ہیں اور معذوری کی حالت میں بھی تحقیق کی گاڑی کو رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن پاکستانی جامعات میں اردو تحقیق کے گرتے ہوئے معیار کو دیکھ کر افسردہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ نئی یونیورسٹیوں میں تحقیق کے حوالے سے وہ انھیں تحقیق کی فیکٹریاں گردانتے ہیں جہاں لنگڑے لولے گھوڑے کمائی میں مصروف ہیں اور ڈربی ریس کا سماں ہے۔ ان کے نزدیک پاکستان میں ''تجارتی تحقیق کا دبستان'' معروف کار ہے۔ (ڈاکٹر صاحب کی یہ بات البتہ تحقیق طلب ہے کہ ہندوستان میں تحقیق کا معیار بہتر ہے۔ ہمارے نزدیک تو ایک سا ہی حال ہے) ڈاکٹر وحید قریشی کو اس صورت حال میں مشفق خواجہ (مرحوم) کی یاد نہ آئے تو کیا ہو۔ جو خامہ بگوش کے روپ میں اس کچے پکے کام پر گرفت کیا کرتے تھے۔

اداریے کے بعد سفرنامہ، شخصیت، سوانح کا سیکشن ہے، جس میں چار مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون ڈاکٹر سلیم اختر کا سفرنامہ چین

ہے، ڈاکٹر سلیم اختر نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔اس لیے ان کے سفرنامے 'بغتان چین اور جہان مرغ و ماہی' میں افسانے کی چاشنی بھی موجود ہے۔ڈاکٹر انور سدید کا مضمون ''اگلے وقتوں کا آدمی'' غلام الثقلین نقوی کی شخصیت کے حوالے سے ایک اہم دستاویز ہے۔ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ ڈاکٹر انور سدید کی تحریر کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔محمد حنیف شاہد نے شمس العلماء ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتہ کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔''رشید حسن خاں صاحب اور عصری دانش کی مشارکت' اہم مضمون ہے۔ حافظ صفوان محمد چوہان کا قلم زوردار ہے۔مشفق خواجہ اور ڈاکٹر سید معین الرحمن پر بھی لکھ چکے ہیں لیکن کبھی کبھی ان کی تحریر میں خودنمائی جھلکنے لگتی ہے۔زیر تبصرہ شمارے میں شامل رشید حسن خاں پر ان کے مضمون میں رشید حسن خاں سے زیادہ حافظ صاحب نظر آتے ہیں۔

'تنقید' کے حصے میں شامل چاروں مضامین اہم ہیں۔ناصر عباس نیر کا شمار نوجوان نقادوں میں ہوتا ہے جنھیں بزرگوں کی آشیرباد بھی حاصل ہے۔مغربی تنقید پر قابل ذکر کام کر رہے ہیں۔''افلاطون کے تنقیدی تصورات'' بھی اسی نوعیت کا مضمون ہے۔ ریاض احمد بزرگ نقاد ہیں۔ان کی ہر تحریر نئے لکھنے والوں کے لیے نصاب کا درجہ رکھتی ہے۔''ہمارا علم عروض اور پنجابی بحور'' اردو شاعری کے طالب علموں کے لیے رہنمائی کا کام دے گی۔ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے سر عبدالقادر کے مخزن میں میر انیس کے آثار ڈھونڈے ہیں۔پرتو روہیلہ نے غالب کے ایک نایاب نویافتہ فارسی خط کا متن اور اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔

'تحقیق' کے عنوان کے تحت علیم صبا نویدی کا 'نواب مستقیم جنگ نامی' پر مضمون اور پروفیسر سید امیر حسن عابدی کا ''مثنوی مولانا روم کی ایک گمنام شرح'' کا تعارف شامل ہے۔'صحافت' کے حصے میں ڈاکٹر سید اختیار جعفری نے آگرہ سے شائع ہونے والے اردو اخبارات و رسائل کی فہرست پیش کی ہے۔محمد ہارون عثمانی نے مولانا امین احسن اصلاحی کی صحافتی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔یہ ایک تحقیقی مضمون ہے جس میں تنقید کا عنصر بھی موجود ہے۔صحافت کے طالب علم اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

'فنون لطیفہ' کا سیکشن اب مخزن کی روایت بن گیا ہے محمد راشد شیخ نے استاد محمد یوسف دہلوی کے فنی اجتہادات کا جائزہ لیا ہے۔محمد اطہر مسعود نے مرکزی لائبریری جامعہ پنجاب میں موجود 'مخطوطات حافظ محمود شیرانی' کے فن موسیقی کے حوالے سے ایک خطی نسخے 'اصول النغمات' کا تعارف عمدہ طریقے سے کروایا ہے۔پہلی مرتبہ مخزن کے فنون لطیفہ کے حصے میں موسیقی کے حوالے سے کوئی مضمون چھپا ہے ورنہ اس سے قبل تو صرف خطاطی یا مصورانہ خطاطی کو ہی جگہ ملتی تھی۔

مخزن ایک لائبریری کا مجلّہ ہے اس لیے اس میں کتب تبصرے زیادہ سے زیادہ ہونے چاہئیں۔لیکن اس مرتبہ صرف ایک مفصل اور ایک مختصر تبصرہ اس شمارے کی زینت بن سکا ہے۔ڈاکٹر وحید عشرت نے 'اقبال ایک تحریک' نامی کتاب کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے جب کہ ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کا تاج قائم خانی کے دوہوں کی کتاب 'دل ہے عشقی تاج کا' اتنا ہی مختصر ہے۔یہ دونوں تبصرے بہر حال کتابوں کا اصل جوہر ضرور سامنے لاتے ہیں۔ہماری مدیر مخزن سے التماس ہے کہ کتابوں پر تبصرے والے سیکشن کو بڑھایا جائے۔مخزن ششماہی رسالہ ہے لہٰذا ہر شمارے میں کم از کم تین مفصل تبصرے/جائزے اور دس مختصر تبصرے ضرور شائع کیے جائیں۔شمارے میں شائع شدہ 'کتب موصولہ برائے تبصرہ' کی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخزن کو تبصرے کے لیے وافر کتابیں موصول ہوتی ہیں۔

'انتخاب'، 'مخزن' اور 'قائداعظم لائبریری' مخزن کے مستقل عنوانات ہیں۔انتخاب میں غلام رسول تنویر کا مضمون ''پطرس بخاری۔میرا پروفیسر'' تذکرر کے طور پر موجود ہے۔مخزن کے حصے میں خطوط، تبصرے اور کتب موصولہ برائے تبصرہ کی فہرست موجود

ہے۔قائداعظم لائبریری کا سیکشن لائبریری میں آنے والی نئی کتب کی فہرست اور لائبریری کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے متعلق ہے۔
مخزن اپنا مخصوص مزاج اور پہچان بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔اس کا ہر شمارہ پیش کش کے اعتبار سے پچھلے شماروں سے بہتر ہوتا ہے۔ڈاکٹر وحید قریشی اور ان کی ٹیم رسالے کا معیار قائم رکھنے پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ورنہ آج کل کے دور میں ادبی رسالے کو جاری رکھنا کار دارد ہی ہے۔ قائداعظم لائبریری کی انتظامیہ کی ہمت اللہ تعالیٰ قائم رکھے شاید اسی طرح اردو زبان ادب کی خدمت ہوتی رہے۔

فرح ہارون: ماھنامہ الحمرا، لاھور، اکتوبر ۲۰۰۶ء

قائداعظم لائبریری کی علمی و ادبی سرگرمیاں
جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء

شہناز مزمل

۲۵ جولائی ۲۰۰۶ء

تعزیتی ریفرنس محترم احمد ندیم قاسمی (مرحوم)

صدارت: میاں عمران مسعود صاحب وزیر تعلیم حکومت پنجاب

تاثرات: حمیدا ختر، خالد احمد، نجیب احمد، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر ناہید قاسمی، صوفیہ بیدار، عفت علوی، فرح زہرا گیلانی، شاہد بخاری، خالد نقاش، عمامہ، اسلم راؤ

نظامت: شجاعت ہاشمی

صوبائی وزیر تعلیم محترم میاں عمران مسعود نے کہا کہ عہد ساز ادیب و دانشور محترم احمد ندیم قاسمی ملک و ملت کا سرمایہ تھے۔ اس ادب دوست عظیم شخصیت کی لافانی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا۔محترم حمید اختر نے ان کی دیرینہ رفاقت کے دوران پیش آنے والے واقعات کا ذکر کیا۔محترم عنایت اللہ صدر مجلس ادارت مخزن کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ان کے مطابق احمد ندیم قاسمی ادب ساز ہی نہیں ادیب ساز بھی تھے۔احمد ندیم قاسمی مرحوم کی بیٹی ڈاکٹر ناہید قاسمی نے بطور شاعر و ادیب ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالی۔عفت علوی نے ان کے افسانے 'کپاس کے پھول' سے اقتباس پڑھا۔اسلم راؤ نے افسانہ 'سفارش' سے اقتباس پیش کیا۔شاہد بخاری، خالد نقاش اور عمامہ نے منظوم اظہار خیال کیا۔خالد احمد، نجیب احمد، ڈاکٹر اجمل نیازی،

صوفیہ بیدار،فرخ زہرہ گیلانی نے بھی اس عظیم دانشور کے چلے جانے پر گہرے دکھ کا اظہار کیا۔

۷ ستمبر ۲۰۰۶ء

عالمی یوم خواندگی

صدارت: عنایت اللہ،صدر پاکیڈ

اظہار خیال: رائے اعجاز ضیغم،سیکرٹری لٹریسی،محمد تاج چیف لائبریرین، ملک عبدالرؤف ای ڈی او لٹریسی سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ

تعاون: سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ لاہور۔ پاک ایڈ لاہور

کسی ملک کی ترقی کے لیے قوم کا خواندہ ہونا انتہائی ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں بھی الحمدللہ اب خواندگی کی شرح تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ان خیالات کا اظہار اور خواندگی کے فروغ کے لیے سفارشات پیش کی گئیں۔

۱۴ ستمبر ۲۰۰۶ء

رضیہ بٹ سے ملاقات

شرکائے گفتگو: عباس نجمی، ناصر بشیر،صوفیہ بیدار،فرحینہ نعیم

نظامت: شہناز مزمل

معروف فکشن رائٹر رضیہ بٹ کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالنے کے لیے ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔شہناز مزمل نے ان کا تفصیلی تعارف کروایا۔عباس نجمی نے ان کے فن کے سراہتے ہوئے انھیں ایک عظیم ناول نگار کہا۔ناصر بشیر نے ان کے رومانوی ناول نگار ہونے کی حیثیت سے بات کی اور انھیں عورتوں کا ابن صفی قرار دیا۔صوفیہ بیدار نے ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا کہ ان کی ناول نگاری کی وجہ سے گھر متاثر نہیں ہوا۔رضیہ بٹ نے اپنے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔

کتب موصولہ برائے تبصرہ

محمد ہارون عثمانی

مجلّہ مخزن کو درج ذیل نئی کتب برائے تبصرہ موصول ہوئی ہیں:۔

۱۔ اکرام بریلوی۔حسرت تعمیر (ناول) ۔۔۔۔ کراچی: بختیار اکیڈمی، ۲۰۰۶ء۔ص ۳۷۵، قیمت ۴۰۰ روپے

۲۔ رابعہ سرفراز۔اقبال کا نظریہ فن (تحقیقی وتنقیدی جائزہ) ۔۔۔۔ فیصل آباد: قرطاس، ۲۰۰۶ء،ص ۲۳۲، قیمت ۲۰۰ روپے

۳۔ جاوید رحمانی۔غالب تنقید ۔۔۔۔ نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۶ء،ص ۱۶۸، قیمت ۱۱۰ انڈین روپے

۴۔ زہیر کنجاہی۔ارادت (ناول) ۔۔۔۔ سرگودھا: ادارہ فروغ ادب پاکستان، ۲۰۰۶ء،ص ۲۱۴، قیمت ۲۰۰ روپے

۵۔ ہارون، طاہر سعید۔من بانی (دوہے) ۔۔۔۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء،ص ۱۸۰، قیمت ۳۰۰ روپے

۶۔ طاہر سعید ہارون کی دوھا نگاری/مرتبہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ۔۔۔۔۔ دہلی: نرالی دنیا پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۲۰۰
قیمت ۲۵۰ انڈین روپے

۷۔ مہاجر محمد عمر۔ اردو افسانے کا تشکیلی دور/مرتبہ فریسہ عقیل ۔۔۔۔۔ کراچی: شمیم بک ایجنسی، ۲۰۰۵ء، ص ۸۰،
قیمت ۸۰ روپے

۸۔ ڈاکٹر ابن فرید۔ بے بدل انسان۔ بے مثل قلم کار/مرتبہ انتظار نعیم ۔۔۔۔۔ دہلی: ادارہ ادب اسلامی ہند، ۲۰۰۶ء، ص ۲۳۶، قیمت ۱۵۰ انڈین روپے

۹۔ اے ارض فلسطین/مرتبہ انتظار نعیم ۔۔۔۔۔ دہلی: ادارہ ادب اسلامی ہند، ۲۰۰۶ء، ص ۲۱۱، قیمت ۱۵۰ انڈین روپے

لائبریری میں آنے والی نئی اردو کتب

سعیدہ خان

اردو ادب۔ تاریخ

۱۔ رضوی، سید وقار احمد۔ تاریخ نقد (اردو اور عالمی ادب کے تناظر میں) اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۴ء

اردو افسانہ

۲۔ جیلانی بانو۔ سوکھی ریت۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۳

۳۔ شفیع عقیل۔ مشہور اہل قلم کی گمنام تحریریں۔ لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۴ء

۴۔ شیخ اقرار حسین۔ بدیسی کہانیاں۔ لاہور: ضیائے ادب، ۲۰۰۶ء

۵۔ نارنگ گوپی چند۔ پرانوں کی کہانیاں۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۱

اردو زبان۔ لغت

۶۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر۔ اولین اردو سلینگ لغت۔ کراچی: فضلی سنز، ۲۰۰۶ء

اردو شاعری

۷۔ انجم الحق، محمد۔ پانی پہ بچھا تخت۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۳ء

۸۔ صابر ظفر۔ اپنے رنگوں میں ڈوب جانے دے۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء

ناول

۹۔ لی آنگ۔ قصائی کی بیوی/تنویر اقبال (مترجم)۔لاہور: مشعل، ۲۰۰۶

۱۰۔ حمید کاشمیری۔الاؤ۔کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء

۱۱۔ علاؤالدین سید۔اینیمل فارم۔کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۵ء

اقبال، سر محمد۔تنقید و شرح

۱۲۔ ایوب صابر۔تصورِ پاکستان: علامہ اقبال پر اعتراضات کا جائزہ۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۴ء

۱۳۔ یزدانی، خواجہ حمید۔مثنوی رموزِ بے خودی (متن لغت و ترجمہ) لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۰۵ء

۱۴۔ یزدانی، خواجہ حمید۔شرح اسرار خودی (متن لغت ترجمہ و شرح) لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۰۰ء

الہامی کتاب

۱۵۔ والصیکی۔رامائن/ریا سر جواد (مترجم)۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۰ء

بوسنیا۔تاریخ

۱۶۔ رزاق ہیکوک۔جہنم کی دسویں گہرائی: بوسنیا کے عقوبت خانوں کے شب و روز/امجد اسلام امجد (مترجم)۔لاہور: برائٹ بکس، ۱۹۹۹ء

پاکستان۔انتظامیہ و سیاست

۱۷۔ قیوم نظامی۔جرنیل اور سیاست دان: تاریخ کی عدالت میں۔لاہور: جہانگیر بک ڈپو، ۲۰۰۶ء

۱۸۔ ملک عنایت الٰہی۔پاکستان میں انتظامیہ کا زوال۔لاہور: مشعل، ۲۰۰۵ء

پنجابی شاعری

۱۹۔ حبیب جالب۔رات کلیہنی۔کراچی: جالب پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

۲۰۔ نریش۔بوندیاں عمارتاں۔لہور: سچیت کتاب گھر، ۲۰۰۵

جاپانی ادب۔افسانے

۲۱۔ جدید جاپانی افسانے۔لاہور: مشعل، ۱۹۹۷ء

سوانح

۲۲۔ اعظمی، عبدالحمید۔پطرس بخاری (شخصیت اور فن)۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۶ء

۲۳۔ بیدی، بی پی ایل۔سرگنگا رام۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۴ء

۲۴۔ سورانی دیوی، پریم چند۔پریم چند گھر میں/مظہر حسن (مترجم)۔کراچی: فضلی سنز، ۲۰۰۱ء

۲۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر۔میراجی (شخصیت اور فن)۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۶ء

۲۶۔ رفیق سندیلوی۔ڈاکٹر وزیر آغا (شخصیت اور فن)۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۶ء
۲۷۔ جعفر احمد، سید۔سجاد ظہیر (شخصیت اور فکر) کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۵ء
۲۸۔ شفیع عقیل۔سلطان باہو (حیات اور فن)۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۴ء
۲۹۔ عزیز ملک۔حفیظ جالندھری (شخصیت اور فن)۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۰ء
۳۰۔فیروزالدین، مولوی۔یادگار وکٹوریہ۔اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۵ء
۳۱۔ ورک، اشفاق احمد محمد خالد اختر (شخصیت اور فن)۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۶ء
۳۲۔ورما، نارائن پرشاد۔ہندوستان کے عظیم سپوت۔لاہور: پرنٹ لائن پبلشرز، ۱۹۹۹ء

سیرت النبی ﷺ

۳۳۔ شکیل، شاہ مصباح الدین۔سیرت احمد مجتبیٰ ﷺ (جلد اول، دوم، سوم) کراچی: پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ، ۱۹۹۹ء

سیر و سیاحت

۳۴۔ رضیہ فصیح احمد۔سیر کر دنیا کی۔کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۵ء

عراق۔تاریخ

۳۵۔ راوسرور منیر۔میں نے بغداد جلتے دیکھا۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵ء

فلسفہ۔تاریخ

۳۶۔ رسل، برٹرینڈ۔فلسفہ مغرب کی تاریخ/محمد بشیر (مترجم)۔اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۵ء

قائداعظم لائبریری کی مطبوعات

۱۔ ابتدائی فلکیات	خالد مسعود	-/20 روپے
۲۔ پودوں کی زندگی	خالد مسعود	-/30 روپے
۳۔ مسلمان اور سائنس	خالد مسعود	-/30 روپے
۴۔ عالم حیوانات	خالد مسعود	-/20 روپے

۵۔ کروزمین	خالد مسعود	20/- روپے
۶۔ کلیاں میرے گلشن کی	عبدالرحمٰن خالد	20/- روپے
۷۔ اصطلاحات حدیث	محمد سعد صدیقی	80/- روپے
۸۔ علم حدیث اور پاکستان میں اس کی خدمت	محمد سعد صدیقی	100/- روپے
۹۔ اسلامی آداب	سید عبدالرحمٰن بخاری	100/- روپے
۱۰۔ اسلامی قانون کا نظریہ مصلحت	سید عبدالرحمٰن بخاری	190/- روپے

ملنے کا پتا: قائداعظم لائبریری باغ جناح لاہور۔ پاکستان

بارھویں شمارے کے قلمی معاونین

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، 30 محمود شیرانی روڈ، سٹیڈیم پارک شیخوپورہ

محمد حمزہ فاروقی، 86-D کلفٹن بلاک 4، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی V، کراچی

ڈاکٹر ضیاء الحسن، استاد شعبہ اردو یونیورسٹی اورینٹل کالج، کچہری روڈ لاہور

ناصر عباس نیر، استاد شعبہ اردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج، کچہری روڈ لاہور

ڈاکٹر غلام شبیر رانا، مصطفیٰ آباد، نزد پاکستان آئل ملز، سرگودھا روڈ، جھنگ شہر، 35204

شفقت رضوی 2933 Sun Meadow, Flower Mound TX.75022, USA

سید مشکور حسین یاد، ظفر کالونی ندیم شہید روڈ، سمن آباد لاہور

پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی، ڈین سماجی علوم رصدر شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

رفاقت علی شاہد، مکان نمبر 54 گلی نمبر 10 محمدی کالونی نزد Q بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور

ڈاکٹر انور سدید، ۱۷۲ ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ریاض احمد، 216 پاک بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ڈاکٹر انور محمود خالد، 24-w-B مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد

پرتو روہیلہ (مختار علی خان)، مکان نمبر 8، گلی نمبر 42، F8/1، اسلام آباد

ڈاکٹر سلیم اختر، الجودت، 569-C گلی نمبر 17 جہانزیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

محمد راشد شیخ، بی 108 ،الفلاح ،ملیر ہالٹ کراچی ۔ 75210
اورنگ زیب نیازی،مکان نمبر 63 گلی نمبر 2،چوہدری پارک،ٹھوکر نیاز بیگ لاہور
محمد اطہر مسعود، ۳۳۸،سٹریٹ ۷، کیولری گراؤنڈ ایکسٹنشن، لاہور کینٹ
امجد اسلام امجد،N-275 ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، لاہور کینٹ
محمد ہارون عثمانی، 161 ۔ اے،گلشن راوی لاہور
محبوب اسمٰعیل ،معرفت عوامی کتاب گھر،17،اردو بازار لاہور
شہناز مزمل، لائبریرین،قائداعظم لائبریری لاہور
سعیدہ خان، لائبریرین،قائداعظم لائبریری، لاہور